لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے ۰۴

شائننگ انڈیا کا اصل روپ بے نقاب ۴۵

اُردو ڈائجسٹ

نومبر ۲۰۱۷ء

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

آن لائن کاروبار کے قیمتی راز ۱۳۴

بِٹ کوائن ۳۹
کی پُراسرار کرنسی نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا

۲۸

ٹھیلا لگانے سے صدر بننے تک

دنیا کی پہلی باحجاب حکمران کا بے مثال قصّہِ جہد

قوتِ ارتکاز کی سائنس
توجہ کا خزانہ پانے کے گُر ۷۹

گُپتا خاندان نے جنوبی افریقا میں کرپشن کی گنگا بہادی ۴۹

بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں شکار کا سنسنی خیز واقعہ ... ۸۴

اوندھی بستی بحیرہ عرب کے انوکھے کھنڈرات ۱۰۱

وزیراعظم دل و دماغ جھنجھوڑ دینے والا تازہ افسانہ ۱۲۷

PAKISTANI POINT
AIK RABTA APNO KA
پاکستانی پوائنٹ

عبدالستار ایدھی (صدارتی ایوارڈ یافتہ)
کی برسی کے موقع پر خصوصی رعایت

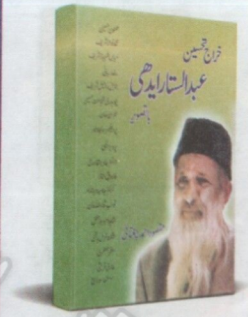

صدر پاکستان ممنون حسین، سابق وزیراعظم محمد نواز شریف، وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف، جنرل (ر) راحیل شریف، چودھری شجاعت حسین، عمران خان، ڈاکٹر طاہر القادری، کرکٹر جاوید میانداد اور دیگر اہم شخصیات کی آرا پر مبنی کتاب

خراج تحسین عبدالستار ایدھی (باتصویر) اصل قیمت 2000 روپے رعایتی قیمت 1334 روپے رعایت 660 روپے

حالات حاضرہ، سیاسی، علمی، ادبی، ثقافتی اور اہم موضوعات پر مبنی مختلف کتابوں اور ماہنامہ صدائے پاکستان کے خصوصی نمبر

	ماہنامہ صدائے پاکستان کے خصوصی نمبر	اصل قیمت/ہدیہ	رعایتی قیمت/ہدیہ	رعایت
1	گرمیوں کی چھٹیوں میں کہاں جائیں؟ (شمالی علاقہ جات)	200	134	66
2	قرضہ لیں اور کاروبار شروع کریں (بینک کے مروجہ قوانین)	200	134	66
3	ایکسپورٹ کریں اور آمدنی بڑھائیں (قیمتی زرمبادلہ کمائیں)	200	134	66
4	امریکی ویزا کیسے حاصل کریں؟ (ڈونلڈ ٹرمپ پالیسیاں)	200	134	66
	کتابیں از مصنف			
5	چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا (حصول ویزا امیگریشن قوانین) از مقصود چغتائی	500	335	165
6	بینکنگ گائیڈ (بینک کی سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں) از مقصود چغتائی	1000	670	330
7	سکاؤٹ بچوں کی ہائیک اور اصول ہائیکنگ از مقصود چغتائی	200	134	66
8	سکاؤٹاں دا اوکھا پینڈا (پنجابی) از مقصود چغتائی	200	134	66
9	The Scouts Hike & Scouts Principles ایضاً	200	134	66
10	بوسنیا آوارہ گرد کی نظر سے از محمد زوہیب صدیقی	400	268	132
11	تفسیر قرآن حکیم پارہ ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ از ممتاز سکالر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ	1800	1200	600
			کل رعائیت	2349

ملنے کا پتا: ولید پبلشرز 394 بلاک G/4، ایم اے جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: 0092-321-4806800 / 042-35300144
Email:maqsood56chughtai@gmail.com

اللہ کا قرآن

اے ایمان والو اللہ کی راہ میں ہمارے دیے میں سے خرچ کرو وہ دن آنے سے پہلے جس میں نہ خرید فروخت ہے نہ کافروں کے لیے دوستی اور نہ شفاعت اور کافر خود ہی ظالم ہیں۔ (البقرۃ:۲۵۴)

تم فرماؤ بے شک میرا رب رزق وسیع فرماتا ہے اپنے بندوں میں جس کے لیے چاہے اور تنگی فرماتا ہے جس کے لیے چاہے اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ اس کے بدلے اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا۔ (سبا:۳۹)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص قرضدار کو مہلت دے یا قرض معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے گا۔ (مسلم شریف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر (دنیادار) آدمی کے پاس مال سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں جب بھی وہ تیسرے جنگل کی آرزو کرے گا اور ایسے (حریص) آدمی کا پیٹ قبر کی مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ (بخاری، مسلم)

اُردو ڈائجسٹ

نومبر 2017ء
صفر المظفر 1439ھ
جلد نمبر 57 شمارہ نمبر 11

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سیّد عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمٰی اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خواں: ارم ناز
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdudigest.pk خریداری کے لیے رابطہ
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے!

''ہمیں پاکستان میں جمہوری حکومت کے استحکام کو لاحق خطرات سے بڑی پریشانی ہے۔'' امریکی وزیرِ خارجہ ریکس ٹیلرسن نے پاکستان کے مختصر دورے کے بعد نئی دہلی میں یہ بیان دیا۔ قبل ازیں چند گھنٹوں پر مشتمل اس دورے کے دوران اسلام آباد میں پاکستانی حکومت نے ببانگ دہل امریکا کو باور کروا دیا کہ اب کسی قسم کا سمجھوتا نہیں ہو سکتا اور بتایا کہ پاکستان کو امریکی امداد یا اسلحہ نہیں احترام چاہیے۔ ایئرپورٹ پر ایک سینئر سفارت کار نے ٹیلرسن کا استقبال کیا۔ سول و عسکری قیادت نے مل کر اپنے وطن کے بہترین مفاد میں امریکی وزیرِ خارجہ کے سامنے ڈٹ کر اپنا موقف بیان کیا۔

ماضی میں سول و عسکری قیادت کی علیحدہ علیحدہ ملاقاتوں کی وجہ سے پاکستان کے لیے بہترین مفاد میں نتائج حاصل نہیں کیے جا سکے۔ بلاشبہ امریکی چھتری سے نکلنا مشکل فیصلہ ہے اور اس کے منفی اثرات سے نکلنے کے لیے سول و فوجی قیادت کو کٹھن فیصلے کرنے ہوں گے لیکن اس طرزِ عمل سے عوام کے حوصلے یقیناً بلند ہوئے ہیں۔ ایک خوددار قوم کو اسی طرح متحد ہو کر اپنا موقف پیش کرنا چاہیے۔

گزشتہ چند ماہ میں رونما ہوئے واقعات سے عیاں ہے کہ وطنِ عزیز کو درپیش سنگین اور دائمی امراض سے چھٹکارا دلانے کی منظم کوشش باقاعدہ منصوبہ بندی سے جاری ہے۔ خوش آئند بات یہ کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھا گیا۔ پھر چین کے کامیاب یک جماعتی نظامِ حکومت، ترکی میں اردغان حکومت کے خلاف ناکام بغاوت اور بنگلہ دیش کے ''جسٹس ماڈل'' سے بھی بہت کچھ کشید کیا گیا۔

استحکامِ جمہوریت کے حوالے سے صحافی اور سیاست دان متفکر ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ مقتدر حلقوں کی زیرِ نگرانی جاری احتساب آپریشن کا مقصد ایک بار پھر سیاست دانوں کو بدنام کر کے حکومت حاصل کرنا ہے۔ جبکہ عوام سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا جمہوریت میں حکمران کسی عدالت کو جوابدہ نہیں ہوتے؟ وہ خواہ کسی بھی جرم کے مرتکب ہوں اور مل جل کر اپنے یا غیر ملکی آقاؤں کے مفاد میں کسی بھی طرح کی پالیسیاں بنائیں، لوٹ کھسوٹ کریں، پارٹی کے منشور کو پس پشت ڈال کر تمام اداروں کو زیرِ نگین کر کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھیں اور ''جمہوریت جمہوریت'' یا ''عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے کا راگ الاپتے رہیں۔ کیا جمہوری حکومت ایک یا چند خاندانوں کی لونڈی ہے اور جس میں ساڑھے انیس کروڑ عوام کی کوئی حیثیت نہیں؟ عرصہ دراز سے بے بس عوام ایسے مسیحا کی تلاش میں تھے جو اسے غربت، ناانصافی اور جہالت کے اندھیروں سے نکال سکے۔ جمہوری اور فوجی ادوار میں ترقی کے وعدے تو کیے گئے، نظام بدلنے کے خواب دکھائے گئے لیکن خواہش اقتدار تمام وعدوں پر غالب رہی۔

مرے پر سو درّے، سیاسی حکومتوں نے غیر ملکی آقاؤں کے حکم پر ایسی پالیسیاں ترتیب دیں کہ ملک میں کاروبار دشمن ماحول پیدا ہو گیا۔ بہت سے محبِ وطن پاکستانی بددل ہو کر بیرون ممالک کارخانے لگانے کے لیے ہجرت کر گئے۔ سرکاری اور نجی منصوبوں میں کمیشن اور ٹیکس چوری کر کے جمع شدہ کالا دھن باہر بھیج دیا جاتا یا پھر رئیل اسٹیٹ میں لگا کر اُسے سفید بنا لیا جاتا۔ ایف بی آر، ایف آئی اے اور نیب سمیت قانون نافذ کرنے والے تمام سرکاری ادارے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ملک لوٹنے والوں کے مکروہ دھندے میں معاون و مددگار بنے رہے۔ طاقتور امیر کرپٹ طبقے نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو بھی اپنے قابو میں کیے رکھا۔ کہیں دولت کی چکاچوند تو کہیں زور زبردستی نے میڈیا کے گھٹنے ٹیک دیے۔

وطنِ عزیز میں جاری و ساری کرپٹ نظام کسی سے پوشیدہ نہیں بلکہ یہ معاشرے میں نچلے طبقوں تک سرایت کر چکا۔ یہ بدچلن طبقہ ہالا کی کھلے عام کرپشن کا شاخسانہ ہے۔ یہ حقیقت تمام اداروں پہ روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ سیاست دان، کاروباری افراد، عدلیہ و عسکری اداروں سے وابستہ کرپٹ افراد مختلف طریقوں کے ذریعے لوٹی گئی ملکی دولت سے دبئی، لندن، ٹورنٹو وغیرہ میں جائیدادیں بنا رہے ہیں لیکن کسی نے مزاحمت نہیں کی مگر اب حالات بدل رہے ہیں۔

عدالت عالیہ نے پنجاب حکومت کی تشکیل کردہ اُن ۵۶ کمپنیوں کا حساب طلب کیا ہے جن میں اربوں روپے کی کرپشن ہونے کی اطلاع ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو یہ جواب دینا ہو گا کہ سرکاری اور بلدیاتی محکموں کی موجودگی میں کس قانون اور ضابطے کے تحت یہ کمپنیاں بنائی گئیں؟ تحریک انصاف کے راہنما عمران خان اور جہانگیر ترین بھی عدالتوں میں اپنا دفاع کرنے میں جتے ہوئے ہیں اور ان کی پیش کردہ دستاویز پر اعتراضات اٹھ رہے ہیں۔ سندھ میں بھی حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والے وزیر و مشیر اور سرکاری افسر مقدمات کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس عالم میں کرپٹ، ملک دشمن اور غدار کوشش کر سکتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح ملک میں افراتفری کا ماحول پیدا کر کے فوج کو مارشل لا لگانے پر اکسائیں مگر حالات یہی اشارہ کرتے ہیں کہ فوج ملک میں مارشل لا لگانے سے گریز کرتے ہوئے یہ کوشش کرے گی کہ جمہوریت کی گاڑی پٹڑی سے اترنے نہ پائے۔

وزیرِ اعظم اور آرمی چیف کی امریکی وزیرِ خارجہ سے مشترکہ ملاقات نے اداروں کے مابین مفاہمت کی نئی فضا کو جنم دیا جو یکجہتی و اتحاد کی علامت ہے۔ یقین ہے کہ اب اس تاریخ ساز دن کا سورج طلوع ہو گا جسے فیض نے برسوں قبل کچھ یوں تصور کیا تھا:

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل پہ لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
ہم دیکھیں گے

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

فہرست

کچھ اپنی زباں میں

خوداعتماد پاکستان...... مشکلیں پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں — الطاف حسن قریشی — ۰۹

صورتِ حال

پاک سعودی تعلقات کے نئے تقاضے......راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی روداد — الطاف حسن قریشی — ۱۱

جوہرِ قابل

ٹھیلا لگانے سے صدر بننے تک...... دنیا کی پہلی باحجاب حکمران کا بے مثال قصۂ جہد — سید عاصم محمود — ۲۸

تاریخ اسلام

نبی کریمؐ سے متاثر اسرائیلی حکمران...... یہودی عورت نے سیرت نبویؐ سے جب راستہ پایا — جاوید چودھری — ۱۲۴

شہنشاہ جہانگیر کا لالچ...... عدل وانصاف کی اہمیت اُجاگر کرنے والا یادگار واقعہ — حبیب اشرف صبوحی — ۶۳

انکشافات

بھارت کے ۱۱ خوفناک سچ...... عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تلخ حقائق — رضوان علی شاہ — ۴۵

شخصیات

القرآن کریم کی برکت...... کتابِ مقدس سے الفت نے ایک صحابی رسولؐ کو برگزیدہ بنادیا — وقار عثمان — ۵۸

کراچی کے مولانا سیفی...... نامور عالم دین اور کارکن کی دلنواز آپ بیتی — شاہ محی الحق فاروقی — ۱۶۰

تجرباتِ زندگی

فبای الاء ربکما تکذبٰن...... حسین زندگی کو منفی سوچوں سے ضرر رساں مت بنائیے — سعدیہ جبار — ۶۱

یادِ ماضی...... بڑھاپے نے اُسے زندگی کے عجب ذائقے سے روشناس کروادیا — سعدیہ کنول — ۱۱۰

مجھے معذور مت کہو...... روشنی کا مینار بن جانے والے باہمت نوجوان کی جگ بیتی — عبداللطیف ابوشامل — ۲۱۷

سائنس و ٹیکنالوجی

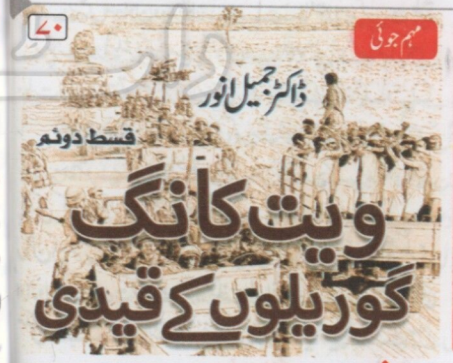

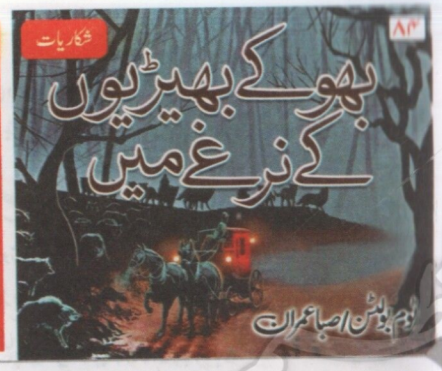

بٹ کوائن کی پُراسرار دنیا......ایسی عجیب وغریب کرنسی جو سرمایہ کاروں کی آنکھ کا تارا بن چکی — عاصم محمود — ۳۹

۲۷ جی بی کی مفت آن لائن ڈرائیو......اب فائلز محفوظ کرنے کا آسان حل نکل آیا — راؤ محمد شاہد اقبال — ۱۸۹

طنز و مزاح

صحیح ہے جناب......جو آپ سے اختلاف ہی نہ کریں ان کی ناقدری کون کرے — عطاالحق قاسمی — ۶۸

پَل و چاہ نہیں پوتا بنا...... پوتے کی خوبیوں اور برکات پر روشنی ڈالتا اچھوتا قلمی مرقع — پروفیسر غلام جیلانی اصغر — ۲۱۱

اک چراغ اور بُجھا......معاشرے کے ایک نرالے کردار کا شوخ و شنگ خاکہ — مظفر بخاری — ۲۲۲

تم اور طرح کے......ایک ٹیچر کو جب پہلا سبق دیتے ہی سر پہ اولے پڑ گئے — مہ جبین تاج ارزانی — ۲۲۷

سیر و سیاحت

شامی یتامیٰ کے درمیان......ایک ہمدرد پاکستانی سماجی کارکن کی دل افروز یادیں — ڈاکٹر آصف محمود جاہ — ۸۸

اونڈھی بستی......بحیرۂ عرب کے کنارے واقع پُراسرار کھنڈرات کی سحرانگیز سیاحت — شاہد لطیف — ۱۰۱

افسانے رکہانیاں

ملاقات......ایک پُراسرار بوڑھے کو دیکھ کر اُسے اپنا باپ یاد آ گیا — علی اکمل تصور — ۹۳

دو سو روپے......نازک احساسات سے عاری ایک سنگ دل سیٹھ کا ماجرا — کوثر اسلام — ۹۹

کچرے والے......ایک مغرور کی پتا جب اُسے غریب کی قدر و قیمت پتا چل گئی — سمیرا کلثوم — ۱۰۵

وزیراعظم......کاش ہمارے ملک کو بھی ایثار کا دھنی حکمران نصیب ہوجائے — قاضی شارق محمود — ۱۲۷

دلدل......دورِ جدید کی مصنوعی زندگی سے عاجز آئی لڑکی کا منفرد فسانہ — سعدیہ بتول — ۱۵۱

مراجعت......دیارِ غیر میں مرتد ہوجانے والی ایک پاکستانی لڑکی کی کتھا — منزہ نصیر — ۱۷۰

احسان......وہ ایک بے یار و مددگار لڑکی کا سہارا بننا چاہتا تھا مگر...... — احمد ندیم قاسمی — ۱۸۱

سہارا راستہ......زندگی کی تلخیوں نے اُسے دوسروں کے دکھ درد سے آشنا کروادیا — وقاص چودھری — ۲۰۳

معلومات

سمندر کی شہزادی...... دنیا کے سب سے بڑے اور سحر انگیز جانور کی دلچسپ معلومات — محمد خلیل چودھری ۹۷

دنیا کا پہلا مہم جو حکمران...... جس نے دریافتوں کے بحری اسفار کی بنیاد رکھی تھی — طارق عزیز خان ۱۰۸

آپ بیتی / یادداشتیں

میرے بچپن کے دن...... اس دورِ یادگار کی سہانی باتیں جو اب خواب ہو چکیں — رفیق سجاد ۱۱۳

جب جنرل ضیاالحق کا طیارہ گرا...... پی ٹی وی میں گزرے شب و روز کی سبق آموز داستان — افتخار مجاز ۱۲۱

ماں کے آٹھ جھوٹ...... مادرانہ محبت و عقیدت میں ڈوبی سبق آموز داستان — پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ ۱۴۸

جب راک فیلر پشاور آیا...... ایک امریکی کا رویہ پاکستانی کو آزادی کی قدر کروا گیا — اجون خان جدون ۱۶۷

غیر ملکی ادب

بدگمان...... شک کے ہاتھوں اپنی بسی بسائی زندگی اُجاڑنے والے کا قصۂ عجب — شاکر لطیف ۱۱۵

مُردہ شوہر کا ہاتھ...... حقیقت اور تصورات نے اُسے بھول بھلیوں میں گم کر دیا تھا — مہر افروز ۱۵۷

جزیرے کا سفر...... لمحہ بہ لمحہ کروٹ بدلتی ایک شاطر قاتل کی سنسنی خیز داستان — انجم فاروق ساحلی ۱۹۳

لمحہ فکریہ

طلبہ کا بیت المال...... چند معمولی سکے ہزارہا بچوں کی قسمت بدل سکتے ہیں — فیصل یعقوب عرب ۶۵

وارث جب کرپٹ ہو جائیں...... گھروں کے ٹکڑے کر دینے والی ان کہی کہانی — مصباح الایمان صدیقی ۱۵۴

روہنگیا مسلمانوں کو بے سہارا نہ چھوڑیے...... پاکستانی تنظیمیں بھی سرگرم ہو چکیں — ڈاکٹر آصف محمود جاہ ۲۰۰

طب و صحت

انسانی جسم کی فیکٹری...... اگر یہ کارخانہ بند ہو جائے تو انسان کی موت یقینی ہے — ڈاکٹر جاوید اقبال ۲۰۶

مستقل سلسلے

شاعری ۱۷۸...... تبصرۂ کتب ۲۲۹...... چمن خیال ۲۳۳

خود اعتماد پاکستان

اس تکلیف دہ حقیقت کے باوجود کہ ہمارا وطن داخلی اور خارجی چیلنجوں میں گھرا ہوا ہے اور سیاسی انتشار مختلف صورتیں اختیار کرتا جا رہا ہے، آزمائشوں کی بھٹی میں وہ کندن بنتا جا رہا ہے۔ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہوتی جا رہی ہیں۔ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے، تو فنا ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی ستر سالہ تاریخ میں کئی موڑ ایسے آئے کہ اسے اپنی بقا اور سلامتی کے لالے پڑ گئے تھے، لیکن خالقِ حقیقی اور عوام کی قوتِ ارادی نے معجزے دکھائے اور حیاتِ نو کے چشمے اُبلنے لگے۔ تقسیمِ برِصغیر جن جاں گسل حالات میں ہوئی، ان میں پاکستان کے لیے اپنا وجود قائم رکھنا انتہائی محال تھا، کیونکہ کوئی انتظامی مشینری تھی نہ کروڑوں مہاجرین کا بوجھ اُٹھانے والی معیشت۔ بھارتی وزیرِاعظم پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ نیا ملک چھ ماہ سے زائد زندہ نہیں رہ سکے گا وہ معاشی طور پر بیٹھ جائے گا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ صرف سات برسوں میں پاکستان کی معیشت بھارتی معیشت سے کہیں زیادہ مستحکم ہو گئی اور اس کے روپے کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح مظلوم کشمیریوں کو بھارتی غاصبانہ قبضے سے نجات دلانے کے 'جرم' پر بھارت نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر جنگ مسلط کر دی، مگر ہماری پُرعزم قوم اور ہماری سربکف افواج نے دشمن کے مذموم ارادے ناکام بنا دیے اور وہ لاہور میں داخل نہ ہو سکا اور مدتوں اپنے زخم چاٹتا رہا۔ آج بھی اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔

گزشتہ دہائی میں امریکا جس نے جنوبی ایشیا میں اشتراکی یلغار کی روک تھام کے لیے ہمیں دفاعی معاہدوں میں شامل کیا تھا، اس نے پاکستان کے ساتھ عجیب و غریب طرزِ عمل اختیار کیے رکھا ہے۔ سیکورٹی کونسل نے جب افغانستان کے خلاف فوجی اقدام کی قرارداد منظور کی اور امریکا اپنی اتحادی طاقتوں کے ساتھ افغانستان پر حملہ آور ہوا، تو جنرل پرویز مشرف نے اتحادیوں کو ہر ممکن امداد فراہم کی اور یوں عالمی دہشت گردی کے خلاف پاکستان فرنٹ لائن اسٹیٹ بن گیا۔ ایک طرح سے امریکی جنگ پاکستان کی جنگ بن گئی جس میں پچاس ہزار سے زائد شہری اور دس ہزار کے لگ بھگ فوج اور پولیس فورس کے جوان شہید ہوئے اور پاکستان کو سو ارب ڈالر کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان بے مثال قربانیوں کے باوجود امریکا ہم سے ڈومور کا مطالبہ کرتا، ہمیں آنکھیں دکھاتا اور بھارت کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتا رہا۔ اس ناانصافی اور قانونِ فطرت سے رُوگردانی کے نتیجے میں امریکی

صدارت کے جلیل القدر منصب پر ایک ایسا شخص متمکن ہو گیا ہے جسے ریاستی امور چلانے کا تجربہ ہے نہ اس میں کوئی فہم و فراست پائی جاتی ہے۔ اس کے بیانات اور اقدامات امریکی معاشرے کو تقسیم کرنے کے علاوہ دنیا کے مختلف خطوں میں توازنِ اقتدار بگاڑنے کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔ صدر ٹرمپ نے ۲۱ اگست کو افغانستان اور جنوبی ایشیا کی جس پالیسی کا اعلان کیا ہے، اس میں عالمی امن کو تہ و بالا کر دینے کے تمام اجزاء موجود ہیں۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر افغانستان کا مسئلہ حل کرنا اور جنوبی ایشیا میں قیادت کا تاج بھارت کے سر پر رکھنا اور پاکستان کو دہشت گردوں کی پشت پناہی کا مزہ چکھانا چاہتے ہیں۔ اس جارحانہ طرزِ عمل کے خلاف پاکستانی قوم اُٹھ کھڑی ہوئی ہے اور عالمی اُفق پر ایک خود اعتماد پاکستان کا ظہور عمل میں آیا ہے۔ امریکی وزیرِ خارجہ جن کا استقبال ائیر پورٹ پر خود وزیرِ اعظم کیا کرتے تھے، اس بار ٹیلرسن کا خیر مقدم وزارتِ خارجہ کے ایک جونیئر افسر نے کیا۔ امریکی وزیرِ خارجہ سے الگ الگ ملاقاتیں کرنے کے بجائے سیاسی اور عسکری قیادت نے ایک چھت کے نیچے ملاقات کی اور اسے کھری کھری سنائیں۔ صاف صاف کہہ دیا ہمیں آپ کی مالی امداد کی ضرورت ہے نہ جدید اسلحے کی۔ ہم ایک باوقار اور خود مختار قوم کی حیثیت سے عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنا کردار ادا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ پاکستان افغانستان کے سیکورٹی معاملات میں بھارت کا کوئی کردار قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وزیرِ داخلہ جناب احسن اقبال نے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی چیرہ دستیوں کا پورا احوال بیان کیا اور امریکی دوغلی پالیسی پر کڑی تنقید کی۔ پاکستان اب امریکی سحر سے باہر نکل آیا ہے اور اس کے عوام اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے عظیم جذبوں سے سرشار ہیں۔

ایک خود اعتماد پاکستان کا علم بلند ہو چکا ہے جسے سربلند رکھنے کے لیے قومی قیادت کو بڑے ایثار اور بالغ نظری سے کام لینا ہو گا۔ سب سے پہلی ضرورت سیاسی انتشار پر قابو پانے اور معیشت کو مضبوط بنانے کی ہے۔ سیاسی انتشار کی بڑی وجہ سیاسی جماعتوں میں جمود اور اخلاقی زوال اور تازہ افکار کا فقدان ہے۔ اس ضمن میں فوری طور پر چند کڑے فیصلے کرنا ہوں گے۔ (۱) سادگی اور کفایت شعاری کی پالیسی اپنائی جائے اور نمود و نمائش پر کڑی پابندی لگائی جائے۔ (۲) ہر شعبے میں مڈل کلاس کی قیادت کو پروان چڑھانے کے لیے ایک اخلاقی نظم کے تحت کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسٹوڈنٹس یونینیں بحال کی جائیں۔ (۳) روزمرہ زندگی میں ملکی اشیاء استعمال کرنے میں فخر محسوس کیا جائے۔ (۴) برآمدات میں اضافے کے لیے سائنس دانوں کو ایک بڑا ٹاسک دیا جائے اور ان کے وقار میں اضافہ کیا جائے۔ (۵) سی پیک کے بارے میں حقیقت پسندانہ اور مثبت سوچ کی آبیاری کی جائے۔ (۶) اداروں کے مابین ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ (۷) سیاست دانوں کی کردار کشی ہر اعتبار سے ملکی مفاد کے خلاف ہے، چنانچہ اس کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ (۸) سیاست میں باہمی احترام اور اخلاقی ذمے داری کو فروغ دیا جائے۔ (۹) احتساب کا ایک ایسا عمل شروع کیا جائے جو شفاف اور منصفانہ دکھائی دے۔ (۱۰) یہ احساس اُجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ فوج اپنی قوم کی حمایت کے بغیر کوئی کارنامہ انجام دے سکتی ہے نہ کوئی حکومت فوج کے بغیر اپنی حکمرانی قائم رکھ سکتی ہے۔ ان کے مابین خوش دلانہ تعاون حقیقی طور پر پاکستان کو خود اعتماد بنا دے گا۔

الطاف حسن قریشی

پائنا کے زیرِ اہتمام راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

پاک سعودی تعلقات کے نئے تقاضے

سعودی عرب کے ساتھ ہمارے مضبوط دینی اور تاریخی رشتے قائم ہیں، مگر وہاں اقتدار نئی نسل کو منتقل ہو رہا ہے اور معاشرے میں حیرت انگیز تبدیلیاں آ رہی ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالات اور یمن کے ساتھ جنگ اس کی معیشت اور حکمت عملی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ پاکستان کو نئے حالات کی روشنی میں بالغ نظری اور خود احتسابی سے کام لینا اور دوستی کے بندھنوں کو مضبوط رکھنے کے لیے نئے تقاضوں کا خیال رکھنا ہوگا

کانفرنس کی روداد الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ایک ایسے وقت میں جب عالمی سطح پر اور بالخصوص اسلامی برادری میں اپنے دوستوں اور بہی خواہوں میں اضافے کی اشد ضرورت ہے، پاکستان اور سعودی عرب کے مابین تعلقات کسی قدر سرد مہری کی طرف ہیں۔ اِس حساس موضوع پر غور و خوض کے لیے پاکستان کے تھنک ٹینک پائنا نے راؤنڈ ٹیبل مباحثے کا اہتمام کیا جس کے مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر خالد عباس الاسدی تھے جو عرب دنیا میں گزشتہ سینتیس برسوں سے مقیم ہیں۔ پانچ سال انہوں نے مصر میں گزارے جسے عرب دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک اور دانش کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بتیس برسوں سے وہ مدینہ منورہ کے مکین ہیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت کا عظیم ترین مرکز ہے۔ جناب خالد بیک وقت نہایت اچھے ڈاکٹر، بہت عمدہ نعتیہ شاعر، اقبالیات کے ماہر اور 'مدینہ کل اور آج' کے مصنف ہیں۔ وہ سیلف میڈ اور بڑے خوش نصیب انسان ہیں۔ میری اُن سے پہلی ملاقات آج

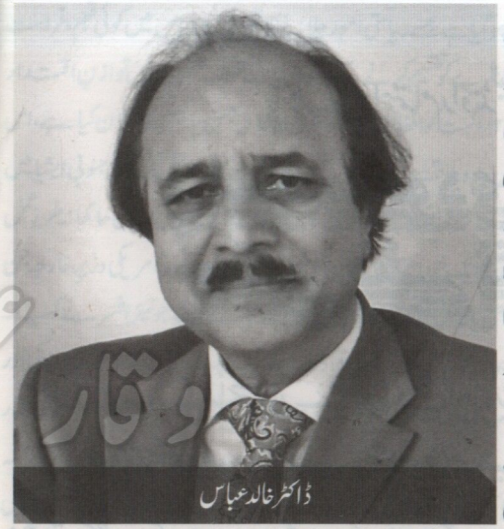

ڈاکٹر خالد عباس

سے اڑتیس برس پہلے قاہرہ میں ہوئی جب وہ قاہرہ میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے طالب علم تھے اور میں مصر میں تعینات سفیر جناب ڈاکٹر ایس ایم قریشی کی دعوت پر مصر گیا تھا اور انہی کی رہائش پر ٹھہرا تھا۔ ان دنوں عرب دنیا کی سب سے مقبول مغنیہ اُم کلثوم نے علامہ اقبال کا 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' کا عربی میں کیا ہوا منظوم ترجمہ بڑے ذوق وشوق سے گایا تھا۔ اس فضا میں جناب نوجوان عباس نے شاعرِ مشرق اقبال پر کتاب تحریر فرمائی جو علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

خوش قسمتی سے ان کے ہم جماعتوں میں ایک عرب طالبہ رندہ بن لادن بھی تھی۔ بن لادن سعودی عرب کا بہت امیر اور بااثر خاندان ہے اور سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی بھی۔ رندہ کی وساطت سے ڈاکٹر خالد عباس کو اس کمپنی میں ملازمت مل گئی اور اُن کا تقرر مدینہ منورہ میں ہوا جہاں مسجدِ نبوی کی توسیع کا کام بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ ڈاکٹر خالد سترہ سال مسجدِ نبوی کے ڈاکٹر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ آج کل وہ ڈاکٹر حامد سلمان الاحمدی ہسپتال سے وابستہ ہیں اور اب تک ہزاروں مریضوں کا علاج کر چکے ہیں۔ اس طرح وہ سعودیوں کی نفسیات اور میلانات سے بخوبی واقف ہیں۔ نصف درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں پاک چین دوستی بھی شامل ہے جس کا چینی زبان میں ترجمہ چین میں شائع ہو چکا ہے، مگر انہوں نے مدحتِ رسول میں جو بلند مقام حاصل کیا ہے، وہ ان کی زندگی اور ہماری عقیدتوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ ان کے نعت کے دو اشعار نے ایک روحانی کیفیت طاری کر دی تھی۔

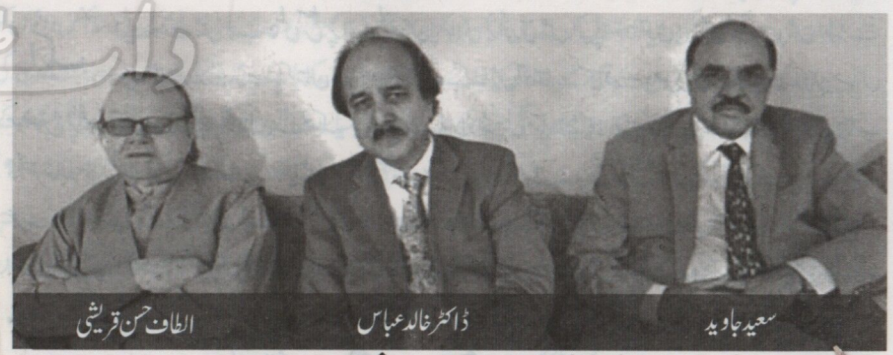

سعید جاوید　　ڈاکٹر خالد عباس　　الطاف حسن قریشی

لفظ جب تک وضو نہیں کرتے
ہم تری گفتگو نہیں کرتے
اُن کو ہرگز خدا نہیں ملتا
جو تیری جستجو نہیں کرتے

اُن کے ترنم میں ایک عجب گداز تھا اور حاضرین عشقِ رسول کی سرشاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حاضرین کیا تھے، علم، ادب اور فہم وفراست کا ایک گلدستہ تھے۔ محترمہ بشریٰ رحمن، محترمہ دردانہ نجم، مجیب الرحمن شامی، امجد اسلام امجد، سجاد میر، یاسین وٹو، حفیظ اللہ نیازی، ممتاز طاہر، ڈاکٹر امان اللہ، رؤف طاہر، محمد مہدی، حبیب اکرم، جاوید سعید، فاروق چوہان، منشا قاضی، فاروق تسنیم، رحمت علی مجاہد، فاروق اعجاز قریشی، عبدالمجید اور محمد ایوب تشریف فرما تھے جبکہ گلوبل پیس تحریک کے روحِ رواں انجم ضیا لندن سے آئے تھے۔ ڈاکٹر خالد نے سب کو اپنی پُرتاثیر گفتگو کے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔

میزبان کی حیثیت سے میں نے پاکستان اور سعودی عرب کے مابین گہرے تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ سعودی عرب نے سخت آزمائشوں میں پاکستان کے معاملات سلجھانے میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔ بھٹو صاحب کے آخری دور میں جب حکومت اور اپوزیشن کے درمیان سخت سیاسی جنگ جاری تھی، تو سعودی سفیر جناب ریاض خطیب نے غیر معمولی سرگرمی دکھائی تھی اور حالات کو بگڑنے سے روکنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اسی طرح جب پرویز مشرف جناب نواز شریف کو بھٹو صاحب کے

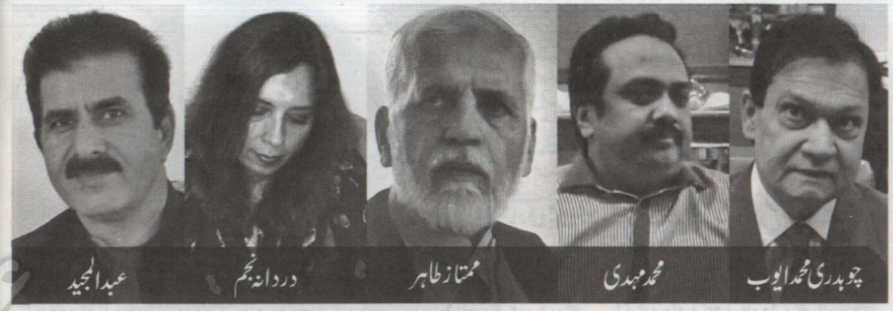

انجام سے دوچار کرنے والے تھے، تو سعودی فرماں روا پاکستان کی مدد کو پہنچے اور وہ ایک اور سیاسی حادثے سے محفوظ رہے۔

مہمانِ خصوصی نے سعودی عرب کا ذکر اپنے ان اشعار سے شروع کیا:

اس زمیں کو سلام کرتے ہیں
تذکرہ صبح و شام کرتے ہیں
محترم جس زمیں نے ہم کو کیا
ہر دعا اس کے نام کرتے ہیں

وہ کہہ رہے تھے کہ سعودی عرب کے ساتھ ہمارے رشتے دینی، مذہبی اور تاریخی ہیں اور اس لیے ہم ایک جان دو قالب ہیں، البتہ وہاں اقتدار نئی نسل کو منتقل ہو رہا ہے اور معاشرہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ تیل کی قیمتوں میں کمی واقع ہونے اور یمن کے ساتھ جنگ جاری رہنے سے حکومت پر معیشت کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے، چنانچہ تارکینِ وطن کے خاندانوں کے ہر فرد پر ٹیکس لگا دیا گیا ہے جو پاکستانی مزدوروں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں پاکستانی بیروزگار ہو کر واپس آ رہے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف گزشتہ چھ ماہ میں ایک لاکھ بارہ ہزار پاکستانیوں کا انخلا ہوا ہے۔ ان حالات میں ہمیں ایک حقیقت پسندانہ حکمتِ عملی وضع کرنا ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ حکومتِ پاکستان نے ڈیڑھ سال پہلے تارکینِ وطن کو فیصلہ سازی میں شامل کرنے کا نہایت اچھا فیصلہ کیا۔ پاکستان اوورسیز فاؤنڈیشن حکومت کا ادارہ ہے جو طویل مدت سے غیر فعال چلا آ رہا تھا۔ اب اس ادارے میں دو سو افراد پر مشتمل ایک ایڈوائزری کونسل تشکیل دی گئی ہے جس میں سفارت خانوں کی مشاورت

سے ایسے افراد شامل کیے گئے ہیں جو تارکینِ وطن میں اچھا اثر و رسوخ کے علاوہ مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کونسل کے چیئرمین بیرسٹر امجد ملک ہیں جن کا تعلق انگلستان سے ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں اور جذبوں کے مالک ہیں۔ میرے علاوہ تین افراد سعودی عرب سے ایڈوائزری کے ارکان ہیں۔ ہماری مدتِ کار تین سال ہے، پہلے سال کے اندر خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ سفارت خانے کا عملہ ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہا ہے اور تارکینِ وطن کے مسائل تیزی سے حل ہونے لگے ہیں۔

پہلے کوئی شخص فوت ہو جاتا، تو اس کی میت کو پاکستان لانا ایک عذاب سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اب اس کام کے لیے ایمبولنس سروس قائم موجود ہے اور میت گھر تک پہنچائی جاتی ہے اور تمام اخراجات او پی ایف برداشت کرتی ہے۔ اسی طرح ملازمت سے فارغ ہو جانے والے تارکینِ وطن کے بچوں کے داخلے پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں کرائے جا رہے ہیں اور ان کے لیے اعلیٰ تعلیمی ادارے اور جامعات قائم کرنے کا منصوبہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ حکومت سے مل کر ایسے انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ تارکینِ وطن کے گھر اور زمینیں محفوظ رہیں اور وہ جو رقم اور تجربہ لے کر اپنے وطن آئیں، اسے نفع بخش منصوبوں میں لگایا جائے جن سے ملکی معیشت مضبوط ہوتی جائے۔ جج صاحبان اور وکلا تنظیموں کو اس امر پر قائل کیا جا چکا ہے کہ تارکینِ وطن کے گھروں اور زمینوں کے مقدمات کا فیصلہ چھ ماہ کے اندر ہوگا اور پورے ضلع میں اس کام کے لیے ایک جج مقرر کیا جائے گا اور حکم امتناعی چھ ماہ سے زائد نہیں دیا جائے گا۔

جناب ڈاکٹر خالد عباس بتا رہے تھے کہ تارکینِ وطن کی تعداد ۱۴۲ ممالک میں اسّی لاکھ کے لگ بھگ ہے جو ہماری معیشت کو سنبھالا دیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے دولت بھی کمائی ہے اور اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ وہ مختلف شعبوں اور اداروں میں کام کرنے کا بیش بہا تجربہ رکھتے ہیں۔ ہماری کونسل کے چیئرمین بیرسٹر صاحب کی خواہش ہے کہ ہم انھیں عزت اور وقار کے

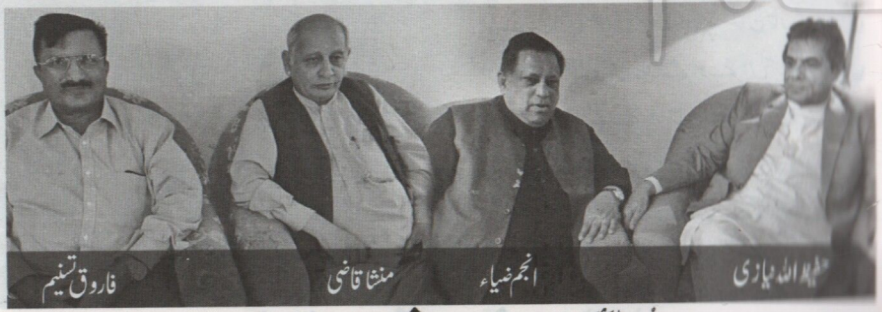

ساتھ واپس لانے کا اہتمام کریں اور ان کے تجربوں اور صلاحیتوں سے وطن کے معاملات بہتر انداز میں چلانے کا نظم قائم کریں۔ ڈاکٹر خالد اس بات پر بار بار زور دے رہے تھے کہ سعودی عرب اور پاکستان کے تعلقات میں استحکام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

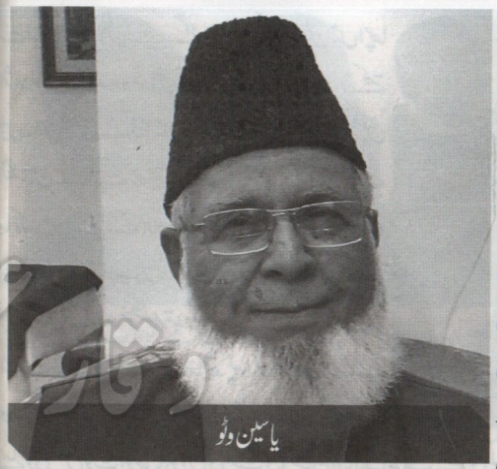
یاسین وٹو

جناب جاوید سعید جنھوں نے الفیصل ہسپتال میں فنانس منیجر کے طور پر پچیس سال کام کیا ان کا خیال ہے کہ پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات میں پہلی دراڑ جنرل (ر) اسلم بیگ کے زمانے میں پڑی۔ انھوں نے کویت پر عراقی قبضے کے وقت صدام حسین کے حق میں بیانات دیے اور بادل نخواستہ پاکستانی فوج سعودی عرب بھیجی تھی۔ میرے بھائی بھی جو فوج میں تھے، وہ بھی سعودی عرب آئے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ سعودی پاکستانی فوج کے ساتھ امریکی فوجیوں کے مقابلے میں کم تر درجے کا سلوک روا رکھتے تھے۔ انہی دنوں یہ بات لیک ہوئی کہ امریکا نے سعودی عرب کو مشورہ دیا ہے کہ مسلم ملکوں سے افرادی طاقت میں بتدریج کمی کر دی جائے۔ اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور سری لنکا اور فلپائن سے لوگ بھرتی کیے جانے لگے۔ میرے اندازے کے مطابق چند برسوں کے دوران پاکستانیوں کی تعداد میں تین چار لاکھ کی کمی واقع ہو چکی تھی۔

کانفرنس میں تعلقات کے نئے تقاضوں پر گفتگو جاری رہی۔ ہمارے معروف تجزیہ نگار جناب سجاد میر نے رائے دی کہ دوست ممالک کے مابین دوستی اسی وقت فروغ پاتی ہے جب ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھا جائے اور غیر حقیقی امیدیں وابستہ کرنے سے گریز کیا جائے۔ بلاشبہ سعودی عرب اور پاکستان تاریخی، مذہبی اور ثقافتی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں مگر یمن کی جنگ کے حوالے سے پاکستان سے سعودی عرب نے ایک ایسا مطالبہ کر دیا تھا جسے پورا کرنا اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ ہم دو مسلم ملکوں کے درمیان لڑائی میں جانب داری کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس موضوع پر

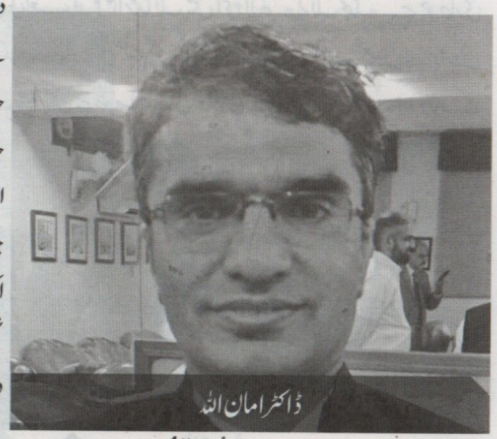
ڈاکٹر امان اللہ

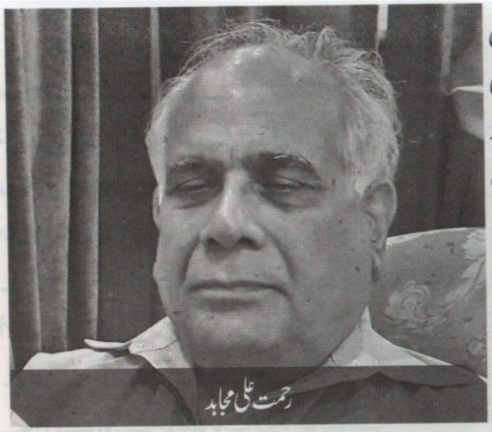
رحمت علی مجاہد

تاریخی تناظر پر رائے دیتے ہوئے روزنامہ پاکستان کے ایڈیٹر جناب مجیب الرحمن شامی نے کہا کہ پاکستان کی طرف سے ایٹمی دھماکوں پر امریکا نے ہم پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ تب سعودی عرب نے ہمیں پانچ سال تک مہنگا تیل راز داری سے مفت فراہم کیا ہے، مگر ہمارے سیکرٹری خزانہ نے یہ راز فاش کر کے مسائل پیدا کر دیے تھے۔ ہمارے تعلقات میں بڑا رخنہ ہماری پارلیمنٹ کی اس قرارداد سے پڑا جس میں سعودی عرب-یمن جنگ میں ہم نے غیر جانب داری کا اعلان کیا جو سعودی فرماں رواؤں پر بہت شاق گزرا۔ ہم ایک متوازن پالیسی اور سفارتی لب ولہجہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ ہمارے ارباب اقتدار آج بھی حکمت اور بصیرت سے اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔

کالم نگار جناب رؤف طاہر نے ایک اور اہم سبب کی طرف اشارہ کیا کہ ۲۰۱۳ء میں ہمارا خزانہ بڑی حد تک خالی تھا۔ سعودی عرب نے پاکستان کو ڈیفالٹ سے بچانے کے لیے ڈیڑھ ارب ڈالر فراہم کیے۔ اس پر ہمارے بعض نام نہاد آزاد خیال دانش وروں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا کہ سعودی عرب نے ڈیڑھ ارب ڈالر کس کام کے لیے دیے ہیں۔ ان غیر محتاط رویوں نے بدگمانیاں پیدا کیں جو ہمارے دیرینہ تعلقات پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ سچی دوستی کے تقاضوں کا خیال رکھنا اور حالات کی نزاکت کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ہی اصل دانش مندی، خیر خواہی اور وضع داری ہے۔

جناب فاروق چوہان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے جناب ڈاکٹر خالد عباس نے بتایا کہ جو پاکستانی منشیات فروشی کے جرم میں جیل کے اندر ہیں، ان کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی، البتہ ہمارا سفارت خانہ اور اب پی او ایف ایڈوائزری کونسل ان پاکستانیوں کو پوری مدد پہنچا رہی ہے جو معمولی جھگڑوں کے باعث جیل میں پڑے ہیں۔ انہوں نے تجویز دی کہ سعودی عرب ہمارا قریبی دوست ہے اور شرقِ وسطیٰ میں اسے ایک خاص حیثیت حاصل ہے، اس لیے ہمارے سفارت خانے کو حالات کے نئے

الطاف حسن قریشی

تقاضے پورے کرنے کے لیے بہت محنت کرنا ہوگی۔ دونوں ملکوں کے مابین فوجی تعلقات مزید مستحکم کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاصی تعداد میں ایسے ڈاکٹر اور ماہرین موجود ہیں جو فرماں رواؤں اور شہزادوں کے معالج اور معاون رہے ہیں۔ اسی طرح دینی شخصیات بھی تعلقات کے فروغ میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان میں حرمین شریفین کے آئمہ کرام سرفہرست ہیں۔

یہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ۱۷ اکتوبر کی رات جم خانہ کلب لاہور میں انعقاد پزیر ہوئی۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ امام کعبہ ڈاکٹر صالح بن حمید پاکستان تشریف لائے اور وزیراعظم شاہد خاقان عباسی نے انھیں وفاقی کابینہ سے خطاب کرنے کی خصوصی دعوت دی۔ انھوں نے فرمایا میں خادم حرمین شریفین، ولی عہد، سعودی عرب کے علما اور عوام کی طرف سے سلام پیش کرتا ہوں۔ مجھے پاکستان آنے کا متعدد بار موقع ملا ہے اور میں اسے اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ پاکستان اور سعودی عرب کے روابط تاریخی اور مضبوط ہیں۔ پاکستان نے ہمیشہ سعودی عرب کا ساتھ دیا ہے اور ہر طرح کے حالات میں ہمارے ساتھ کھڑا رہا ہے۔ اُن کا ارشاد تھا کہ دنیا میں وہ ملک عدم استحکام کا شکار ہوئے جو اتحاد اور اتفاق برقرار نہ رکھ سکے، اس لیے ہر قیمت پر اتحاد قائم رکھا جائے اور ذاتی معاملات سے بالاتر ہو کر ملکی مفادات میں فیصلے کیے جائیں۔ امام کعبہ خیر سگالی کا جو روح پرور پیغام دے گئے ہیں وہ پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات کو ایک نئی معنویت عطا کرسکتا ہے۔ ●●●

رؤف طاہر
امجد اسلام امجد

تندرستی کے ضامن ۱۰ غذائی عناصر

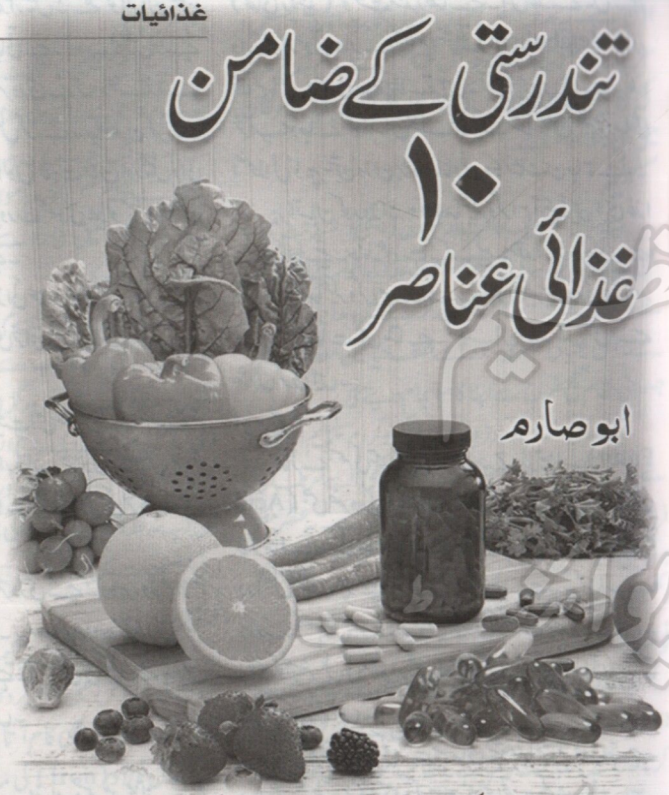

ابو صارم

بیماریوں سے محفوظ رکھنے والے حیاتین و معدنیات کا علم پاکر صحت پالیجیے

عامر ایک کمپنی میں سیلز مین تھا۔ وہ شام کو گھر واپس آتا، تو رات دیر تک ٹی وی دیکھتا رہتا۔ کبھی موبائل فون پر گیمز کھیلتا۔ اس دوران اُسے جو شے کھانے کو ملتی، بے سوچے سمجھے چٹ کر جاتا۔ بوتل اور ''جنک فوڈ'' یعنی برگر، چپس، پیزے وغیرہ اس کی من پسند غذا تھی۔

ایک دن اُسے تھکن محسوس ہوئی۔ عضلات بھی درد کرنے لگے۔ عامر نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے اُسے چند ادویہ لکھ دیں۔ ادویہ کھائی گئیں مگر عامر کو افاقہ نہ ہوا۔ جسم بدستور تھکن اور تکلیف کا شکار رہا۔ عامر کو علم ہی نہ تھا کہ اُسے یہ تکلیف اس لیے چمٹی، وہ اپنی غذا سے مناسب میگنیشیم حاصل نہیں کر پاتا۔

میگنیشیم جیسی معدنیات، حیاتین یا وٹامن اور غذائی عناصر (Nutrients) ہمارے جسم کا ایندھن ہیں۔ انسانی بدن غذا سے یہ ایندھن حاصل کرتا ہے لیکن انسان اگر غیر معیاری غذا کھائے، تو جسم اپنا ایندھن حاصل نہیں کر پاتا اور مختلف خرابیوں اور بیماریوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔

اب میگنیشیم ہی کو لیجیے۔ ہر بالغ مرد و عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزانہ ۳۵۰ ملی گرام میگنیشیم غذاؤں سے حاصل کرے۔ یہ معدن ہمارے عضلات کو صحت مند رکھتا ہے۔ ہماری نسیں اپنا کام درست طریقے سے انجام دیتی ہیں۔ ہڈیاں مضبوط رہتی ہیں۔ دل کی دھڑکن بھی بے قابو نہیں ہو پاتی۔ میگنیشیم خون میں شکر کی سطح بھی اعتدال میں رکھتا ہے نیز انسانی جسم میں کھانے سے غذائیت کا عمل بھی اس معدن کی مدد سے انجام پاتا ہے۔

اگر جسم کو یہ معدن مطلوبہ مقدار میں نہ ملے تو انسان تھکن محسوس کرتا ہے۔ اس کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ وہ بے چین رہنے لگتا ہے لہٰذا ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ غذا سے روزانہ مناسب میگنیشیم ضرور حاصل کرے۔ یہ معدن گہرے سبز رنگ کی سبزیوں' مغزیات' دالوں' ثابت اناج اور تیل والی مچھلیوں میں پایا جاتا ہے۔ ضرورت محسوس ہو تو ملٹی وٹامن گولی کے طور پر بھی لیا جاسکتا ہے۔

ذیل میں ایسے مزید نو اہم غذائی عناصر کا تعارف پیش ہے جس کی ہمارے جسم میں کمی ہمیں طبی خرابیوں میں مبتلا کرسکتی ہے۔

کیلشیم

ہڈیوں اور دانتوں کی عمدہ صحت اسی معدن کے دم قدم سے ہے۔ اس کی تھوڑی سی مقدار ہمارے خون میں ہر دم رواں رہتی ہے۔ وجہ یہ کہ عضلات بشمول دل کی حرکات میں یہ معدن مدد دیتا ہے۔

بالغ مرد و زن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر روز کم از کم ۲۵۰۰ ملی گرام کیلشیم ضرور لیں۔ یہ معدن دودھ' پنیر' دہی' سبز سبزیوں اور مغزیات سے ملتا ہے۔ اس کی کمی سے ہڈیاں کمزور ہو کر بھربھری ہو جاتی ہیں۔

پوٹاشیم

یہ ایک اور اہم معدن ہے۔ یہ انسان جسم میں مختلف مائع جات کی سطح متوازن رکھتا ہے۔ خون کا دباؤ کم کرتا اور دل کو صحت مند رکھتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ غذا میں پوٹاشیم کی مطلوبہ مقدار شامل ہو تو انسان بلند فشار خون یعنی بلڈ پریشر کا شکار نہیں ہوتا۔

بالغ انسان غذاؤں سے روزانہ ۴۵۰ ملی گرام پوٹاشیم ضرور حاصل کرے۔ یہ معدن ٹماٹر' کیلے' سبز پتوں والی سبزیوں' خشک پھلوں اور پھلیوں میں ملتا ہے۔

آئیوڈین

یہ غذائی عنصر ہمارے جسم کے ایک اہم غدہ' قدامیہ (تھائی رائیڈ) کو صحت مند رکھتا ہے۔ اس غدے میں بننے والے ہارمون ہمارے نظام استحالہ (Metabolism) اور نظام ہاضمہ کو عمدگی سے چلاتے ہیں۔ آئیوڈین کی کمی سے یہ غدہ خراب ہو جائے' تو انسان مختلف تکالیف مثلاً تھکن' گلہڑ' دماغی اضمحلال' ڈیپریشن' وزن بڑھ جانا وغیرہ کا نشانہ بن جاتا ہے۔

ہر انسان کو روزانہ ۱۵۰ مائیکروگرام آئیوڈین اپنی غذا سے لینا چاہیے۔ حاملہ عورت کے لیے یہ مقدار بڑھ جاتی ہے یعنی ۲۵۰ مائیکروگرام روزانہ۔ یہ غذائی عنصر سمندری غذا اور ڈیری مصنوعات میں ملتا ہے۔ کمپنیاں نمک میں بھی اسے شامل کرتی ہیں۔

اومیگا ۳

ہمارے جسم کی تندرستی کے لیے یہ چربیلا تیزاب (Fatty Acid) بھی ضروری (Essential) ہے۔ معنی یہ کہ ہمیں لازماً اسے اپنی غذاؤں سے حاصل کرنا چاہیے۔ اومیگا ۳ دراصل مختلف چربیلے تیزابوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تیزاب ہمارے جسم میں موجود اربوں خلیوں کو صحت مند رکھتے ہیں۔ اچھے کولیسٹریل کی مقدار میں اضافہ کرتے اور جسمانی ورزش میں کمی لاتے ہیں۔

اومیگا تھری کی کمی سے جسمانی نشوونما متاثر ہوتی ہے۔ دماغ صحیح طرح کام نہیں کرتا اور ذہنی قوت کم ہو جاتی ہے۔ بالغ انسان کو روزانہ غذاؤں سے ۴۵۰ ملی گرام یہ غذائی عنصر لینا چاہیے۔ اومیگا تھری تیل والی سمندری مچھلیوں' السی کے تیل اور اخروٹ میں ملتا ہے۔

ریشہ Fibre

یہ غذائی عنصر ہمارے نظام ہاضمہ کو صحت مند رکھتا ہے۔ ریشے کے ذریعے آنتیں آلائشوں سے پاک رہتی ہیں۔ خون میں شکر (یا گلوکوز) کی سطح بڑھنے نہیں دیتا۔ کولیسٹرول کی سطح بھی متوازن رکھتا ہے۔ چنانچہ انسان امراض قلب اور ذیابیطس جیسے موذی امراض سے محفوظ رہتا ہے۔

بالغ انسان کو ہر روز ۱۸ تا ۲۵ ملی گرام ریشے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ غذائی عنصر پھلیوں' دالوں' ثابت اناج' پھل و سبزیوں اور مغزیات سے حاصل کرنا ممکن ہے۔ جسم میں ریشے کی کمی ہو جائے تو انسان دل کی بیماریوں' ذیابیطس حتیٰ کہ سرطان میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔

سیلینیم

یہ کیمیائی عنصر ایک طاقت ور تکسیدی (اینٹی آکسیڈنٹ) مادہ بھی ہے۔ چنانچہ انسانی جسم کو مضر صحت غذا یا ماحولیاتی عناصر سے نقصان پہنچے' تو سیلینیم انھیں دور کرنے میں بدن کی مدد کرتا ہے۔ اس کیمیائی عنصر کی مدد سے مختلف حیاتین' معدنیات اور جسمانی نظام صحیح طرح سے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

ایک بالغ انسان کو روزانہ ۵۵ مائیکروگرام سیلینیم اپنی غذا سے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کیمیائی عنصر کی کمی اُسے سرطان' ذیابیطس اور دیگر موذی امراض کا شکار بنا سکتی ہے۔ یہ عنصر مغز برازیل (برازیل نٹ)' سمندری مچھلیوں' گوشت' بیجوں اور کھمبیوں میں پایا جاتا ہے۔

فولیٹ

یہ حیاتین بی ۹ اور فولک ایسڈ بھی کہلاتا ہے۔ یہ حیاتین بی ۱۲ کے اشتراک سے ہمارے جسم میں خون کے سرخ خلیے پیدا کرتا اور انھیں تندرست رکھتا ہے۔ نظام مامون کو بھی توانا رکھتا ہے۔ حمل کے پہلے تین ماہ یہ پرورش پاتے بچے کو کئی پیدائشی بیماریوں سے بچاتا ہے۔

فولیٹ کی کمی سے انسان زبان کی سوزش (التہاب اللسان)' ڈیپریشن' بے چینی' خون کی کمی' اسہال اور (دوران حمل) دماغ و جسم کی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

انسان کو بہ لحاظ عمر روزانہ ۳۲۰ تا ۴۰۰ مائیکروگرام فولیٹ غذاؤں سے حاصل کرنا چاہیے۔ یہ وٹامن گہری سبز رنگت والی سبزیوں' پھلوں' مغزیات' گوشت اور انڈے میں ملتا ہے۔ کئی ممالک میں کمپنیاں اسے آٹے' چاول اور دیگر اجناس کی اپنی مصنوعات میں شامل کرتی ہیں۔

وٹامن ڈی

یہ حیاتین کیلشیم' فاسفیٹ اور میگنیشیم کو انسانی جسم میں جذب کرواتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی سے کیلشیم وغیرہ بدن میں جذب نہیں ہوتے' یوں ہڈیاں بھربھری ہونے لگتی ہیں۔ یہ ہمارے نظام تنفس اور مامون نظام کو بھی تندرست رکھتا ہے۔ جدید طبی تحقیق کی رو سے یہ ایک اہم وٹامن ہونے کا مقام حاصل کر چکا۔

قدرتی طور پر یہ حیاتین کم ہی غذاؤں سے ملتا ہے۔ سورج کی روشنی اس کا سب سے بڑا منبع ہے' لہٰذا روزانہ بیس پچیس منٹ دھوپ میں ضرور گزاریے تاکہ جسم کو مطلوبہ وٹامن ڈی حاصل ہو سکے۔ ایک بالغ انسان کو روزانہ ۶۰۰ جبکہ بچوں کو ۴۰۰ انٹرنیشنل یونٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں ڈبہ بند غذائیں بنانے والی بہت سی کمپنیاں اس حیاتین کو اپنی مصنوعات میں شامل کرتی ہیں۔

فولاد

انسان جسم میں پہنچ کر یہ کیمیائی عنصر خون کے سرخ خلیوں کی پیدائش میں اہم کردار ادا کرتا ہے نیز انھیں تندرست رکھنے میں بھی کام آتا ہے۔ انسانی بدن کے بہت سے افعال فولاد (Iron) کی مدد سے اپنی ذمے داریاں انجام دیتے ہیں۔

ہمارے بدن میں فولاد کی کمی ہو جائے' تو خون کے سرخ خلیے کم جنم لیتے ہیں چنانچہ خون کی کمی سے انسان کمزوری اور دل کی بے ترتیب دھڑکن کا نشانہ بن سکتا ہے۔ بچوں کو غذا سے مطلوبہ فولاد نہ ملے' تو ان کی فطری نشوونما نہیں ہو پاتی۔

ہر انسان کو روزانہ چھ سے آٹھ ملی گرام فولاد اپنی غذا سے حاصل کرنا چاہیے۔ یہ کیمیائی عنصر سرخ گوشت اور جگر' گہری رنگت والی سبزیوں' انڈے اور خشک پھلوں میں پایا جاتا ہے۔

Doctor's T.M.

Unpasteurized, Unfiltered & Living

Natural

APPLE CIDER VINEGAR

With the Mother

روز بڈ شیمپو

DOCTOR'S ROSEBUD CREAM

اپیل سائیڈر وینیگر، بادام ناریل اور گلاب سے بنا منفرد شیمپو
بال گرنے بند، خشکی سکری ختم، بال لمبے گھنے
اور مضبوط، سر کی جوؤں کا خاتمہ

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

چالیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں میڈیکل کا طالب علم ہوں۔ ۱۹۸۲ء میں علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی اور جلد ہی جنرل پریکٹیشنر اختیار کر لی۔ اس دوران طب نبوی ﷺ اور قدرتی علاج سے بھی دلچسپی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر انسان توازن اور قدرت کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اعتدال کے ساتھ خوراک استعمال کرے اور مناسب ورزش کرتا رہے تو وہ صحت مند اور پُرسکون زندگی گزار سکتا ہے۔

تقریباً دس سال پہلے صحت تندرستی کے آسان حل کی تلاش میں نظر طب نبوی ﷺ کی روشنی میں اپیل سائیڈر وینیگر پر ٹھہری اور اس خطے میں پہلی بار ڈاکٹر اپیل سائیڈر وینیگر متعارف کروایا۔ عام سرکے اور اپیل سائیڈر وینیگر کا فرق یہ ہے کہ اپیل سائیڈر وینیگر Unpasturized, unfiltered, living and with the mother ہوتا ہے، جس وجہ سے یہ قدرتی اور بہت متحرک ہوتا ہے۔ اس لیے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ شوگر، کولیسٹرول جیسی مہلک بیماریوں کے کنٹرول میں معاون ہے۔ وزن کم کرتا ہے، فالتو چربی ختم کر کے سمارٹ بناتا ہے، جگر اور پیٹ کے بہت سارے امراض کا حل ہے۔ ان افراد کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری اس کوشش کی پزیرائی کی۔ اس وقت یہ پاکستان کے بہت سارے شہروں میں استعمال ہو رہا ہے اور لوگ مثبت رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

دوران پریکٹس بچیوں، بچوں بلکہ ہر عمر میں جب بالوں کے مختلف مسائل دیکھے تو اپیل سائیڈر وینیگر استعمال کروایا۔ اس سے بہت فائدہ ہوا تو ایک ایسا شیمپو بنانے کی تحریک پیدا ہوئی جس میں اپیل سائیڈر وینیگر کے ساتھ ایسے قدرتی اجزاء استعمال کیے جائیں جو قدرتی کنڈیشنرز کی خصوصیات کے حامل ہوں اور اس سے بالوں کے ہر طرح کے مسائل بھی حل ہو سکیں۔

اسی طرح جو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مختلف کریمیں استعمال کرتے ہیں انہیں فوری فائدہ تو ہو جاتا ہے لیکن بعد میں مضر اثرات کیمیکل کی وجہ سے چہرے خراب ہوتے ہوئے ہی دیکھے۔ خواہش تھی کہ ایک ایسی کریم ہو جو فائدہ تو دے لیکن مابعد اثرات سے بچائے۔ انہی خواہشوں کی تکمیل کے لیے میں نے بالوں کے لیے Doctor Rosebud Shampoo اور جلد کے لیے Doctors Rosebud Cream تیار کی ہے۔

ڈاکٹر روز بڈ شیمپو کے اجزائے ترکیبی

اس شیمپو میں جو اجزاء استعمال کیے گئے ہیں وہ ہزاروں برس سے استعمال ہو رہے ہیں اور آج بھی اپنے فوائد کی وجہ سے پسند کیے جا رہے ہیں۔

اپیل سائیڈر وینیگر

شیمپو میں پانی کے بجائے اپیل سائیڈر وینیگر ڈالا جاتا ہے جس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:

☆ سر کی جلد اور بالوں کی قدرتی تیزابیت قائم کر کے جراثیم سے بچاتا اور خشکی ختم کرتا ہے۔ ☆ سر کی جلد پر موجود مردہ خلیے اور گرد و غبار کی تہ توڑ کر اس کی صفائی کرتا ہے۔ شیمپو تین منٹ تک لگائے رکھیں۔ ☆ الجھنے ختم کرتا ہے۔ بالوں کو نرم کرتا ہے اور آسانی سے ہیئر اسٹائلنگ کر سکتے ہیں۔ ☆ بالوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ ☆ بالوں کو گرنے سے روکتا ہے۔ نئے بال اُگتے ہیں۔ ☆ بالوں کو دومنہ اور ٹوٹنے سے بچاتا ہے۔ ☆ موجود

نمکیات اور وٹامنز بالوں کی نشوونما کرتے ہیں۔

عرق گلاب

شیمپو میں شامل عرق گلاب صدیوں سے اپنی ان بہترین خصوصیات کی وجہ سے انسان کے زیر تصرف ہے:

☆ بہترین اینٹی بیکٹیریل، اینٹی فنگل، اینٹی وائرس، اینٹی انفلیمٹری اور اینٹی سیپٹک ہے۔ ☆ وٹامن اور فلونائیڈ سر کی جلد اور بالوں کی نشوونما کرتے ہیں۔ ☆ بال نرم، ملائم اور چمکدار ہوتے ہیں۔ ☆ بال گرنے بند اور نئے بال اگتے ہیں۔

بادام روغن

☆ بادام روغن میں شامل امیگا ۳، چکنائی کے تیزاب، میگنیشیم اور وٹامن ڈی بالوں کے لیے بہترین قدرتی کنڈیشنر ہے۔ ☆ بالوں کی تہ میں جذب ہو کر بال موٹے، چمکدار، مضبوط اور لمبے بناتا ہے۔ ☆ بال گرنے رک جاتے ہیں اور نئے بال اُگتے ہیں۔

ناریل کا تیل

☆ بالوں کی جڑوں میں موجود فالتو سیبم ختم کرتا ہے ☆ فیٹی ایسڈ اور وٹامنز بالوں کو مضبوط، توانا اور لمبے کرتے ہیں۔ ☆ خشکی سکری ختم کرتا ہے۔ ☆ بال چمکدار، نرم اور لچکدار بناتا ہے۔ ☆ سر کی جوؤں کو ختم کرتا ہے۔ ☆ بادام روغن اور ناریل کا تیل بہترین قدرتی کنڈیشنرز ہیں۔ اس لیے شیمپو میں کوئی مصنوعی نقصان دہ کنڈیشنرز شامل نہیں ہے۔

سکاکائی

☆ سکاکائی میں شامل وٹامنز اور اینٹی آکسیڈنٹ جلد اور بالوں کو خوراک دیتے اور ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ☆ بالوں کو سفید ہونے سے بچاتے ہیں۔ ☆ سکری خشکی ختم ہوتی ہے۔ ☆ سر کی جوؤں کو ختم کرنے کا بہترین قدرتی علاج ہے۔

مندرجہ بالا خالص قدرتی اجزاء روز بڈ شیمپو کو ایک بہترین شیمپو بناتے ہیں۔ آپ اس کو دنیا کے سپر شیمپو میں شامل کر سکتے ہیں۔ یہ ہر عمر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بچوں اور بڑی عمر میں زیادہ بہتر ہے۔ قدرتی اجزاء کی موجودگی کی وجہ سے روزانہ استعمال کر سکتے ہیں۔ پہلے واش میں بال وٹامنز اور نمکیات کے سبب سخت اور بھاری محسوس ہوتے ہیں جو چند گھنٹوں میں نرم ملائم اور سلکی ہو جاتے ہیں۔ اسے باڈی شیمپو کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے جسم کی خشکی ختم ہوتی ہے اور جلد نرم اور ملائم ہو جاتی ہے۔ جلد کی خارش کی کئی اقسام کا علاج ہے۔ پاؤں کی انگلیوں میں موجود فنگس ختم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹرز روز بڈ کریم

مندرجہ ذیل علامات میں مفید ہے:

☆ ایکنی، وائیٹ ہیڈ، بلیک ہیڈ، کیل اور مہاسے۔ نوٹ: ایکنی کے مریضوں کو مسالہ جات، چکنائی اور گرم اشیاء سے ضرور پرہیز کرنا چاہیے۔ زیادہ کیل اور مہاسوں کے لیے بعض اوقات معالج کے مشورے سے کھانے والی دوائی استعمال کرنی چاہیے۔ ☆ داغ، دھبے، چھائیاں، جھریاں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دور کر کے چہرے کی قدرتی خوبصورتی اور دلکشی بحال کرتی ہے اور چہرہ جاذب نظر آتا ہے۔ دو مٹر کے دانوں کے برابر کریم اچھی طرح چہرے پر جذب کریں۔ نوٹ: قدرتی اجزاء کی وجہ سے چند دن لگ سکتے ہیں۔ ☆ شوگر کے مریض کے پاؤں کا اکڑاؤ، جلن، درد کی لہریں ختم کرتی ہے اور بے جان پاؤں کو جو رات کو سونے نہیں دیتے" فوری آرام اور سکون پہنچاتی ہے اور مریض سکون سے سوتا ہے۔ (شوگر کے مریضوں کو شوگر اور کولیسٹرول کنٹرول میں رکھنا چاہیے) دن میں دوبار پاؤں پر تین یا چار مٹر کے دانوں کے برابر کریم اچھی طرح جذب کریں۔ ☆ Postherpetic Neuralgia کے درد کو بھی جو جسم پر کپڑا بھی لگنے نہیں دیتا، یہ کریم آرام وسکون دیتی ہے۔ جسم کے متاثرہ حصہ پر دن میں دو تین مٹر کے دانوں کے برابر کریم اچھی طرح جذب کریں۔ ☆ کریم استعمال کرنے سے پہلے جسم پانی اور اچھے صابن سے دھو لیں۔ ☆ قدرتی اجزاء کی وجہ سے کریم روزانہ صبح و شام استعمال کی جا سکتی ہے۔

برائے رابطہ: ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

Doctor health and beauty clinic
Doctor Rosebud Shampoo
www.doctorsons.org
0321-8823321 03364167960

حافظ مبشر علی
0321-9785644

پاکستان بھر سے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں

(اشتہار)

ٹی وی چینل عام آدمی کی نظر میں

سعد فاروقی

عشرے ڈیڑھ عشرے کی بات ہے جب سے کیبل اور اس سے نشر ہونے والے نجی ٹی وی چینلوں کی یلغار ہوئی ہے ورنہ پہلے تو اکلوتے لاڈلے پی ٹی وی کی حکمرانی تھی۔ اس کا معروف نو بجے کا خبر نامہ دراصل وزیر نامہ ہوتا تھا جس میں راوی ملک کے طول و عرض میں چین ہی چین لکھتا۔ یوں لگتا کہ ہر طرف دودھ اور شہد کی نہریں بہ رہی ہیں۔ اشیائے خورونوش بالکل مفت یا نہایت ہی ارزاں قیمتوں پر وافر مقدار میں ملنے کا تاثر دیا جاتا۔ وزیر نامے میں حزب اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔ قائد حزب اختلاف کی جھلک ٹی وی پر دیکھنے کو نظر ترستی۔ پردۂ اسکرین پر ہمہ وقت صدر اور وزیر اعظم براجمان نظر آتے۔

آٹھ اور نو کے درمیان نشر ہونے والے ڈرامے بہت مقبول تھے۔ کئی ڈراموں نے عالمگیر شہرت بھی حاصل کی۔ صبح کی مختصر نشریات بھی شوق سے دیکھی جاتیں۔ جنرل پرویز مشرف اگرچہ آمر سہی لیکن انھوں نے نجی ٹی وی چینلز کی حوصلہ افزائی کی۔ اب آپ ٹی وی چلائیں تو گوناگوں چینلز نظر آئیں گے۔

دو درجن سے زیادہ چینل خبروں، افواہوں، حکمرانوں اور حُبِ حکمرانی سے سرشار سیاست دانوں کے درمیان کج بحثی کے لیے مخصوص ہیں۔ کسی چینل کا دل موجودہ حکومت کے لیے دھڑکتا ہے۔ کسی کا جی آئندہ آنے والی حکومت کے لیے للچاتا ہے۔ کوئی جدت پسند ہے تو کوئی قدامت پسند۔ ہر چینل پر کچھ مخصوص میزبانوں اور ان کے حامی تجزیہ نگاروں کا غلبہ ہے جو اپنی جانبدار رائے کو حتمی گردانتے ہیں۔

چند چینل تفریحی کہلاتے ہیں جو زیادہ تر ڈراموں اور موسیقی کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ہمیں بالائی طبقے کی چھاپ نظر آتی ہے، اس طبقے کی جو چھری کانٹے سے مکھن توس اور برگر پیزا کھاتا ہے۔ درآمد شدہ گاڑیوں میں گھومتا اور پُرآسائش بنگلوں میں رہائش پزیر ہے۔ ان لوگوں کا واحد مسئلہ غیر ازدواجی تعلقات ہیں اور یہی مسئلہ اکثر ڈراموں کی زینت بنتا ہے۔ شومئی قسمت کہ غربا اور متوسط طبقے کو ڈراموں میں بھی جگہ نہیں ملتی۔ ان چینلوں کی صبح والی نشریات دیکھنا کسی ذہنی اذیت سے کم نہیں۔ میزبان ایسی ایسی شخصیات کو مدعو کرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ موسیقی کے چینلز پر بدیسی گلوکاروں اور رقاصاؤں کا غلبہ ہے، بے سرے گلوکار اور بے ہنگم رقاص۔

چند چینلز جلد موت کا سامان باٹتے نظر آتے ہیں۔ میرا اشارہ تراکیبِ طعام بتانے والے چینلز کی طرف ہے کہ بسیار خوری بھی مہلک بیماریوں کا موجب بن چکی۔ ان چینلز کے طباخ یا تو لحیم شحیم مرد ہوتے ہیں یا عمر رسیدہ خواتین۔ ایک دفعہ ایک چینل پر ایسے طویل الجثہ طباخ نظر آئے جن کا شکم دیگ، چہرہ تھال اور بازو کفگیر کی طرح کے تھے۔ ٹانگیں اس لیے نظر نہ آسکیں کیونکہ وہ چبوترے کے پیچھے تھے۔

علاقائی زبانوں کے چینل ابھی ترقی پزیر ہیں اور اوسط درجے کے حامل۔ کھیلوں کے چینل زیادہ تر قومی بخار یعنی کرکٹ اور مقامی کشتیوں کے مقابلے نشر کرتے ہیں۔ کرکٹ کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن مقامی کشتیوں کا ملاحظہ کرنا سوہانِ روح کے مترادف ہے۔ جانوروں کے چینل اگرچہ کم ہیں لیکن اکثر اوقات انسانوں کے چینلوں سے زیادہ بھلے محسوس ہوتے ہیں۔

ٹھیلا لگانے سے صدر بننے تک

کم سنی میں یتیم ہوجانے والی ایک غریب مسلمان خاتون کی ناقابل فراموش داستانِ جہد

محنت، جذبۂ ہمدردی اور انسان دوستی نے انھیں ایک غیر مسلم معاشرے میں ہر دلعزیز اور محترم شخصیت بنادیا

سید عاصم محمود

"لڑکی! تم کامیاب ہوگئی۔ گو زندگی میں تمھیں کئی مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ کئی رکاوٹیں عبور کرنا پڑیں مگر تم نے دلیری سے ساری تکالیف جھیل لیں۔ آج تم اپنی منزل پر پہنچ چکیں۔ بہت خوب، شاباش۔"

تریسٹھ سالہ حلیمہ یعقوب کا کہنا ہے کہ اگر میرا دس سالہ

والدہ کے ساتھ محبت اور اپنائیت کا انمول لمحہ

وجود آج میرے سامنے آجائے، تو میں درج بالا جملوں سے اس کا استقبال کروں گی۔ حلیمہ صاحبہ معمولی ہستی نہیں، ان کو دنیا کی ایک ترقی یافتہ مملکت، سنگاپور میں پہلی خاتون صدر بننے کا اعزاز حاصل ہو چکا۔

قابل ذکر بات یہ کہ حلیمہ یعقوب سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوئیں اور نہ ہی وہ کسی بااثر سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی داستان حیات درحقیقت انھیں ایک غیر معمولی انسان ثابت کرتی ہے۔ ایک ایسی بہادر خاتون اور انتشار کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ ایسے میں یہ امید افزا اور خوش گوار خبر ملی کہ ایک باحجاب خاتون سنگاپور جیسے غیر مسلم ملک کی صدر بن گئی ہیں۔ حلیمہ یعقوب کی داستان آشکارا کرتی ہے کہ انسان چاہے تو مسلسل محنت، ایمان داری اور خلوص نیت سے محیر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

دنیا میں آمد

حلیمہ یعقوب ۲۳/اگست ۱۹۵۴ء کو سنگاپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد، یعقوب عبداللہ کا تعلق ہندوستانی

جو بھی مرد وزن کے لیے "رول ماڈل" بن چکیں۔

عالم اسلام سے خوش کن خبریں کم ہی ملتی ہیں۔ اغیار کی سازشوں اور اپنوں کی نااہلی کے باعث اسلامی دنیا خانہ جنگی

ریاست، تامل ناڈو سے تھا۔ جب انگریزوں کو سنگاپور میں افرادی قوت کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انھوں نے ہندوستان سے کئی ہندو اور مسلمان کارکن بلوائے تھے۔ انھی میں یعقوب عبداللہ بھی شامل تھے۔

وہ سنگاپور پہنچ کر مختلف ملازمتیں کرتے رہے۔ آخر انھیں ایک سرکاری ادارے میں بطور چوکیدار ملازمت مل گئی۔ یوں انھیں رہائش کے لیے سرکاری کوارٹر مل گیا۔ اس طرح وہ کرایہ مکان کے بھاری خرچ سے نجات پا گئے۔

زندگی کچھ پُرسکون ہوئی، تو انھوں نے ملایا نسل کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ اس بندھن سے پانچ بچے تولد ہوئے۔ حلیمہ سب سے بڑی اولاد تھیں۔ زندگی لشتم پشتم بسر ہو رہی تھی کیونکہ عبداللہ یعقوب کی تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ گھریلو اخراجات جیسے تیسے پورے کر لیے جاتے۔

سماجی خدمت میں پیش پیش ہونا تو ہمارا شعار ہے

۱۹۶۲ء میں اچانک یہ گھرانا مصائب میں گھر گیا جب عبداللہ اچانک چل بسے۔ تب حلیمہ کی عمر صرف آٹھ برس تھی۔ چھوٹی عمر ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے، تو یہ سانحہ عظیم ہوتا ہے۔ اس کے بعد عموماً بچوں کا کوئی والی وارث نہیں رہتا اور مناسب راہنمائی نہ ملنے سے وہ جرائم کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے حلیمہ کی والدہ، میمونہ عبداللہ ایک بہادر خاتون تھیں۔ انھیں اپنے بچوں سے بھی بہت محبت تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود محنت مشقت کر کے بچوں کو پالیں گی اور انھیں بڑا انسان بنائیں گی۔

مصائب کا ہمت سے مقابلہ

لیکن بیوہ میمونہ کو ابتدا ہی میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی افتاد تو یہ آن پڑی کہ حکومت نے انھیں بچوں سمیت

HOME APPLIANCES

سرکاری کوارٹر سے نکال باہر کیا۔ وہ مجبوراً بچوں کو لیے اپنی رشتے کی ایک بہن کے پاس چلی گئیں۔

اس بہن کے اپنے بچے اور اخراجات تھے۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا مگر میمونہ عبداللہ کو خود ہی محسوس ہو گیا کہ وہ

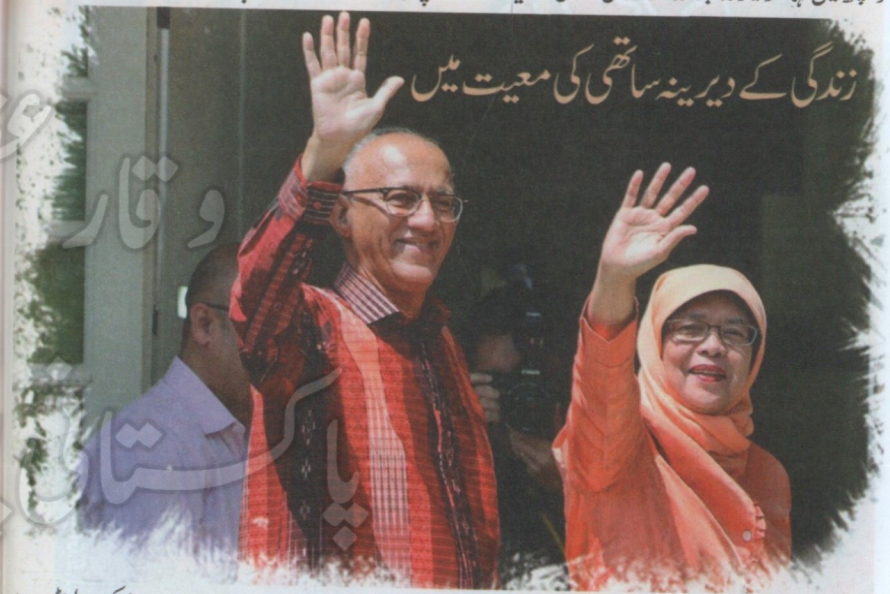

اپنی بہن پر بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ دال چاول فروخت کرنے کا ٹھیلا لگا لیتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اور بچوں کے اخراجات تو برداشت کر سکتی تھیں۔

میمونہ عبداللہ نے بہن سے رقم ادھار لی اور چاول، دال، سبزیاں، مسالے وغیرہ خرید کر لائیں، کھانا پکایا اور کرایے کا ایک ٹھیلا لے کر اپنا مال فروخت کرنے لگیں۔ یوں ان کی عملی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ خوددار میمونہ نے کسی پر بوجھ بننا گوارا نہیں کیا اور تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے سبھی بچوں کو لکھا پڑھا کر معاشرے میں انھیں اعلیٰ مقام دلوائیں گی۔

چند دن بعد اس جگہ ایک سپاہی آ نکلا جہاں میمونہ ٹھیلا لگاتی تھیں۔ اس نے ان سے پوچھا ''کیا آپ کے پاس ٹھیلا لگانے کا لائسنس ہے؟'' میمونہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ انھیں تو ابھی پتا چلا تھا کہ ٹھیلا لگانے کے لیے لائسنس درکار ہوتا ہے۔ سپاہی سارا سامان ضبط کرنا چاہتا تھا مگر جب اُسے پتا چلا کہ یہ ایک بیوہ ہے جو اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر ٹھیلا لگاتی ہے، تو اسے رحم آ گیا۔ ہمدرد سپاہی نے پھر بلدیہ سے لائسنس حاصل کرنے میں میمونہ کی مدد بھی کی۔ ہر معاشرے میں پائے جانے والے ایسے ہی رحم دل لوگ انسانیت کا بھرم رکھتے ہیں۔

اسکول سے نکال دوں گی

میمونہ صبح سویرے اٹھتیں، مارکیٹ سے سودا لاتیں اور پھر غذا پکانے لگتیں۔ جلد ہی حلیمہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ وہ چاول، دال، سبزیاں وغیرہ دھوتی، ٹھیلے کی صفائی کرتی اور کھانا پکانے میں میمونہ کے ساتھ ہوتی۔ وہ گاہکوں کو کھانا پکڑاتی اور گندی پلیٹیں دھوتی۔

لیکن ماں کی تو دیرینہ تمنا یہ تھی کہ حلیمہ اور اس کے سبھی بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں چنانچہ میمونہ نے حلیمہ کو قریبی اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہاں بھی اساتذہ اور بیشتر طالب علم چینی تھے۔ اس طرح حلیمہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے لیے اسکول جانے لگیں۔

حلیمہ تمام بچوں میں سب سے زیادہ سمجھ دار تھیں۔ چھوٹی ہونے کے باوجود انھیں احساس تھا کہ ماں پر ذمے داریوں کا بوجھ ہے۔ اسی لیے انھوں نے صبح سویرے اٹھ کر ماں کی مدد کرنے کا فریضہ جاری رکھا۔ بعض اوقات انھیں اسکول جاتے ہوئے دیر بھی ہو جاتی۔ پھر جب کبھی میمونہ کی طبیعت خراب ہوتی، تو وہ بیٹی کو چھٹی کروا کر اُسے ساتھ لے جاتیں۔

ایک مہینے خاصے دن حلیمہ اسکول نہ جا سکیں کہ ماں کو ایک موذی بیماری چمٹ گئی۔ مہینے کے آخر میں اسکول پرنسپل نے حلیمہ کو اپنے دفتر بلایا اور بتایا ''لڑکی اگر تم باقاعدگی سے اسکول نہ آئیں، تو میں تمھیں نکال دوں گی۔'' یہ سن کر حلیمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ اسکول پرنسپل کو کیسے بتاتی کہ اس کی زندگی بہت سخت اور پُرمشقت ہے۔

تبھی حلیمہ نے خود کو جھڑکا کہ خودترسی کا نشانہ نہ بنو، ہمت پکڑو اور مشکلات کا مقابلہ دلیری سے کرو۔ اس حوصلہ افزائی سے حلیمہ کا جذبہ زندگی پھر جوان ہو گیا۔ وہ بتاتی ہیں ''یہی مقولہ میری زندگی کا شعار (موٹو) بن گیا۔ جب بھی میں کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہوتی، تو اپنے آپ سے یہی کہتی کہ ہمت نہ ہارو اور کٹھن وقت کا مقابلہ پوری توانائی سے کرو۔

مزدوروں کی ہمدرد

نوجوان ہوتی حلیمہ کے لیے ماں بھی رول ماڈل بن گئی جس نے اپنے بچوں کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا بلکہ محنت مشقت کر کے انھیں پالنے لگی۔ حلیمہ نے پڑھائی اور کام ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ انھیں خود بھی احساس تھا کہ تعلیم ہی ایسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنے حالات میں خوشگوار اور انقلابی تبدیلیاں لا سکتی ہیں چنانچہ کئی مشکلات سہہ کر انھوں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا اور ۱۹۷۸ء میں آخرکار سنگاپور یونیورسٹی سے ایل ایل بی کر کے وکیل بن گئیں۔

حلیمہ اپنے خاندان میں یونیورسٹی جانے والی پہلی لڑکی تھیں۔ اس لیے جب وہ وکیل بنیں، تو ماں کو قدرتاً بہت خوشی ہوئی۔ حلیمہ نے یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے بھی ماں کے پاس کام کرنا جاری رکھا جو اب اپنا کاروبار ایک دکان میں منتقل کر چکی تھیں۔ ماں کی مالی مدد کے سہارے ہی ان کے لیے ممکن ہوا کہ وہ یونیورسٹی کی بھاری فیس ادا کر سکیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حلیمہ کو دو ملازمتوں کی پیش کش ہوئی: ایک سرکاری ملازمت تھی اور دوسری نجی۔ سنگاپور میں مزدوروں کی اکلوتی تنظیم، نیشنل ٹریڈ یونین کانگریس کو قانونی معاملات کے سلسلے میں ایک مددگار وکیل کی ضرورت تھی۔ حلیمہ سمجھتی تھی کہ سرکاری ملازمت لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے جبکہ ٹریڈ یونین کی ملازمت ایک مہم جویانہ اور چیلنجنگ کام تھا۔ اسی لیے انھوں نے آخرالذکر ملازمت قبول کر لی۔

حلیمہ یاد کرتے ہوئے بتاتی ہیں: ''ٹریڈ یونین کے دفتر میں سگریٹیں پھونکتے بیس مردوں نے میرا انٹرویو لیا۔ اکثر مرد میری کم عمری دیکھتے ہوئے مجھے مسترد کر دینا چاہتے تھے۔ تاہم ان کے لیڈروں کو میں بھا گئی لہٰذا مجھے ٹریڈ یونین کے وکیل کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ یونین کا جنرل سیکرٹری ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ ہمدرد آدمی تھا۔ اس نے مجھے نصیحت کی ''بیٹا! تم یہاں اپنی علمی قابلیت بگھارتی پھرنا اور نہ اپنی ڈگریاں دکھا کر دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا۔ تمھاری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دوسرے تمھارے قانونی دلائل سے متاثر ہو جائیں۔ یوں تم آدھی جنگ پہلے ہی جیت لو گی۔''

اس طرح حلیمہ ٹریڈ یونین کے ساتھ کام کرنے لگیں۔ اس حیثیت سے انھیں عام مزدوروں سے لے کر بڑے

صنعت کاروں اور کاروباریوں کی طرز زندگی دیکھنے کا موقع ملا۔ انھیں علم ہوا کہ عام لوگ کس قسم کے مسائل اور مشکلات کا شکار ہیں چنانچہ وہ حکومت اور بڑے کارخانہ داروں سے گفت وشنید کر کے یہ مسائل حل کرنے کی کوششیں کرنے لگیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ملازمت کے ساتھ ساتھ حلیمہ نے تعلیم کا

پڑوسیوں کی ہمراہی میں جن کے اسلام میں بہت حقوق ہیں

سلسلہ بھی جاری رکھا اور ۲۰۰۱ء میں ایم ایل اے (ماسٹر آف لاز) کر لیا۔

جب حلیمہ اپنے نئے ماحول سے ہم آہنگ ہو گئیں، تو ۱۹۸۰ء ہی میں انھوں نے محمد عبداللہ سے شادی کر لی۔ محمد عبداللہ یونیورسٹی میں حلیمہ کے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ مزاج میں ہم آہنگی انھیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی اور وہ پھر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ان کے ہاں پانچ بچے تولد ہوئے۔

سیاست میں داخلہ

زندگی کا سفر جاری رہا۔ حلیمہ معاشرے کے پسے طبقات کے مقدمے لڑتیں اور انھیں ان کا حق دلواتی رہیں۔ انھوں نے خواتین کے حقوق کی خاطر بھی بہت کام کیا۔ اپنی سماجی سرگرمیوں کے باعث حلیمہ سنگاپور کے کثیر نسلی معاشرے میں جانی پہچانی شخصیت بن گئیں۔ وہ رنگ، نسل اور مذہب سے بے پروا ہو کر دکھی انسانیت کی خدمت کرتی تھیں۔

انسانیت کی مددگار بن جانے پر اللہ تعالیٰ بھی حلیمہ پر مہربان ہو گیا۔ ٹریڈ یونین میں ان کو وقتاً فوقتاً ترقی ملنے لگی اور تنخواہ بھی بڑھ جاتی۔ شوہر بھی اچھے مشاہرے پر ملازمت کرنے لگے۔ اس طرح حلیمہ کی زندگی سے مالی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا اور زندگی پرسکون اور سہل انداز میں بسر ہونے لگی۔ اب وہ اس قابل ہو گئیں کہ بہن بھائیوں کی مالی مدد کر سکیں۔

۲۰۰۱ء تک حلیمہ ٹریڈز یونین میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل کے عہدے تک پہنچ چکی تھیں۔ انہی دنوں وزیراعظم سنگاپور، گوچوک ٹونگ نے حلیمہ کو چائے کی دعوت دے ڈالی۔ وہ چاہتے تھے کہ معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لانے والی یہ متحرک و سرگرم خاتون حکمران سیاسی جماعت، پیپلز ایکشن پارٹی میں شامل ہو جائیں۔

پیپلز ایکشن پارٹی ۱۹۵۹ء سے سنگاپور میں حکومت کر رہی ہے۔ ماضی میں پارٹی کے قائدین نے دو بار حلیمہ سے رابطہ کیا تھا تاکہ وہ اس کا حصہ بن سکیں لیکن انھوں نے دونوں بار انکار کر دیا۔ دراصل حلیمہ سمجھتی تھیں کہ سیاست میں حصہ لینے کے بعد وہ سماجی سرگرمیاں انجام نہیں دے سکیں گی۔

تاہم وزیراعظم گوچوک نے اس استدلال سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے حلیمہ کو بتایا کہ اسمبلی کا رکن بن کر وہ زیادہ

بااختیار اور باوسائل ہو جائیں گی۔ تب وہ بے یارومددگار شہریوں کی زیادہ بہتر انداز میں مدد کر سکیں گی۔ حلیمہ کو یہ دلیل پسند آئی چنانچہ انھوں نے پیپلز ایکشن پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔

نومبر ۲۰۰۱ء میں جب اسمبلی الیکشن ہوئے، تو پارٹی نے حلیمہ کو بھی ٹکٹ دیا۔ کامیابی نے ان کے قدم چومے اور یوں وہ اپنے ملک کی قومی اسمبلی میں پہنچ گئیں۔ حلیمہ بتاتی ہیں:

''جب میں پرائمری اسکول میں زیرتعلیم تھی، تو کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھا کرتی۔ وجہ یہ ہے کہ میں صبح پانچ بجے اٹھ کر کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ اسی لیے اکثر مجھے جماعت میں نیند آجاتی۔ تبھی میں پیچھے بیٹھا کرتی تاکہ استانی کی جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ تب میں جاگتے ہوئے بھی یہ خواب دیکھا کرتی کہ میں ایک بڑی عورت بن گئی ہوں اور لوگ میرے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ رکن اسمبلی بن کر مجھے یہی لگا کہ میرے خواب نے عملی جامہ پہن لیا۔''

سماجی خدمت کا ذریعہ

۲۰۰۱ء تک حلیمہ کے گھر خوشحالی بھی آچکی تھی۔ ورنہ جب وہ ۱۹۸۲ء میں شوہر کے ساتھ کرایے کے فلیٹ میں گئی تھیں، تو ان کے پاس صوفہ تک نہیں تھا۔ نوبیاہتا جوڑے نے آٹھ ماہ تک رقم جمع کی پھر صوفہ خریدا جا سکا۔

۲۰۰۰ء تک جوڑے کے ہاں پانچ بچے تولد ہو چکے تھے۔ اب تین کمروں کا فلیٹ چھوٹا پڑ گیا۔ اتفاق سے اسی سال پڑوس کا فلیٹ فروخت ہو رہا تھا۔ حلیمہ اور عبداللہ نے اپنی جمع پونجی ملا کر وہ فلیٹ خرید لیا۔ انھوں نے پھر درمیان کی دیوار توڑ دی۔ اس طرح چھ کمروں پر مشتمل فلیٹ خاندان کی ضروریات بخوبی پوری کرنے لگا۔

حلیمہ نے رکن اسمبلی بن کر بھی ٹریڈ یونین کی ملازمت برقرار رکھی۔ وزیراعظم سنگاپور کا خیال درست نکلا اور وہ زیادہ بااختیار انداز میں دکھی انسانیت کی خدمت کرنے لگیں۔ انھوں نے ترقی پزیر ممالک کے اکثر لیڈروں کی طرح سیاست کو دولت مند ہونے کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ وہ اسے سماجی فلاح و بہبود انجام دینے کا وسیلہ سمجھتی ہیں۔

سماجی سرگرمیوں میں سرگرم کردار ادا کرنے کے باعث پیپلز ایکشن پارٹی میں حلیمہ کے قد کاٹھ میں اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ۲۰۱۱ء میں انھیں وزیر بنا دیا گیا۔ وزیر بن کر انھوں نے ٹریڈ یونین کو خیرباد کہہ دیا۔ اس لمحے حلیمہ کے اور ان کے سبھی ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ظاہر ہے، اکتیس سال ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے بعد جدائی کا لمحہ آئے، تو انسان اداس ہو جاتا ہے۔

۲۰۱۳ء میں حلیمہ یعقوب کی زندگی کا ایک اور سنگ میل آیا جب انھیں سنگاپور کی اسمبلی میں پہلی خاتون اسپیکر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یوں کامیابیوں کے تاج میں ایک اور کلغی کا اضافہ ہو گیا۔ حلیمہ نے بحیثیت اسپیکر بھی اپنی ذمے داریاں بخوبی انجام دیں اور نہایت تدبر و دانش مندی سے اسمبلی کے معاملات چلائے۔ حتیٰ کہ حزب اختلاف بھی حلیمہ کی تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہو گئی۔

والدہ کی وفات

سنگاپور کی تاریخ کے سترہویں عام انتخابات ۱۱ ستمبر ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوئے۔ حلیمہ اپنے حلقے میں سرگرمی سے انتخابی مہم چلا رہی تھیں۔ اچانک انھیں اطلاع ملی کہ ان کی جان سے زیادہ پیاری والدہ وفات پا گئی ہیں۔ میمونہ عبداللہ نے ۹۰ سال عمر پائی۔

حلیمہ صاحبہ کو قدرتاً سخت صدمہ پہنچا مگر انھوں نے خندہ پیشانی سے اُسے برداشت کیا۔ انھوں نے صحافیوں کو بتایا ''یہ میری زندگی کا اداس ترین دن ہے۔ بنیادی طور پر یہ والدہ ہی ہیں جن کی مساعی سے آج میں اس بلند مقام پر پہنچی۔ وہ نہایت دلیر خاتون تھیں۔ جوانی میں شوہر کی وفات کے بعد اُن پر مصائب نے یلغار کر دی مگر انھوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔

وہ ہمیشہ دوسروں کا بھلا چاہتیں اور مصیبت زدوں کی دامے درمے سخنے مدد کرتی تھیں۔ خاص بات یہ کہ انھوں نے کبھی زندگی کے مصائب کا رونا نہیں رویا اور شکایتیں نہیں کیں۔ وہ آخری سانس تک اللہ تعالیٰ کی شکر گزار انسان اور ہر حال میں اپنے رب کا شکر ادا کرتی رہیں۔''

اللہ تعالیٰ جسے چاہے عزت دے

اگست ۲۰۱۷ء میں سنگاپور کے صدر' ٹونی تان کا عرصہ اقتدار ختم ہو جانا تھا۔ تبھی حکمران جماعت نے فیصلہ کیا کہ اگلے صدارتی انتخابات میں حلیمہ یعقوب کو بطور امیدوار کھڑا کیا جائے لیکن پہلے حلیمہ سے منظوری لینا ضروری تھا۔

صدر سنگاپور مملکت کا سربراہ ہوتا ہے۔ یہ بظاہر رسمی عہدہ ہے مگر صدر حکومت اور پارلیمنٹ کے بعض احکامات رد بھی کر سکتا ہے۔ بالعموم صدر حکومت اور پارلیمنٹ کی تجاویز پر صاد کرتا ہے۔ کم ہی پاکستانیوں کو علم ہے کہ غیر مسلم مملکت ہونے کے باوجود سنگاپور کے پہلے صدر ایک مسلمان راہنما' یوسف اسحاق تھے۔

۱۹۹۳ء سے قبل صدر کا انتخاب پارلیمنٹ کرتی تھی۔ اس کے بعد الیکشن کے ذریعے اہل سنگاپور اپنا صدر منتخب کرنے لگے۔ ۲۰۱۶ء میں بسلسلہ صدارتی انتخاب مزید ترمیم کی گئی۔ وہ یہ کہ اگر سنگاپور کے کسی نسلی گروہ کا نمائندہ پچھلے پانچ صدارتی انتخابات میں صدر نہیں بنا' تو اس کا کوئی نمائندہ خود بخود دنیا صدر بن جائے گا۔ یہ ترمیم اس لیے کی گئی تاکہ کسی نسلی گروہ کی حق تلفی نہ ہو اور سبھی گروہوں کو حکومت کرنے کا موقع مل سکے۔

سنگاپور میں تین بڑے گروہ آباد ہیں..... چینی (آبادی کا کل ۷۴ء۳ فی صد)' ملایا (۱۳ء۴ فی صد) اور ہندوستانی (۹ء۱ فی صد)۔ ہندوستانیوں میں عام طور پر سری لنکن اور پاکستانی بھی شامل ہوتے ہیں۔

۱۹۹۹ء کے صدارتی الیکشن میں ہندوستانی گروہ کا نمائندہ ایس آر ناتھن صدر بن چکا تھا لہٰذا اس بار کسی ملائی نمائندے کو یہ عہدہ سنبھالنا تھا۔ حکمران جماعت میں ایک اور ملائی مسلمان' یعقوب ابراہیم بھی اہم لیڈر ہیں۔ وہ فی الوقت وزیر اطلاعات کے فرائض انجام دے رہے ہیں مگر پارٹی لیڈروں نے یہی مناسب جانا کہ حلیمہ یعقوب کو صدارتی الیکشن میں کھڑا کیا جائے۔

جب حلیمہ صاحبہ کو علم ہوا کہ پارٹی انھیں صدارتی انتخاب لڑانا چاہتی ہے' تو انھیں خوشی' حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات نے گھیر لیا۔ خوشی اس بات پر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چوکیدار باپ اور ٹھیلا لگانے والی بے سہارا ماں کی بیٹی کو یہ بے پناہ عزت بخش دی کہ اب وہ صدر بننے جا رہی تھی۔ قرآن کریم میں رب کریم نے بجا فرمایا ہے کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ..... جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے!

حیرت اس لیے ہوئی کہ بچپن ہی سے حلیمہ کی خواہشات محدود تھیں۔ کہتی ہیں: ''میں جب پڑھ رہی تھی' تو یہی سوچتی کہ پڑھ لکھ کر ملازمت کروں گی۔ پھر تنخواہ سے اپنے اور ماں کے اخراجات پورے کروں گی۔ کسی زمانے میں امیر اور بااثر بننے کے خواب ضرور دیکھے مگر مصروف ہوئی تو شیخ چلی بننا ترک کر دیا۔'' اب عہدہ صدارت خود چل کر ان کے پاس آ پہنچا تھا۔

خوف کا باعث یہ امر تھا کہ صدر بن کر کیا وہ اپنی گوناں گوں مصروفیات کی وجہ سے اہل خانہ کو وقت دے پائیں گی؟ حلیمہ اپنے شوہر کو اپنا سب سے بڑا سہارا قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے انہی سے مشورہ کیا۔ عبداللہ نے بیگم کو یقین دلایا کہ وہ ان کی بھرپور مدد کریں گے۔

حلیمہ صاحبہ نے پھر بچوں کو بتایا کہ وہ صدارتی الیکشن لڑ رہی ہیں۔ بچوں کو خدشہ تھا کہ اگر ان کی والدہ صدر بن گئیں تو وہ عوام کی نظروں میں آ جائیں گے۔ اس طرح ان کی نجی زندگی زیادہ متاثر ہو جاتی۔ تاہم بچے بھی سمجھتے تھے کہ والدہ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ اس

لیے انھوں نے بھی والدہ کو اپنی بھرپور مدد کا یقین دلا دیا۔

ملائی پہلی باحجاب صدر

جب تمام خدشات دور ہو گئے' تو حکمران جماعت نے اعلان کر دیا کہ حلیمہ یعقوب پارٹی کی جانب سے صدارتی الیکشن میں حصہ لیں گی۔ عجیب بات یہ کہ حزب اختلاف کو اپنے ملائی لیڈروں میں سے کوئی موزوں امیدوار مل ہی نہیں سکا' چنانچہ اس نے کسی کو کھڑا نہیں کیا۔

انفرادی طور پر چار ملائی امیدوار حلیمہ صاحبہ کے مقابلے میں کھڑے ہوئے لیکن الیکشن کمیشن سنگاپور نے کسی نہ کسی اعتراض کے باعث ان کی درخواستیں مسترد کر دیں۔ دلچسپ بات یہ کہ امیدواروں میں باسٹھ سالہ فرید خان کریم خان بھی شامل تھے۔ موصوف کے والد پاکستانی تھے اور والدہ ملائی نسل کی تھیں۔ لڑکپن میں کاریں دھو کر گزارہ کیا۔ اب ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے سربراہ ہیں جس میں ساڑھے نو ہزار افراد کام کرتے ہیں۔

تمام امیدواروں کے کاغذات مسترد ہونے کی بنا پر حلیمہ یعقوب ۱۳ ستمبر کو بلا مقابلہ سنگاپور کی صدر منتخب ہو گئیں۔ الیکشن بلا مقابلہ ہونے پر سنگاپور کے بعض شہریوں نے اُسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا لیکن کسی شہری کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس بنا پر حلیمہ صاحبہ پر تنقید کر سکے۔ وجہ یہ کہ پورا سنگاپور جانتا ہے کہ وہ نہایت منکسر المزاج' سادہ' ہمدرد اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ وہ تمام پابندیوں سے بے پروا ہو کر ہر مصیبت زدہ انسان کی حتی المقدور مدد کرتی ہیں۔

صدر بن کر حلیمہ یعقوب کو عالم اسلام میں دو منفرد کارنامے انجام دینے کا عظیم اعزاز حاصل ہو گیا..... اول وہ پہلی مسلم خاتون ہیں جو ایک غیر مسلم مملکت کی صدر منتخب ہوئیں۔ دوم یہ اعزاز کہ وہ کسی بھی ملک کی پہلی باحجاب صدر ہیں۔ حجاب کو وہ اپنے لباس کا ناگزیر حصہ قرار دیتی ہیں۔ پنج وقتہ نمازی ہیں اور ہر دم اپنے رب کی شکر گزار رہتی ہیں۔

حلیمہ یعقوب کی خوبیاں کہاں تک بیان کی جائیں! وہ ہر ویک اینڈ پر غریبوں' معذوروں اور بوڑھے مرد و زن میں مفت کھانا تقسیم کرتی ہیں۔ غربا کے اسکولوں میں جا کر پڑھاتی ہیں۔ انھوں نے غریب بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے ٹیوشن سینٹر کھول رکھے ہیں۔ باقاعدگی سے اپنے پڑوسیوں سے ملتی ہیں۔ جب صدر بنیں' تو انھوں نے وی وی آئی پی پروٹوکول

باورچی خانے میں خاتون کا روایتی کام کاج کرتے ہوئے

لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے فلیٹ ہی میں مقیم رہنا چاہتی تھیں مگر جب دیکھا کہ سیکورٹی کے مسائل کی وجہ سے پڑوسیوں کو کچھ تکلیف کا سامنا ہے' تو انھوں نے مجبوراً اپنی رہائش بدل لی۔ غرض حلیمہ صاحبہ کا طرز حکمرانی خلفائے راشدین کے سنہرے اور پرعظمت دور کی یاد دلا دیتا ہے۔

صدر کی تقریب حلف برداری میں وزیراعظم سنگاپور' لی ہسین لونگ نے اپنی تقریر میں حلیمہ یعقوب کو شاندار انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا ''صدر صاحبہ کی داستان حیات جو مشکلات و مصائب سے لے کر کامیابیاں

سنگاپور ایک نظر میں

ملائیشیا کے جنوبی کنارے پر واقع سنگاپور میں پہلی انسانی آبادی ایک برطانوی مہم جو سٹیمفورڈ ریفلز نے ۱۸۱۹ء میں قائم کی تھی۔ اس کے بعد یہ ملک انگریزوں، ولندیزیوں، ملائی باشندوں، چینیوں اور جاپانیوں کے مابین رسہ کشی کا مرکز بنا رہا۔ دوسری جنگ عظیم نے خصوصاً ملک کو زبردست نقصان پہنچایا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سنگاپور نسلی تصادم کا نشانہ بن گیا۔ یہ کچھ عرصہ وفاق کے تحت ملائیشیا کا حصہ بھی رہا۔ ۹ اگست ۱۹۶۵ء کو جمہوریہ سنگاپور کا قیام عمل میں آیا۔ تب مملکت مختلف سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل میں گرفتار تھی۔ مسلم ملائی صدر یوسف اسحاق اور چینی نژاد وزیراعظم لی کیوان یو کی قیادت میں سنگاپور نے ترقی و خوشحالی کے مثالی سفر کا آغاز کیا۔

حکومت نے قانون کی بالادستی اور فراہمی انصاف کو یقینی بنایا نیز نت نئے کارخانے قائم کرنے میں نجی شعبے کو بھرپور مدد دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سنگاپور صنعت و تجارت اور خدمات (سروسز) فراہم کرنے کا بڑا ذریعہ بن گیا۔

۱۹۶۵ء میں ایک شہری کی فی کس آمدن ''پانچ سو ڈالر'' تھی۔ آج ایک شہری کی ''نوے ہزار ڈالر'' سے زائد سالانہ آمدن ہے۔

یہ انقلاب اسی لیے آیا کہ سنگاپور کے حکمران قابل، باصلاحیت اور محب وطن ثابت ہوئے۔ سنگاپور میں قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن وہ دنیا کا تیرہواں بڑا برآمد کنندہ (ایکسپورٹر) بن چکا۔ وہ ۵۰۸ ارب ڈالر سے زائد کا سامان بیرون ممالک فروخت کرتا ہے۔ پاکستان نہ صرف قدرتی وسائل سے مالا مال ہے بلکہ سنگاپور کی نسبت کہیں زیادہ رقبہ اور آبادی رکھتا ہے مگر اس کی برآمدات اکیس بائیس ارب ڈالر کے آس پاس گھوم رہی ہیں۔ ناکامی کی بڑی وجہ حکمرانوں کا نااہل اور ذاتی مفادات کا اسیر ہونا ہے۔

سنگاپور کا رقبہ صرف ۷۱۹ مربع کلومیٹر ہے۔ اس رقبے پر چھپن لاکھ سات ہزار تین سو افراد بستے ہیں چنانچہ یہ ملک دنیا کا تیسرا گنجان ترین ملک ہے۔ وہاں پر ایک مربع میل پر بیس ہزار ایک سو چورانوے انسان آباد ہیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں ہر مربع میل میں چھ سو تینتیس افراد بستے ہیں۔

مملکت میں ۳۱ء۲ فی صد آبادی بدھ مت کی پیروکار ہے۔ پھر عیسائیت (۲۰ء۱ فی صد)، دہریت (۱۸ء۵ فی صد)، اسلام (۱۴ فی صد)، تاؤ مت (۱۰ فی صد) اور ہندو مت (۵ فی صد) کا نمبر آتا ہے۔

پانے کی زبردست کہانی ہے، دراصل سنگاپور کی کتھا ہے۔ یہ ملک ہر کسی کو آگے بڑھنے کے مواقع اور امید عطا کرتا ہے۔ سنگاپور میں جو کوئی بھی محنت کرے، اُسے پھل ضرور ملتا ہے۔''

حلیمہ صاحبہ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ والدہ کی مدد کے علاوہ انھیں ترقی کرنے میں اس لیے بھی آسانی رہی کہ سنگاپور میں میرٹ کا راج ہے۔ جو ذہین، محنتی اور باصلاحیت ہو، اُسے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

حلیمہ یعقوب کی زندگی کا شعار یہ ہے: ''آپ جو بھی کام کر رہے ہیں، وہ پوری دیانت داری اور محنت سے انجام دیں۔ اس طرح آپ ملک و قوم کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔'' وہ نوجوان نسل کو پیغام دیتی ہیں:

''کامیابی پانے کا راز یہ ہے کہ آپ صرف اپنی ترقی و خوشحالی کو مدنظر نہ رکھیں..... صرف ذاتی مقاصد نظر میں نہ رکھیں بلکہ یہ بھی سوچیے کہ دوسرے کیونکر ترقی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی بھی ہر ممکن مدد کیجیے تاکہ وہ بھی کامیاب ہو سکیں۔ ایک انسان یونہی عظیم الشان کامیابیاں پا سکتا ہے۔'' ◆◆◆

بٹ کوائن کی پُراسرار دنیا

عاصم محمود

ایک عجیب و غریب ڈیجیٹل کرنسی کا قصہ جسے سرمایہ کار ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں تو وہ جرائم پیشہ لوگوں کی آنکھوں کا تارا بھی بن چکی

قیصر ایک خطرناک مجرم تھا۔ فراڈ، چوری اور ڈاکے کے جرائم میں اکثر اس کا نام سننے میں آتا۔ بعض لوگ تو اُسے قاتل بھی قرار دیتے تھے مگر گجرات شہر میں سبھی عام لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ کوئی شامت کا مارا قیصر کے خلاف پولیس سے رجوع کرتا، تو اس کے غنڈے اُسے مار مار کر ادھ موا کر دیتے۔ گجرات کے اس باسی کا شہر میں بہت ٹھکا تھا۔

چند ماہ قبل چودھری نذیر گجرات کے مقامی پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہ قیصر کے خلاف فراڈ اور دھوکا دہی کی رپٹ لکھوانا چاہتا تھا۔ چودھری نذیر بھی شہر کا بااثر شخص تھا۔ وہ علاقے کے مشہور چودھری خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پولیس نے قیصر کے خلاف ایف آئی آر تو کاٹ لی، مگر سپاہی سے لے کر انسپکٹر تک کسی کو سمجھ نہیں آیا کہ چودھری نذیر کے ساتھ آخر فراڈ کیا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قیصر نے ایسا کون سا جرم کیا جو پولیس کو حیران پریشان کر گیا؟

دراصل چودھری نذیر لاہور میں بٹ کوائن کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ دو ہفتے قبل اپنے آبائی شہر، گجرات آیا تھا۔ ایک دن اُسے قیصر کا پیغام ملا کہ وہ بٹ کوائن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چودھری نذیر نے قیصر کے ایک آدمی کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ بعد ازاں قیصر نے نجانے کیسا چکر چلایا کہ چودھری نذیر نے دس لاکھ روپے مالیت کے بٹ کوائن اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیے۔ چودھری نذیر سمجھتا تھا کہ قیصر اس انوکھی کرنسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا..... مگر وہ کائیاں مجرم بٹ کوائن کے متعلق بہت کچھ جان چکا تھا۔

بٹ کوائن بہر حال نہایت پراسرار کرنسی ہے۔ یہ مادی لحاظ سے کوئی وجود نہیں رکھتی، بس کمپیوٹر میں موجود چند سطریں اس کی موجودگی کی گواہی دیتی ہیں۔ اس حیرت انگیز کرنسی نے ایک طرف حکومتوں اور بینکوں کو تذبذب و مخمصے کا نشانہ بنا رکھا ہے، تو دوسری سمت دنیا بھر میں لاکھوں لوگ بٹ کوائن کے پرستار بن چکے۔ دلچسپ بات یہ کہ کسی بھی ملک نے باقاعدہ طور پر اسے بطور کرنسی تسلیم نہیں کیا پھر بھی دنیا بھر میں ہزار ہا کمپنیاں اور دکانیں بٹ کوائن پا کر اپنی مصنوعات فروخت کر دیتی ہیں۔

لیکن پاکستان کے چھوٹے سے شہر، گجرات کا پولیس انسپکٹر اس انوکھی کرنسی سے ناواقف تھا پھر بھی چودھریوں کے دباؤ میں آ کر اس نے قیصر کو گرفتار کر لیا۔ جب اس کی چھترول ہوئی، تو ملزم نے جرم قبول کر ڈالا۔ اس کیس سے پہلی بار اہل گجرات بٹ کوائن کی بلا سے واقف ہوئے۔ اب تو بعض امیر گجراتی یہ عجیب و غریب کرنسی بہ رضا و رغبت خرید رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ سونے اور تیل کی طرح بٹ کوائن بھی سرمایہ کاری کے لیے ایک پُرکشش شے بن چکی۔

جناتی کرنسی

یہ زیادہ پرانی بات نہیں، محض چالیس سال قبل ایک پیسے کی بھی اچھی خاصی وقعت تھی جسے عرف عام میں ''ٹیڈی پیسا'' کہا جاتا تھا۔ عیدین پر میرے دادا ہم بچوں کو جب ایک روپیا عیدی دیتے، تو گویا ہماری حقیقی عید ہو جاتی۔ صرف ایک روپے کی بدولت میں عید سے بھرپور انداز میں لطف اٹھاتا۔ کبھی نان حلیم کھائی جاتی تو کبھی چٹ پٹی چاٹ۔ رنگ برنگ جھولے جھول کر بھی مزے لیے جاتے۔

آج بچہ تو کیا کوئی بھکاری بھی ایک روپیا لینا پسند نہیں کرتا۔ درحقیقت انسان سو روپے لے کر بازار جائے، تو وہ سیکنڈوں میں اُڑن چھو ہو جاتے ہیں۔ اُدھر یورپ اور امریکا میں تو ڈیجیٹل کرنسی کا رواج جنم لے چکا جس کی بہترین مثال ''بٹ کوائن'' ہے۔ راقم تو اسے جناتی کرنسی کہے گا کیونکہ یہ کوئی وجود نہیں رکھتی..... صرف دنیائے انٹرنیٹ میں سب ریاضیاتی ہندسوں کی شکل میں موجود ہے۔

بٹ کوائن نے نو برس قبل بڑے پُراسرار انداز میں جنم لیا۔ ہوا یہ کہ نومبر ۲۰۰۸ء میں ستوشی ناکاموتو ایک جاپانی نے ایک دستاویز نیٹ پر پیش کی۔ اس میں ستوشی نے واضح کیا کہ وہ نئی قسم کی ڈیجیٹل کرنسی متعارف کروانا چاہتا ہے۔ اس کرنسی کی خاصیت یہ ہونی تھی کہ وہ حکمرانوں، سیاست دانوں اور بینکاروں کے کنٹرول سے آزاد ہوتی۔

اس زمانے میں مالیاتی بحران نے پوری دنیا کو جکڑ رکھا تھا۔ اس کے جنم دینے میں کرنسیوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ہوا یہ کہ حکومتیں اپنی کرنسیوں کو سنبھال نہ سکیں اور ان کی قدر و قیمت (ویلیو) بہت گر گئی۔ اس بنا پر ہزاروں لاکھوں لوگ اپنی جمع پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بینکوں کا نظام چوپٹ ہو گیا اور کئی بینک راتوں رات دیوالیہ ہو گئے۔

ستوشی نے اپنی دستاویز میں لکھا کہ اس خوفناک مالیاتی بحران کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ایسی ڈیجیٹل کرنسی ایجاد کی جائے جس کے مالک عام لوگ ہوں..... کوئی بھی ملک اس پر اپنی اجارہ داری قائم نہ کر سکے۔ کرنسی کا لین دین بھی بینکوں کے نظام سے آزاد ہو تاکہ وہ اپنی من مانی نہ کر سکیں۔

ستوشی ناکاموتو نے یہ ڈیجیٹل کرنسی تخلیق کرنے کی خاطر ایک سافٹ وئیر ایجاد کیا اور اُسے نیٹ پر پیش کر دیا۔ یہ سافٹ وئیر دنیا کا ہر شخص ڈاؤن لوڈ کر سکتا ہے۔ ستوشی نے دستاویز ہی میں تفصیل سے بتایا کہ یہ سافٹ وئیر کیونکر کام کرتا ہے۔

ریاضی کا پیچیدہ حساب

اس سافٹ وئیر کی مدد سے اُسے استعمال کرنے والا پیچیدہ ریاضیاتی حساب و شمار (Algorithms) کا حل نکالتا ہے۔ جب ایک حل نکل آئے، تو محنت کے پھل کے طور پر اُسے ڈیجیٹل کرنسی کے عموماً دس سکے ملتے ہیں جسے ''بٹ کوائن'' (Bitcoin) کا نام دیا جا چکا۔

اسی سافٹ وئیر کی مدد سے پوری دنیا میں بٹ کوائن کے لین دین کا حساب بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ لیجر اصطلاح میں ''بلاک چین'' (Blockchain) کہلاتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی جگہ بٹ کوائن کوئی خریدے یا فروخت کرے، تو اس کا حساب بلاک چین میں لکھا جاتا ہے۔ سافٹ وئیر ڈاؤن لوڈ کرنے والا اس ''عوامی لیجر'' کو دیکھ سکتا ہے۔

یوں ستوشی نے ایسی ڈیجیٹل کرنسی تخلیق کر ڈالی جسے عام لوگ بھی اپنے گھر میں کمپیوٹروں کی ٹکسال کے ذریعے بنا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ کرنسی کا حساب کتاب بھی انہی کے درمیان رہتا ہے۔ یوں انھیں لین دین کرتے وقت حکومتوں کے ٹیکسوں اور بینکوں کی فیسوں اور پابندیوں سے نجات مل گئی۔

بٹ کوائن کو حکومتوں اور بینکوں کی دسترس سے دور رکھنے کی خاطر ہی ستوشی نے اسے ''رمزی یا کرپٹو کرنسی'' (Crypto currency) کا روپ دے دیا۔ وہ اس طرح کہ سافٹ وئیر رمزی حروف یا خط (کرپٹوگرافی) میں تمام پیچیدہ ریاضیاتی حساب و شمار حل کرتا ہے نیز بلاک چین میں بھی سارا لین دین رمزی حروف میں درج ہوتا ہے۔ اسی لیے بٹ کوائن کے ہر مالک کی اصل شناخت خفیہ رہتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے اپنے بٹ کوائن کس کو بیچے یا کس سے نئے خریدے۔

پیزے کی خرید

سافٹ وئیر کی مدد سے ستوشی ہی نے سب سے پہلے بٹ کوائن تخلیق کیے۔ رفتہ رفتہ امریکا کے کمپیوٹر پروگرامرز تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سافٹ وئیر کو ڈاؤن لوڈ کر کے نئے بٹ کوائن بنانے لگے۔ ان میں لاسز لوہینز نامی ایک نامعلوم امریکی بھی شامل تھا۔

لاسز لوہینز نے ۲۲ مئی ۲۰۱۰ء کو نیٹ پر موجود اپنے ساتھیوں کو پیغام بھیجا کہ جس نے اُسے دو پیزے خرید کر دیے، وہ اُسے دس ہزار بٹ کوائن عطا کرے گا۔ ایک دوست نے اس کی فرمائش قبول کر لی۔ اس نے لاسز لوہینز کو پیزے خرید کر بھجوائے اور بدلے میں دس ہزار بٹ کوائن وصول کر لیے۔

دلچسپ بات یہ کہ آج صرف ایک بٹ کوائن سے کئی سو پیزے خریدے جاسکتے ہیں۔ جی ہاں' یہ سطور قلمبند ہوتے وقت امریکی ڈالر میں ایک بٹ کوائن کی مالیت ۶۱۰۰ ڈالر چل رہی ہے۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم چھ لاکھ بیاسی ہزار نو سو ستر روپے بنتی ہے۔ گویا کل جن دس ہزار بٹ کوائنز سے صرف دو پیزے خریدے گئے تھے' آج انہی سے ہوائی جہاز بھی خریدا جاسکتا ہے۔ پاکستانی کرنسی میں ان کی کل قیمت ''۶۰۰ کروڑ روپے'' سے زیادہ بنتی ہے۔

ستوشی چند سال دنیائے انٹرنیٹ میں سرگرم رہ کر اپنی تخلیق کردہ کرپٹو کرنسی کی تشہیر کرتا رہا۔ ۲۰۱۱ء میں اچانک وہ غائب ہوگیا اور آج تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ کون تھا؟ اس کی حقیقی شخصیت کا معمہ عصر حاضر کے عظیم ترین معموں میں سے ایک بن چکا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بٹ کوائن تخلیق کرنے اور اس کے لین دین کا حساب رکھنے والا سافٹ ویئر کمپیوٹر سائنس کا شاہکار ہے۔ ایسا زبردست سافٹ ویئر کوئی تنہا آدمی نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا ستوشی نا کاموتو ذہین ترین اور نہایت قابل کمپیوٹر پروگرامرز کے گروہ کا نام ہوگا۔ یہ کمپیوٹر پروگرامر معاشیات' رمز شناسی اور نیٹ ورکنگ کا بھرپور علم رکھتے تھے۔ اسی گروہ نے دنیا والوں کو ایک طاقتور ڈیجیٹل کرنسی دے ڈالی جو رفتہ رفتہ شہرت کی نئی منازل طے کررہی ہے۔

کرنسی کی خصوصیات

یہ سافٹ ویئر اس قسم کا ہے کہ صرف دو کروڑ دس لاکھ بٹ کوائن ہی تخلیق کرسکتا ہے۔ اب تک تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ بٹ کوائن تخلیق ہوچکے۔ خیال ہے کہ ۲۰۴۰ء تک تمام بٹ کوائن دنیائے نیٹ میں داخل ہوجائیں گے۔

شروع میں ریاضیاتی حساب وشمار کے عمل حل کرنا آسان تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انھیں حل کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اب دنیا کے مختلف ممالک میں لوگ باقاعدہ کمپنیاں بنا کر بٹ کوائن بنا رہے ہیں۔ ہر کمپنی میں سینکڑوں انتہائی طاقتور کمپیوٹر نصب ہوتے ہیں جن کی مدد سے ریاضیاتی حساب وشمار حل کرکے بٹ کوائن بنائے جاتے ہیں۔ خیال ہے کہ ہر دس سے پندرہ منٹ بعد ایک بٹ کوائن دنیائے نیٹ میں داخل ہوجاتا ہے چونکہ اب صرف ایک بٹ کوائن کی مالیت ہزاروں ڈالر میں ہے لہٰذا اس کی تخلیق کا عمل منافع بخش کاروبار بن چکا۔

آج چین سے لے کر امریکا تک سرمایہ کار ایسی کمپیوٹر کمپنیاں کھول رہے ہیں جن میں سینکڑوں کمپیوٹر نصب ہوتے ہیں۔ ملازمین ان کمپیوٹروں کی مدد سے صرف بٹ کوائن تخلیق کرتے ہیں۔ خاص طور پر چین میں یہ ایک وسیع اور منافع بخش کاروبار بن چکا۔

جیسا کہ بتایا گیا دنیائے نیٹ میں ہر ایک بٹ کوائن کا لین دین بلاک چین (Blockchain) نامی لیجر میں درج ہوتا ہے۔ ریاضیاتی حساب وشمار حل کرنے کا عمل ہی اس لیجر کو محفوظ ومامون رکھتا ہے۔ آپ نے بٹ کوائن سے کوئی کار خریدی یا پیزا' ہر سودا بلاک چین میں درج ہوتا ہے۔

بٹ کوائن کی تعداد بہت کم ہے..... اسی خاصیت نے ایک بٹ کوائن کی مالیت لاکھوں روپے تک پہنچادی۔ قابل ذکر بات یہ کہ ایک بٹ کوائن کو ''ایک ہزار لاکھ حصوں'' میں تقسیم کرنا ممکن ہے۔ اس کا سب سے چھوٹا حصہ یا ٹیڈی پیسا اپنے خالق کے نام پر ''ستوشی'' کہلاتا ہے۔ لاکھوں حصے ہونے کے باعث بٹ کوائن ڈالر کی طرح بین الاقوامی کرنسی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اکاؤنٹ کھولنے کا طریق کار

اگر آپ بٹ کوائن حاصل کرنا چاہتے ہیں' تو آپ کو اس کرنسی کا کاروبار کرنے والی ویب سائٹ پر اپنا اکاؤنٹ کھولنا ہوگا' جیسے آپ گوگل یا یاہو پر اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولتے ہیں تاکہ لوگ آپ کو ای میلز بھجوا سکیں۔ بٹ کوائن کا اکاؤنٹ کھولنے کے

سلسلے میں ''بلاک چین انفو'' (Blockchain.info) نامی ویب سائٹ مشہور ہے۔

جب اکاؤنٹ کھل جائے' تو آپ بٹ کوائن فروخت کرنے والوں سے مطلوبہ تعداد میں کرنسی خرید سکتے ہیں یا پھر بٹ کوائن کے کسی ایکس چینج مثلاً کوائن بیس کام (Coinbase.com) سے کرنسی خرید لیجیے۔ بٹ کوائن خریدتے ہی آپ کا اکاؤنٹ ڈیجیٹل ''بٹوے'' کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہ بٹوہ کھولنے کی خاطر آپ کو رمزی چابی (Cryptographic Key) ملتی ہے۔ اب صرف آپ ہی اس چابی کے ذریعے اپنے بٹ کوائنز سے لین دین کرسکتے ہیں۔

ہر شے کی طرح بٹ کوائن کی کرنسی بھی خوبیاں اور خامیاں رکھتی ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ بٹ کوائن کا لین دین بہت تیز رفتار اور آسان ہے۔ ایک ای میل کی طرح کا پیغام بھیجیے اور بٹ کوائن سے کچھ بھی خرید لیجیے۔ اب دنیا بھر میں ہزاروں دکانیں اور کمپنیاں اسے بطور کرنسی قبول کرنے لگی ہیں۔

دوسرے بٹ کوائن دنیائے انٹرنیٹ کی مشہور ترین کرنسی بن چکی۔ اس کے باعث مغربی ممالک میں کریڈٹ کارڈ کا لین دین دم توڑ رہا ہے' یوں کاروبار اور حساب کتاب کرنا مزید آسان ہوجائے گا۔ تاہم فی الوقت بٹ کوائن سے وابستہ فوائد کم ہیں اور یہ خامیاں زیادہ رکھتی ہے۔

کرپٹو کرنسی کی خامیاں

بٹ کوائن سے وابستہ ایک بڑی خامی اس کی مالیت کا وقتاً فوقتاً کم یا زیادہ ہونا ہے۔ مثال کے طور پر ۲۰۱۰ء میں ایک بٹ کوائن کی مالیت (ڈالر کے) چند سینٹ تھی۔ ۲۰۱۱ء کے وسط میں اس کی مالیت تیس ڈالر ہوگئی۔ پھر اسی سال کے آخر میں قیمت گر کر صرف دو ڈالر تک جا پہنچی۔

پھر بٹ کوائن کی مالیت کو پر لگ گئے۔ اوائل ۲۰۱۳ء میں وہ دو سو ساٹھ ڈالر تک جا پہنچی لیکن پھر وہ گر کر ایک سو ڈالر پر پہنچ گئی۔ جن لوگوں نے دو سو ساٹھ ڈالر کے حساب سے بٹ کوائن خریدے' انھیں خاصا مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ مالیت میں برق رفتار کمی بیشی کا عمل ہنوز جاری ہے۔ وہ چند دن میں کئی سو ڈالر بڑھتی یا گر جاتی ہے۔

اسی باعث بعض ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ بٹ کوائن تخلیق کرنے والوں کا کوئی گروہ اس کی مالیت راتوں رات گھٹانے بڑھانے میں ملوث ہے چونکہ اس کرنسی پر کسی حکومت کا اختیار نہیں لہٰذا بٹ کوائن کی قدر و قیمت دیکھتے ہی دیکھتے گرتی یا بڑھ جاتی ہے۔ گویا یہ سٹے بازوں کی من پسند کرنسی بن چکی۔

بٹ کوائن کے اکاؤنٹ ہیکروں کا بھی نشانہ بنتے ہیں۔ اگر وہ کسی اکاؤنٹ کی چابی اڑانے میں کامیاب ہوجائیں' تو اس میں موجود تمام بٹ کوائن کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ اکاؤنٹ کا مالک سر پیٹتا رہ جاتا ہے کیونکہ وہ دنیائے نیٹ میں پوشیدہ بیٹھے چور ڈاکوؤں کے خلاف کہیں بھی رپٹ درج نہیں کرواسکتا۔ مزید برآں کسی سے خدانخواستہ اکاؤنٹ کی چابی گم ہوجائے' تو تب بھی وہ بٹ کوائن کی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں کی چاندی

دنیائے انٹرنیٹ میں یہ قطعاً پتا نہیں چلتا کہ بٹ کوائن کے اکاؤنٹ کا مالک کون ہے اور کس نے لین دین کیا ہے؟ اسی وجہ سے بٹ کوائن دنیا بھر میں جرائم پیشہ لوگوں کی مرغوب کرنسی بن چکی۔ اب وہ غیر قانونی اور ناجائز دھندوں کا لین دین بٹ کوائن میں کرنے لگے ہیں جو کسی بھی ملک کے قانون کے دائرہ کار میں نہیں آتی۔ دنیائے انٹرنیٹ میں تو ایسی ویب سائٹس وجود میں آچکیں جہاں صرف بٹ کوائن کے ذریعے اشیاء خریدی یا بیچی جاتی ہیں۔ ان میں ''سلک روڈ'' بہت مشہور تھی جہاں منشیات سے لے کر اسلحہ تک مل جاتا تھا۔ اب اس

قسم کی دیگر ویب سائٹس بھی وجود میں آچکیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق دنیا میں تیس سے پچاس لاکھ کے مابین افراد باقاعدگی سے بٹ کوائن استعمال کرتے ہیں جبکہ دنیا بھر میں ایک لاکھ سے زائد اداروں میں بٹ کوائن کو بطور کرنسی قبول کیا جانے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے اب بہت سے لوگ سونے کی طرح بٹ کوائن میں بھی سرمایہ کاری کرنے لگے ہیں۔ تاہم سونے سے زیادہ اس کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ آتا ہے۔ اسی لیے ماہرین معاشیات عموماً لوگوں کو بٹ کوائن میں سرمایہ کاری کرنے سے منع کرتے ہیں۔

ماہرین معاشیات اگرچہ بٹ کوائن کے فوائد کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان کا کہنا ہے کہ کسی حکومت یا بین الاقوامی شہرت کے حامل بینک یا بینکوں کو بٹ کوائن سے ملتی جلتی ڈیجیٹل کرنسی متعارف کروانی چاہیے جس پر کم سے کم حکومتی پابندیاں لگائی جائیں۔ یوں ڈیجیٹل کرنسی ایک حد تک قانون کے دائرہ کار میں آجائے گی۔ بٹ کوائن کا مادر پدر آزاد ہونا ہی ماہرین معاشیات کو بہت کھلتا ہے اور حدود و قیود سے ماورا کرنسی کے بہرحال نقصانات بھی ہیں۔

ڈیجیٹل کرنسی کی روز افزوں مقبولیت دیکھتے ہوئے اب دنیا بھر کے بینک اس کوشش میں ہیں کہ وہ اپنی کسی قسم کی ڈیجیٹل کرنسی مارکیٹ میں لے آئیں۔ مثال کے طور پر دو جاپانی بینکوں..... میز ہو فنانشل گروپ اور جاپان پوسٹ بینک کے کنسورشیم نے اعلان کیا ہے کہ وہ ۲۰۲۰ء تک ''جے کوائن'' کے نام سے اپنی ڈیجیٹل کرنسی متعارف کروا دیں گے۔ یہ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے کام کرے گی۔

قصہ مختصر، بٹ کوائن کا سورج ابھی چڑھا ہوا ہے لیکن خفیہ نوعیت رکھنے کی وجہ سے مستقبل میں صارفین و کمپنیوں کی بڑی تعداد اس سے برگشتہ ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر یہ ممکن ہے

چینی حکومت کا دھاوا

ماہ ستمبر کے اوائل میں چین نے اچانک ملک بھر میں موجود بٹ کوائن کے ایکس چینجوں پر پابندی لگا دی۔ چینی حکومت کا کہنا تھا کہ جرائم پیشہ گروہ ان ایکس چینجوں کے ذریعے کاروبار کر رہے ہیں اور ان کا دھندا پھل پھول رہا ہے۔

اس پابندی سے قبل چین دنیا میں بٹ کوائن کی خرید و فروخت کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن اب جاپان اور جنوبی کوریا میں بٹ کوائن کی خرید و فروخت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ امیر جاپانی اور کورین اس کرپٹو کرنسی میں خوب سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے بٹ کوائن کی قیمت پھر بلند ہو گئی۔ ورنہ چینی حکومت کی اچانک پابندی نے بٹ کوائن کی قدر خاصی گرا دی تھی۔

ماہرین مالیات کا کہنا ہے کہ چین بٹ کوائن اور دیگر ابھرتی ڈیجیٹل کرنسیوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ لامحالہ اسے ان کرنسیوں کی خاطر قوانین بنانا پڑیں گے تاکہ وہ چینی معیشت میں رچ بس سکیں۔

کہ بٹ کوائن پر سرمایہ کاری کرنے والے اس کی قیمت یکا یک گرنے سے دیوالیہ ہو جائیں لہٰذا پاکستانیوں کو سوچ سمجھ کر اس کرپٹو کرنسی پر پیسا لگانا چاہیے ورنہ وہ کسی بھی وقت ڈوب بھی سکتا ہے۔

پاکستان میں بھی دنیائے انٹرنیٹ پر بٹ کوائن کے ایکس چینج وجود میں آچکے۔ ان پر بٹ کوائن کے ذریعے بجلی، ٹیلی فون وغیرہ کے بل دینا اور موبائل لوڈ کرنا ممکن ہے۔ فی الوقت پاکستانی کرنسی میں ایک بٹ کوائن کی مالیت تین لاکھ اٹھانوے ہزار بیس روپے ہے۔ یہ مالیت وقتاً فوقتاً گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ●●●

دنیائے نیٹ میں ''کورا'' (Quora) مشہور سماجی ویب سائٹ ہے۔ اس میں کوئی بھی شخص ہر قسم کا سوال پوسٹ کر سکتا ہے۔ پھر دنیا بھر سے لوگ اپنے

پرست مملکت قرار دیا۔ ایک سیاہ فام امریکی، ڈیوایڈ الی کا

بھارت کی ۱۱ خوفناک سچ

عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تلخ اور چشم کشا حقائق

رضوان علی شاہ

نقطہ نظر سے اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل کورا میں یہ سوال پوسٹ کیا گیا: ''سیاح کی حیثیت سے آپ کس ملک کو سب سے زیادہ نسل پرست (Racist) ملک پاتے ہیں؟'' جواب میں کئی سیاحوں نے ''بھارت'' کو انتہائی نسل

جواب تو چشم کشا ثابت ہوا۔ آپ بھی جواب ملاحظہ فرمائیے:

''میں شعبہ آئی ٹی سے وابستہ سیاہ فام امریکی ہوں۔ اپنے کام کے سلسلے میں کئی یورپی اور ایشیائی ممالک جا چکا جن میں برطانیہ، جرمنی، انڈونیشیا،

ویت نام اور بھارت شامل ہیں۔ میں نے تمام ملکوں میں سب سے زیادہ بھارت کو نسل پرست پایا۔ بھارتی عوام محض نسل پرست ہی نہیں وہ متعصب اور کرز ذہنیت رکھنے والے بھی ہیں۔ امیر اور بااثر بھارتی اپنے غریب ہم وطنوں سے جس قسم کا ذلت بھرا سلوک کرتے ہیں، وہ میں نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔

بھارتیوں کو خاص طور پر سیاہ رنگت سے نفرت ہے۔ اسی لیے بھارتی رنگ گورا کرنے والی کریموں، صابنوں اور لوشنوں وغیرہ کے دیوانے ہیں۔ ایک بھارتی اگر یہ جان جائے کہ آپ مختلف مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، یا کوئی اور زبان بولتے ہیں، تو تب بھی آپ اس کی نفرت کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ سیاہ فام انسانوں کو تو بھارت میں قدم قدم پر حقارت بھرا سلوک برداشت کرنا پڑتا ہے''۔

بھارت کے مختلف علاقوں میں آباد لوگ بھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔ مثلاً امرتسر میں میرا ایک بھارتی دوست، گیان نیپالی تھا جسے میں شروع میں چینی سمجھا تھا۔ امرتسر کے لوگ اُسے ''چنکی'' یا ''بہادر'' کہہ کر چھیڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ درحقیقت شمال مشرقی ریاستوں میں آباد لوگوں کو چینی شکل وصورت رکھنے کے باعث پورے بھارت میں ''چنکی'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ذلت بھری اصطلاح ہے''۔

''امریکا میں ٹیرنس نامی سیاہ فام میرا دوست ہے۔ دس سال قبل اس نے ایک بھارتی لڑکی، ریکھا سے شادی کرلی۔ ان کے تین بچے پیدا ہوئے۔ تینوں کا رنگ خاصا سیاہ ہے اور وہ میرے دوست جیسے گھنگھریالے بال رکھتے ہیں۔ ریکھا کا تعلق ریاست گجرات سے تھا۔ جب وہ بچوں کے ساتھ پہلی بار میکے گئی، تو وہاں بہت سے رشتے دار معصوم بچوں کو ''کالا، کالا'' کہہ کر چھیڑنے لگے۔ ریکھا نے کچھ عرصہ تو یہ مذاق برداشت کیا پھر انہیں دھمکی دے دی کہ اب میرے بچوں کا استہزا کیا، تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا''۔

''سیاہ رنگت والے تمام غیر ملکیوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سرزمین بھارت پر قدم نہ دھریں کیونکہ عام لوگ ان سے حقارت بھرا سلوک کریں گے۔ البتہ آپ کی رنگت سفید ہے، تو پھر بھارت چلے جایئے۔ بھارتی سفید فاموں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ میں نے یہ تک دیکھا ہے کہ بھارتی ہم وطنوں پر سفید فاموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں بھارتی عوام کا ہرگز مخالف یا دشمن نہیں، بلکہ بھارت میں قیام کے دوران میں نے جو کچھ دیکھا، بس اُسے بیان کردیا''۔

☆☆

ایک امریکی سیاہ فام کے درج بالا تجربات ومشاہدات بھارت کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی شروع ہوگئی ہے مگر اس مملکت میں آج بھی ذات پات کا جیتا جاگتا نظام موجود ہے۔ اسی لیے نچلی ذات کے ہندو آئے دن برہمنوں اور کھشتریوں کے ظلم وستم کا شکار ہوتے ہیں۔

بھارتی شہروں میں پھیلی نسل پرستی بھارت کی صرف ایک خوفناک سچائی آشکارا کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت سے کئی رونگٹے کھڑے کردینے والے منفی عوامل وابستہ ہیں لیکن وہ عموماً نمایاں نہیں ہو پاتے۔ وجہ یہ کہ بھارتی حکومت کا پروپیگنڈا سیل بہت فعال اور سرگرم ہے۔

یہ پروپیگنڈا سیل دنیا والوں کے سامنے بھارت کو ایک ابھرتی سپر پاور بنا کر پیش کررہا ہے جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر علاقائی طاقت بن چکا۔ وزیراعظم نریندر

مودی کی متحرک شخصیت نے بھی دنیا میں بھارت کا تصور بہتر بنایا ہے۔ مزید برآں کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سربراہ یا اعلیٰ عہدے دار بھارتی نژاد ہیں۔ ان کی وجہ سے بھی اقوام عالم میں بھارت کا مقام بلند ہوا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ بھارت آج بھی کئی سنگین علتوں کا شکار ہے، گو بھارتی حکومت کا پروپیگنڈا سیل انہیں پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔

بھارت بھر میں پھیلی نسل پرستی کا قصہ تو آپ ایک امریکی سیاہ فام کی زبانی سن چکے، بھارتی معاشرے میں موجود دیگر خرابیوں اور برائیوں کا آنکھیں کھول دینے والا بیان درج ذیل ہے۔

۲۔ غریبوں کا دیس

دنیا میں سب سے زیادہ غریب بھارت میں بستے ہیں۔ بھارت کا محکمہ دیہی ترقی (رورل ڈویلپمنٹ) ملک میں غربت کا جائزہ لینے کے لیے ایک سروے بہ عنوان ''سوشیو۔اکنامک کاسٹ سینس (Socio-economic caste census) کرتا ہے۔ ایسا آخری سروے ۲۰۱۵ء میں ہوا تھا۔

اس سروے نے انکشاف کیا تھا کہ بھارت میں ۷۵ فیصد آبادی کی ماہانہ آمدن پانچ ہزار روپے سے کم ہے۔ بھارتی عوام کی اکثریت روزانہ صرف بیس تا تیس روپے کما کر بہ مشکل اپنی ضروریات پوری کرتی اور زندہ رہتی ہے۔

درج بالا سروے ہوئے دو برس بیت چکے۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ بھارت میں غربت کم ہوئی ہے، تب بھی ۷۰ فیصد بھارتی عوام جسم وجاں کا رشتہ بڑی مشکل سے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ بھارت میں غربت پھیلنے کی بنیادی وجہ دولت کی نامنصفانہ تقسیم ہے۔ مٹھی بھر بھارتی اربوں کھربوں روپے کی جائیداد رکھتے ہیں جبکہ کروڑوں بھارتی روزانہ صرف اتنی رقم ہی کما پاتے ہیں کہ دو وقت روٹی کھا کر زندہ رہ سکیں۔

بھارتی حکمران طبقہ غربت ختم کرنے کا دعویٰ تو بہت کرتا ہے مگر عملاً کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھاتا۔ مودی حکومت تو دھڑا دھڑ اربوں ڈالر کا اسلحہ خرید رہی ہے حالانکہ اس رقم سے وسیع پیمانے پر غربت مٹاؤ منصوبے شروع ہوسکتے ہیں۔

۳۔ خواتین کے لیے خطرناک ملک

جولائی ۲۰۱۷ء میں امریکی صحافی لارا بیگے بلوم نے مشہور رسالے، فوربس کی ویب سائٹ پر ایک مضمون ''خواتین سیاحوں کے لیے دس خطرناک جگہیں'' (10 Most Dangerous places for Women Travelers) تحریر کیا۔ اسی میں لارا نے سیاحت کی ممتاز ویب سائٹ، ٹرپ کام کے حوالے سے انکشاف کیا کہ خواتین سیاحوں کے لیے بھارت دنیا کا چوتھا خطرناک ترین دیس ہے۔ اس نے بھارت جانے والی خاتون سیاحوں کو درج ذیل مشورے دیے:

☆ گلی بازار میں ہوشیار ہوکر چلو کیونکہ کوئی بھی مرد حملہ کرسکتا ہے۔

☆ بھارتی مرد گھور کر دیکھتے ہیں۔ اس عمل کے لیے تیار رہیے۔

☆ رات کو گھومنے پھرنے سے پرہیز کریں۔

☆ دہلی، ممبئی اور دیگر بڑے شہروں میں خواتین کے لیے مخصوص ٹرانسپورٹ میں سفر کریں۔

یہ واضح رہے کہ انسانی فلاح وبہبود سے وابستہ عالمی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کی تحقیقی رپورٹوں میں بھارت ان ممالک میں شامل ہوتا ہے جو خواتین کے لیے خطرناک قرار دیے جاچکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ بھارتی معاشرے میں آج بھی عورت کو کمتر اور کمزور سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے بھارتی مرد خواتین خانہ کو پاؤں کی جوتی سمجھتے اور ان پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ بھارت کے بیشتر گھروں میں لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ لڑکی بھوک سے مرجائے گی تب بھی والدین بیٹے کا پیٹ بھرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۴۔ جعلی ادویہ کی وبا

بھارت ادویہ تیار کرنے والا دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ بھارت میں بیس ہزار ادارے ادویہ تیار کر رہے ہیں۔ اگرچہ ستر فیصد مارکیٹ صرف ڈھائی سو ادویہ ساز کمپنیوں کے قبضے میں ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بھارت میں ۱۰ سے ۱۵ فیصد ادویہ جعلی ہوتی ہیں۔ یہ جعلی ادویہ دیگر ممالک خصوصاً افریقی ملکوں کو بھی بھجوائی جاتی ہیں۔ گویا ہوس و لالچ کا شکار بھارتی اپنے ملک کے علاوہ بیرون ممالک میں بھی موت بانٹ رہے ہیں۔

۵۔ خواتین پہ ظلم کی انتہا

بزفیڈ (Buzzfeed) خبریں وحقائق دینے والی مشہور امریکی ویب سائٹ ہے۔ پچھلے سال ایک بھارتی صحافی، شایان رائے نے اس پر چشم کشا مضمون تحریر کیا جس کا عنوان ہے:

Facts about Gender inequality in India that will Truly shock you.

یہ مضمون نہیں بھارتی مردوں کے خلاف خوفناک چارج شیٹ ہے جنہوں نے خواتین پر ظلم کرنا وتیرہ بنا رکھا ہے۔ مضمون میں بیان کردہ چند حقائق درج ذیل ہیں:

☆ پچھلے تین برس میں چوبیس ہزار دلہے جہیز نہ لانے پر اپنی دلہنوں کو قتل کر چکے۔

☆ بھارت میں ۷۰ فیصد شادی شدہ خواتین گھروں میں شوہروں یا سسرالیوں کے ہاتھوں مار پیٹ یا بے حرمتی کا نشانہ بنتی ہیں۔

☆ یونیسف کے اعداد و شمار کی رو سے بھارت میں نوزائیدہ بچے کی جنس کا تعین کرنے والی طبی صنعت کی مالیت ایک ہزار کروڑ روپے ہو چکی۔

☆ پچھلے دس سال میں بھارتی ڈاکٹر ''آٹھ کروڑ'' زنانہ جنین (پرورش پاتے بچے) قتل کر چکے۔

☆ بھارت میں کم عمری کی شادی ممنوع ہے مگر آدھی سے زیادہ خواتین کی شادی ۱۸ سال کا ہونے سے پہلے ہی ہو جاتی ہے۔

۶۔ خودکشی کی بلند شرح

بھارت ان ممالک میں شامل ہے جہاں مرد وزن کی بڑی تعداد خودکشیاں کر کے اپنی جان لے لیتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے مطابق ہر سال دنیا بھر میں تقریباً آٹھ لاکھ افراد خودکشی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک لاکھ پینتیس ہزار بھارت سے تعلق رکھتے ہیں۔ غربت، بیروزگاری، گھریلو جھگڑے، امتحان میں ناکامی وغیرہ خودکشی کرنے کی بڑی وجوہ ہیں۔

دبئی کی مشہور نیوز سائٹ، ال عربیہ میں ۲۱ ستمبر ۲۰۱۷ء کو ایک ہندو صحافی، مہیش تری دیو کا لکھا انگریزی مضمون

''Academics, peer pressure drive India's adolescents to suicide''

شائع ہوا۔ اس میں مہیش صاحب نے انکشاف کیا کہ ۱۵ سے ۲۹ سال کی عمر کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں سب سے زیادہ خودکشی کی شرح بھارت میں ہے۔

مضمون کی رو سے بھارت میں ہونے والی ۳۴ فیصد خودکشیاں نوجوان لڑکے لڑکیاں کرتے ہیں اور تعجب خیز بات یہ کہ اکثر نوجوان نہایت معمولی باتوں پر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ مثلاً لڑکوں نے کسی موٹے لڑکے کا مذاق اڑایا تو اس نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔

بھارت میں ہر سال ہزارہا کسان بھی فصل اچھی نہ ہونے پر خودکشی کر لیتے ہیں۔ دراصل قرضوں کا بوجھ انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی طرح بھارتی افواج میں بھی خودکشی کرنے کی شرح خاصی بلند ہے۔ یہ خودکشیاں آشکارا کرتی ہیں کہ بھارتی معاشرے میں زندگی سے مایوس مرد وزن کی بہت بڑی تعداد بستی ہے۔ (بقیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

ہندو گپتا خاندان نے جنوبی افریقا میں کرپشن کی گنگا بہادی

ابو ہادی

یہ پندرہویں صدی کی بات ہے کہ پرتگیزی مہم جو جنوبی افریقا پہنچے اور وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر لیں۔ اس کے بعد یہ افریقی ملک ولندیزی اور برطانوی نوآبادی رہا۔ یورپی استعمار نے جنوبی افریقا کے قدرتی وسائل جی بھر کے لوٹے اور سیاہ فام باشندوں پر ظلم ڈھائے۔ سفید فام توعیش و عشرت میں زندگی گزارتے جبکہ سیاہ فام باشندے ایک وقت کی روٹی کے بھی محتاج رہتے۔

آخر وقت بدلا اور ۱۹۹۰ء کے بعد جنوبی افریقا کے سفید فاموں نے سرکاری پالیسیاں تبدیل کر دیں۔ ۱۹۹۴ء میں پہلی بار کثیر جماعتی انتخابات ہوئے جو سیاہ فاموں کی جماعت، افریقن نیشنل کانگریس نے جیت لیے۔ سفید فاموں کی آمریت سے کئی سال نبرد آزما رہنے والے نیلسن منڈیلا نے حکومت سنبھال لی۔

اس وقت سیاہ فام لیڈروں کا جذبہ جوان تھا۔ وہ یہ عزم رکھتے تھے کہ سیاہ فاموں کو غربت، جہالت اور بیماری کی آفتوں سے نجات دلا کر انہیں بھی خوشحال اور ترقی یافتہ بنا دیں۔ معاشرے میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور سبھی آرام و آسائش سے زندگی گزار سکیں۔

لالچ اور دھوکے بازی کی عبرت ناک داستان

افسوس کہ کرپشن کا زہر جنوبی افریقا کی سیاہ فام حکومت میں سرایت کر گیا۔ یوں عوام نے اپنی مملکت کو خوشحال اور عظیم بنانے کے جو سہانے خواب دیکھے تھے، وہ پورے نہ ہو سکے۔ آج بھی جنوبی افریقا میں سیاہ فاموں کی اکثریت غربت، بیروزگاری اور جہالت وغیرہ کے بھوتوں سے نبرد آزما ہے۔

ہندو فیملی کی آمد

خاص بات یہ کہ جنوبی افریقا میں کرپشن کی لعنت پھیلانے میں ایک ہندو خاندان نے اہم کردار ادا کیا۔ اس چالاک و عیار ہندو خاندان نے حکمران طبقے سے قریبی تعلقات قائم کیے اور یوں سرکاری سرپرستی پا کر پھلنے پھولنے لگا۔ اس نے سرکاری منصوبوں میں کرپشن کی بدولت ڈھیروں دولت اپنی تجوریوں میں جمع کر لی جبکہ لاکھوں سیاہ فام جنوبی افریقنوں کی آمدن بس اتنی ہے کہ روزمرہ اخراجات پورے ہو جائیں۔

اس ہندو خاندان کی داستان عیاں کرتی ہے کہ چالاک و ہوشیار لوگ حکمرانوں کو اپنے جال میں پھانس کر کس طرح الو بناتے اور اپنے مفادات پورے کر لیتے ہیں۔

اس عبرت ناک اور چشم کشا داستان کا آغاز ۱۹۹۳ء میں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بھارتی شہر سہارن پور میں شیو کمار گپتا نامی کاروباری اپنے تین بیٹوں کے ساتھ مختلف کاروبار کرتا تھا۔ جب جنوبی افریقا سفید فاموں کی گرفت سے آزاد ہوا، تو شیو کمار نے اپنے ایک بیٹے، اٹول گپتا کو اسی ملک میں بھجوا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جنوبی افریقا مستقبل میں ''نیا امریکا'' بن سکتا ہے۔

۱۹۹۳ء کے اوائل میں اٹول گپتا جنوبی افریقا کے سب سے بڑے شہر، جوہانس برگ پہنچ گیا۔ اس نے حالات کاروبار کے لیے سازگار پائے۔ چناں چہ باپ کے پیسے سے شہر میں صحارا کمپیوٹرز کے نام سے ایک دکان کھولی اور کمپیوٹر فروخت کرنے لگا۔

یہ دکان چل پڑی۔ رفتہ رفتہ اٹول نے نئی کمپیوٹر دکانیں کھول لیں۔ جلد ہی اس نے اپنے دونوں بھائیوں، اجے اور

اٹول گپتا جنوبی افریقن صدر جیکب زوما کے ساتھ

راجیش کو بھی جنوبی افریقا بلوا لیا۔ تینوں بھائی پھر دیگر شعبوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کان کنی، ہوابازی، توانائی، ٹیکنالوجی اور میڈیا کی کمپنیاں کھول لیں۔ سرکاری سرپرستی کے باعث ان کا کاروبار پھلتا پھولتا رہا حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا ان کمپنیوں میں دس ہزار افراد کام کرنے لگے۔

اب گپتا برادران کا شمار جنوبی افریقا کی امیر ترین شخصیات میں ہونے لگا۔ عام خیال یہی تھا کہ انہوں نے محنت، جذبے اور ایمان داری کے بل بوتے پر زبردست کاروباری ترقی کی ہے مگر یہ تصور دھوکا تھا۔ ۲۰۱۳ء کے بعد انکشاف ہوا کہ گپتا بھائیوں نے حکمران طبقے میں اثر و رسوخ بڑھا کر بذریعہ کرپشن اپنی کاروباری سلطنت کھڑی کی ہے۔ یوں انہوں نے قومی خزانے کو بھاری نقصان پہنچایا جبکہ سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کو مالا مال کر دیا۔

کرپٹ جنوبی افریقن دوست بن گیا

گپتا بھائیوں کی کرپشن کا آغاز اکیسویں صدی کے اوائل میں ہوا جب وہ جنوبی افریقا کے نائب صدر، جیکب زوما کی دوستی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ دوستی جلد ہی اتنی زیادہ بڑھی کہ نائب صدر کی ایک بیوی گپتا خاندان کی ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے لگی جبکہ اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی گپتا خاندان کی کمپنیوں کے ڈائریکٹر بن گئے۔

جیکب زوما افریقن نیشنل کانگریس کا سینئر لیڈر تھا۔ وہ بالکل ان پڑھ تھا مگر سیاہ فاموں کے خلاف تحریک میں سرگرم رہا۔ اپنی خدمات کے صلے میں اُسے ۱۹۹۹ء میں جنوبی افریقا کا نائب صدر بنا دیا گیا۔

تاہم جیکب زوما خواہشات کا اسیر آدمی تھا۔ اقتدار میں آ کر اُسے پیسے کی چاٹ لگ گئی اور وہ زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کرنے اور دولت کمانے کے لیے کرپشن کرنے لگا۔ گپتا بھائیوں نے زوما کے لالچی پن سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی بیوی اور اولاد کو اپنے کاروبار میں شریک کر لیا۔ یہ کوئی نیکی نہیں تھی، بلکہ اس طرح گپتا خاندان اپنے مفادات کی تکمیل چاہتا تھا۔

نائب صدر سے قربت کی بنا پر سرکاری ٹھیکے گپتا خاندان کی کمپنیوں کو ملنے لگے۔ سرکاری محکموں میں کمپنیوں کے رکے ہوئے کام بھی جلد نمٹ جاتے۔ گپتا بھائی بارسوخ سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کو بھی مال پانی کھلانے لگے تاکہ سرکاری محکموں میں ان کے کاموں میں رکاوٹ نہ آئے۔ اس

جنوبی افریقن صدر کا بیٹا گپتا بھائیوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے

طرح چالاک و عیار ہندو بھائیوں نے جنوبی افریقن سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کو کرپشن کی چاٹ لگا دی۔

۲۰۰۴ء میں جیکب زوما پر الزام لگا کہ اس نے ایک اسلحہ معاہدے میں برطانوی اور جرمن کمپنیوں سے کمیشن لگایا ہے۔ چونکہ اس اسکینڈل میں حکمران طبقے کے بڑے بڑے لوگ شامل تھے لہٰذا انہوں نے مل ملا کر مقدمہ ختم کروا دیا۔

زوما تنہا رشوت نہیں کھاتا، بلکہ اپنے چیلے چانٹوں اور چمچوں کو بھی کھلاتا ہے، اسی لیے وہ جنوبی افریقن حکمران طبقے میں بڑا مقبول ہے۔

اسی مقبولیت کے سہارے ۲۰۰۹ء میں جیکب زوما جنوبی افریقا کا صدر بن گیا۔ اس نے اقتدار سنبھالا تو گویا گپتا بھائیوں کی لاٹری لگ گئی۔ زیادہ سے زیادہ سرکاری ٹھیکے پا کر ان کی کمپنیوں کا بزنس چمک اٹھا اور تینوں بھائی شاہانہ زندگی گزارنے لگے۔

اب گپتا برادران نے یہ کمال کر دکھایا کہ تمام سرکاری محکموں اور سرکاری کمپنیوں میں اپنے آدمی تعینات کر دیے۔ یوں ان کے لیے وسیع پیمانے پر کرپشن کرنا آسان ہو گیا۔ اس کام میں بہت سے سیاست داں اور سرکاری افسر ہی نہیں نیک نام ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی گپتا خاندان کی شریک کار بن گئیں تا کہ کرپشن کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکیں۔

شادی منحوس ثابت ہوئی

اپریل ۲۰۱۳ء میں گپتا بھائیوں کی بھانجی، وینا گپتا کی شادی تھی۔ انہوں نے یہ شادی جوہانسبرگ میں کروانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ شادی انتہائی منحوس ثابت ہو گی اور اس کی وجہ سے ان کی تمام سیاہ کاریاں دنیا والوں پر افشا ہو جائیں گی۔

ہوا یوں کہ گپتا بھائیوں نے ہوائی جہاز کے ذریعے بھارت سے ۲۱۷ مہمان بلوائے جن میں مشہور بھارتی ہستیاں شامل تھیں۔ یہ ہوائی جہاز جنوبی افریقن فضائیہ کے ایک جنگی اڈے پر اتارا گیا۔ اس اڈے پر صرف غیر ملکی سربراہان مملکت کے طیارے اترتے تھے۔ گویا گپتا بھارتیوں کے طیارے کا وہاں اترنا غیر قانونی اور غیر اخلاقی تھا۔

جنگی اڈے پر تعینات کسی فوجی افسر نے جنوبی افریقن میڈیا کو یہ خبر لیک کر دی۔ اب تو پورے ملک میں حکومت کے خلاف شور مچ گیا۔ حزب اختلاف نے صدر زوما پر الزام لگایا کہ انہوں نے گپتا برادران کو اتنی زیادہ چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ کھلے عام قانون کا مذاق اڑاتے اور اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ حکمران جماعت کے بعض سینئر لیڈروں نے بھی گپتا خاندان کو مادر پدر آزادی دینے پر صدر زوما کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

صدر زوما کو وینا گپتا کی شادی میں شرکت کرنا تھی مگر جب انہیں تنقید کا نشانہ بننا پڑا، تو یہ شرکت کینسل کر دی گئی۔ اب جنوبی افریقن میڈیا میں گپتا بھائیوں کے خلاف مضامین چھپنے لگے۔ کہا جانے لگا کہ صدر زوما سے قریبی و کاروباری تعلقات کا فائدہ اٹھا کر بھائیوں نے جنوبی افریقا میں ''متوازی حکومت'' قائم کر لی ہے۔

زولین زیماویوی (Zwelinzima Vavi) جنوبی افریقا میں ٹریڈ یونین کا مشہور لیڈر اور اینٹی کرپشن مہم کا راہنما ہے۔ اس نے قصر صدارت میں گپتا خاندان کے اثر و رسوخ کو ''شیڈو گورنمنٹ'' (Shadow Govermnet) کا خطاب دیا۔

اس موقع پر جنوبی افریقا کے بعض دلیر صحافی گپتا خاندان کے کرتوتوں کا پردہ چاک کرنے لگے۔ انہوں نے افشا کیا کہ یہ چالاک و عیار ہندو خاندان ''مملکت پر قبضہ'' (State Capture) کر چکا۔ اس انوکھی اصطلاح سے ان کی یہ مراد تھی کہ صدر جیکب زوما کی حکومت بیشتر فیصلے ایسے کرتی ہے جو کسی نہ کسی طرح گپتا خاندان کو فائدہ پہنچائیں۔ مثلاً اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تقرری، نئے ترقیاتی منصوبے بنانا وغیرہ۔ حتیٰ کہ پالیسیاں بناتے ہوئے بھی گپتا برادران کے مفادات

جنوبی افریقا ایک نظر میں

جمہوریہ جنوبی افریقا کا رقبہ بارہ لاکھ اکیس ہزار مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ یہ بلحاظ رقبہ دنیا کا ۲۵واں بڑا ملک ہے۔ مملکت میں تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ انسان بستے ہیں۔ گویا یہ آبادی کے لحاظ سے ۲۴واں بڑا ملک ہے۔ جنوبی افریقا ایک کثیر نسلی معاشرہ رکھتا ہے۔ ملک میں بہ کثرت مختلف تہذیبیں، زبانیں اور مذاہب ملتے ہیں۔ مملکت کی ''۱۱'' سرکاری زبانیں ہیں۔ دنیا میں کسی بھی ملک میں یہ سرکاری زبانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

جنوبی افریقا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ دنیا کی ان چند مملکتوں میں سے ایک ہے جہاں کبھی مارشل لا نہیں لگا اور پچھلی ایک صدی سے سیاہ فاموں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہیں تھی۔ مملکت میں سفید فاموں کی آبادی صرف ۹ فیصد تھی مگر اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے باعث تقریباً پوری بیسویں صدی میں وہ حکومت کرتے رہے۔

ملک میں عیسائیوں کی کثرت ہے مگر وہ مختلف عیسائی فرقوں میں منقسم ہیں جن کے مابین خاصے مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مسلمان آبادی کا ۱ء۵ فیصد اور ہندو ۱ء۲ فیصد حصہ ہیں۔

جنوبی افریقا کا جی ڈی پی (پی پی پی) ۷۵۰ ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ یوں فی کس آمدن ۱۳،۳۲۱ ڈالر بنتی ہے۔ یہ دنیا کی ۳۴ویں بڑی معیشت ہے مگر دولت کی نامنصفانہ تقسیم کے باعث تقریباً تیس فیصد آبادی غربت کا شکار ہے نیز مملکت میں بیروزگاری بھی اچھی خاصی پائی جاتی ہے آمدن کا بڑا ذریعہ سرکاری اور نجی ملازمتیں ہیں۔ لوگوں کو بقیہ آمدن صنعت و تجارت اور زراعت سے ہوتی ہے۔

سونا، ہیرے، پلاٹینم، دیگر دھاتیں اور مشینری اہم برآمدات ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں ایکسپورٹ کی مالیت ۸۳ء۱۶ ارب ڈالر تھی۔ چین، جرمنی، امریکا، بوٹسوانا، جاپان اور بھارت جنوبی افریقا کے بڑے تجارتی ساتھی ہیں۔

...کر رکھے جاتے۔

...ت انگیز مہم کا آغاز

جب جنوبی افریقن میڈیا میں گپتا خاندان کے خلاف تحریریں آنے لگیں، تو اس سے وابستہ تمام افراد کا پریشان ہونا قدرتی امر تھا۔ میڈیا مخالف مہم نہ صرف ان کے کاروبار کو نقصان پہنچاتی بلکہ ملک میں اثر و رسوخ بھی کم کر سکتی تھی۔ گپتا برادران نے اپنے دوست احباب سے مشورہ کیا۔ تبھی یہ تصور سامنے آیا کہ کسی اچھی کمپنی کی وساطت سے گپتا خاندان کی مخالفت کرنے والے سبھی جنوبی افریقنوں کے خلاف جوابی پروپیگنڈا مہم چلائی جائے۔

یہ تجویز گپتا بھائیوں کو پسند آئی جن کا جھکاؤ شر کی جانب تھا۔ یہاں بھی کوئی اور نہیں، صدر زوما کے بیٹے اور کاروباری رفیق، دودوزین کی وساطت سے بیل پوٹنگر (Bell pottinger) کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔

بیل پوٹنگر برطانیہ میں تعلقات عامہ سے متعلق مشاورت (Public Relation Consultancy) کی سب سے بڑی کمپنی تھی۔ یہ کمپنی سابق برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کے میڈیا مشیر، لارڈ بیل نے سرمایہ کاروں کی مدد سے قائم کی تھی۔ یہ کمپنی گاہکوں کو لابنگ، مضامین لکھنے، اثر و رسوخ بڑھانے، مقام و مرتبے میں اضافہ کرنے وغیرہ کی خدمات فراہم کرتی تھی۔

گپتا برادران کی ایما پر بیل پوٹنگر کے کارندے ان کے مخالف صحافیوں، سیاست دانوں اور ارکان سول سوسائٹی کے خلاف زوردار مہم چلانے لگے۔ گپتا بھائیوں کے حامی اخبارات میں ان کی کردار کشی کرنے والی تحریریں چھاپی گئیں۔ ٹی وی نیٹ ورکس سے ان کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹی خبریں پھیلائی گئیں۔

پیسے دے کر لوگ اکٹھے کیے گئے جنھوں نے گپتا

خاندان کے مخالف صحافیوں، سیاسی راہنماؤں وغیرہ کے خلاف مظاہرے کیے۔ ٹویٹر اور فیس بک میں بھی ان کو بدنام کرنے کی خاطر پروپیگنڈا مہم چلائی گئی۔ حتیٰ کہ انٹرنیٹ انسائیکلوپیڈیا ''وکی پیڈیا'' میں صفحات ایڈٹ کیے گئے تاکہ گپتا برادران کے مخالفین کی جگ ہنسائی ہو سکے۔

خواتین صحافیوں کو جنسی طور پر ہراساں کیا گیا۔ بیل پوٹنگر نے WMC نامی ایک ویب سائٹ بھی بنائی جس پر جنوبی افریقین اخبارات کے ممتاز ایڈیٹروں کے خلاف بے سروپا تحریریں دی گئیں۔ جب کسی صحافی نے مخالفانہ مہم کا بھرپور جواب دیا، تو گپتا برادران نے اس کے گھر کے باہر مظاہرے کروا دیے۔

جنوبی افریقا کے مشہور اخبار، بزنس ڈے کا سابق ایڈیٹر اور کالم نگار، پیٹر وبروس گپتا خاندان کے جرائم افشا کرنے میں پیش پیش تھا۔ وہ بیل پوٹنگر کی سرکردگی میں جاری کردار کشی کی مہم کے متعلق کہتا ہے ''میری زندگی میں پہلے کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ حتیٰ کہ نامعلوم لوگوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہوں۔''

گپتا خاندان کی بنیادی خواہش یہ تھی کہ درج بالا مہم کے ذریعے عوام کی توجہ ان کے سیاہ کرتوتوں سے ہٹ جائے۔ اسی لیے اس مہم کا مرکزی نکتہ ''سفید اجارہ داری'' کی مخالفت کرنا تھا۔ یعنی گپتا خاندان نے اپنے میڈیا نیٹ ورکس اور بیل پوٹنگر مہم کے ذریعے جنوبی افریقا میں یہ تاثر پھیلا دیا کہ سفید فام امیر طبقہ غریب جنوبی افریقنوں پر ظلم وستم کر رہا ہے اور یہ کہ اس طبقے کی وجہ سے ہی جنوبی افریقا خوشحال اور ترقی یافتہ مملکت نہیں بن پایا۔

یہ مرکزی خیال آن لائن سوشل میڈیا کے ذریعے جنوبی افریقا میں وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا۔ گپتا خاندان کے حامی سیاست دانوں نے اسے اپنی تقاریر میں بھی بیان کیا جبکہ حامی اخبارات اور ٹی وی نیٹ ورکس سے بھی اس بے بنیاد تصور کی تشہیر واشاعت کی گئی۔ اس پروپیگنڈے کے ذریعے دعوی ہوا کہ گپتا خاندان اور زوما حکومت کو وہ لوگ بدنام کر رہے ہیں جو سفید فام طبقے کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں اور یہ طبقہ گپتا خاندان اور زوما حکومت کا خاتمہ چاہتا ہے۔

گپتا خاندان نے اپنا دامن صاف رکھنے کی خاطر اپنی دانست میں ترپ چال چلی تھی۔ وہ بیل پوٹنگر کو ماہانہ ''ایک لاکھ پونڈ'' معاوضہ دے رہے تھے تاکہ ان کی ساکھ بحال رہے مگر قدرت الٰہی ان کے سیاہ کارنامے افشا کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

سازش پکڑی گئی

مئی ۲۰۱۷ء میں گپتا کاروباری سلطنت ہی میں سے کسی نے گپتا برادران اور بیل پوٹنگر کے مابین ہوئی خفیہ ای میل مراسلت جنوبی افریقن میڈیا کو جاری کر دی۔ اس مراسلت نے جنوبی افریقا میں طوفان برپا کر دیا کیونکہ یہ صاف ظاہر تھا کہ گپتا بھائیوں نے اپنے مفادات پورے کرنے کی خاطر جنوبی افریقا میں سیاہ فاموں کو سفید فام طبقے کے خلاف بھڑکانے کی سازش کی ہے۔ وہ دونوں طبقوں کے درمیان نفرت بڑھا کر نسلی تصادم کروانا چاہتے تھے۔

اب گپتا خاندان پر چاروں طرف سے زبردست تنقید ہونے لگی۔ تھولی میڈونیلا جنوبی افریقا کی مشہور وکیل اور انسانی حقوق کی راہنما ہے۔ اس نے مملکت کا نیا آئین تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے گپتا خاندان اور بیل پوٹنگر کی پروپیگنڈا مہم کو ''خطرناک اور گندی چالوں والی مہم'' قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے:

''گپتا خاندان نے جنوبی افریقن عوام کے جذبات سے نہایت گھناؤنا کھیل کھیلا۔ وہ جانتے ہیں کہ سیاہ فام عوام کی اکثریت غریب اور دولت کی نامنصفانہ تقسیم کا شکار ہے۔ اسی لیے انہوں نے دانستہ کوشش کی کہ امیر سفید فاموں کے خلاف

عوام کے جذبات بھڑکا دیے جائیں۔ یہ معاشرے میں نفرت اور دشمنی بڑھانے والی نہایت زہریلی مہم تھی۔''

میکس ڈوپریز جنوبی افریقا کا مشہور صحافی ہے۔ وہ نسل پرست سفید فام حکمرانوں کے خلاف بہت سرگرم رہا تھا۔ اس نے بیان دیا کہ گپتا خاندان نے اپنی زہریلی نسل پرستانہ مہم کے ذریعے پرانے زخموں پہ پھر نمک چھڑک دیا ہے۔

پروفیسر جوناتھن جینسن جنوبی افریقا کی اکیڈیمی آف سائنس کا سربراہ ہے۔ یہ بھی زمانہ طالب علمی میں نسل پرستی کا پرچار رہا ہے۔ اس نے کہا ''جنوبی افریقا میں جمہوریت ابھی نوزائیدہ ہے۔ اُسے سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ ایسے میں گپتا خاندان کی مہم نے نہایت تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔''

اُدھر جنوبی افریقا اور برطانیہ میں بیل پوٹنگر کے خلاف تحقیقات ہونے لگیں۔ تفتیش کنندگان نے اُسے اصول و قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب پایا۔ چناں چہ کئی اعلیٰ عہدے دار کمپنی سے نکال دیے گئے جبکہ ستمبر ۲۰۱۷ء میں بیل پوٹنگر نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح گپتا خاندان جیسے دھوکے باز گاہک کو اپنا کر مشہور برطانوی کمپنی نے اپنی قبر اپنے ہی ہاتھوں سے کھودلی۔

وزرا کی گواہی

جب بیل پوٹنگر کی جھوٹی خبروں پر مشتمل مہم جاری تھی، تو جنوبی افریقا کے سیاست داں گپتا خاندان کے خلاف گواہیاں دینے لگے۔ انہوں نے یہ حقیقت اجاگر کی کہ صدر جیکب زوما کی قربت سے فائدہ اٹھا کر گپتا بھائی کابینہ میں شامل ہونے کی خاطر ارکان اسمبلی سے لین دین کرنے لگے تھے۔

افریقن نیشنل کانگریس کی سابق رکن اسمبلی، وٹجی منیئر نے انکشاف کیا کہ ۲۰۱۰ء میں گپتا برادران نے اُسے وزیر پبلک انٹرپرائزز بنوانے کی پیش کش کی تھی..... مگر اس شرط پر کہ وہ وزیر بنتے ہی جنوبی افریقا کی سرکاری ائیر لائن کی بھارت جانے والی تمام پروازیں ختم کر دیں گی۔ دراصل گپتا بھائی اپنی ائیر لائن (جیٹ ائیرویز) کی پروازیں اس روٹ

''مملکت پر قبضے'' والی اصطلاح کی ترجمانی کرتی تصویر

پر چلانا چاہتے تھے۔

بعد ازاں نائب وزیر خزانہ، مکبسی جوناس نے انکشاف کیا کہ دسمبر ۲۰۱۵ء میں گپتا بھائیوں نے اُسے وزیر خزانہ بنوانے کی پیش کش کی تھی۔ جوناس کا کہنا تھا: ''میں نے یہ پیش کش نامنظور کر دی کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ صرف صدر جنوبی افریقا ہی کو وزرا مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے مگر گپتا خاندان نے غیر قانونی حرکت کر کے ہماری نوزائیدہ جمہوریت کا مذاق اڑایا اور عوام کا اعتماد مجروح کیا''۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کرتوت

سیپ ایس ای (SAP SE) جرمنی کی مشہور ملٹی نیشنل سافٹ وئیر کمپنی ہے۔ یہ دیوہیکل کمپنیوں کے لیے خصوصی سافٹ وئیر بناتی ہے۔ جولائی ۲۰۱۷ء میں انکشاف ہوا کہ سیپ نے ۲۰۱۵ء میں ٹرانزنیٹ کمپنی کا ایک بڑا معاہدہ حاصل کرنے کی خاطر ایک چھوٹی سی پرنٹنگ کمپنی، کیڈ ہاؤس کو ۷۸ لاکھ ڈالر کی رشوت دی تھی۔

ٹرانزنیٹ جنوبی افریقا میں ریلوے اور شپنگ کی سب سے بڑی سرکاری کمپنی ہے اور اس کا بظاہر کیڈ ہاؤس سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ مگر کیڈ ہاؤس گپتا خاندان اور صدر جیکب زوما کے بیٹے کی ملکیتی کمپنی ہے۔ جو یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ گپتا خاندان اور صدر کے بیٹے نے پُرکشش سرکاری منصوبہ جرمن کمپنی کو دینے کی خاطر اس سے بھاری رشوت لی۔

یہ اسکینڈل سامنے آنے کے بعد سیپ ایس ای کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچا۔ جرمن کمپنی نے گاہکوں کا اعتماد بحال رکھنے کی خاطر جنوبی افریقا میں اپنے دفتر سے سبھی افسران کو نکال باہر کیا نیز براعظم افریقا کا مقامی سربراہ بھی تبدیل کر دیا۔

ہالینڈ میں صدر دفتر رکھنے والی کمپنی، کے پی ایم جی (KPMG) پوری دنیا میں کمپنیوں کو فنانشل آڈٹ، ٹیکس اور ایڈوائزری خدمات فراہم کرنے والی بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ اس کے دنیا بھر میں دفاتر ہیں جن میں پونے دو لاکھ افراد کام کرتے ہیں۔

کے پی ایم جی جنوبی افریقا اس افریقی مملکت میں سب سے بڑی آڈٹ کمپنی تھی۔ تمام بڑی نجی اور سرکاری کمپنیاں اسی

جنوبی افریقن عوام اٹول گپتا اور اپنے صدر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے

سے آڈٹ کرواتی تھیں مگر جولائی ۲۰۱۷ء میں انکشاف ہوا کہ کے پی ایم جی جنوبی افریقا گپتا خاندان کی کمپنیوں کا آڈٹ کرتے ہوئے ان کی کرپشن پوشیدہ رکھتی رہی۔ یوں وہ گپتا خاندان کی کرپشن میں ان کی ساتھی بن گئی۔

جب یہ انکشاف ہوا، تو کے پی ایم جی کی ساکھ کو زبردست دھچکا لگا۔ تاحال جنوبی افریقا میں بہت سی سرکاری و نجی کمپنیاں کے پی ایم جی سے دامن چھڑا چکیں۔ کے پی ایم جی نے بھی اپنی ساکھ بچانے کے لیے جنوبی افریقا میں اپنے تمام بڑے عہدے دار فارغ کر دیے مگر جنوبی افریقا ہی نہیں دیگر ممالک میں بھی کمپنی کا اعتماد سخت مجروح ہوا ہے۔

ستمبر ۲۰۱۷ء میں گپتا خاندان کی نحوست نے خدمات فراہم کرنے والی ایک اور ملٹی نیشنل کمپنی، میکنزی اینڈ کمپنی (McKinsey and Company) کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ امریکی کمپنی دنیا بھر میں مینجمنٹ کنسلٹنگ کی لیڈر اور سب سے بڑی کمپنی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے دنیا بھر میں دفاتر ہیں جن میں چودہ ہزار لوگ کام کرتے ہیں۔

انکشاف یہ ہوا کہ میکنزی اینڈ کمپنی نے جنوبی افریقا میں سب سے بڑی سرکاری الیکٹرک کمپنی، اسیکوم کا ایک بڑا مالی معاہدہ حاصل کرنے کی خاطر ٹراسین کمپنی کو بھاری رشوت دی تھی۔ یہ ٹراسین کمپنی گپتا خاندان کی ملکیت ہے۔ یہ انکشاف ہوتے ہی میکنزی اینڈ کمپنی کے صدر دفتر میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ کمپنی کے مالکان نے جنوبی افریقا میں موجود اپنا سارا عملہ فارغ کر دیا۔

عوام کا غم و غصہ

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ گپتا خاندان نے انتہائی عیاری و مکاری سے اچھی ساکھ رکھنے والی بہت بڑی عالمی کمپنیوں کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا۔ گپتا خاندان پھر ان کے تعاون سے سرکاری اداروں میں بڑے نظم و ضبط سے کرپشن کرنے لگا۔ ممکن ہے کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکان اور ڈائریکٹر اس امر سے ناواقف ہوں کہ جنوبی افریقا میں ان کے مقامی دفاتر گپتا خاندان کی کرپشن کا اڈہ بن چکے مگر یہ ان کا فرض بنتا تھا کہ مقامی دفاتر کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے۔ ان کی نااہلی اور بے پروائی کے باعث ہی نیک نام کمپنیوں کے دامن پر رسوائی کا دھبہ لگ گیا۔

جنوبی افریقا میں گپتا خاندان کی کرپشن افشا کرنے والے پے در پے اسکینڈل سامنے آئے تو قدرتی طور پر عوام کا غم و غصہ انتہا پر جا پہنچا۔ حتیٰ کہ صدر جیکب زوما اور ان کی آل اولاد نے بھی گپتا خاندان سے ظاہری طور پر ہی، تمام تعلقات توڑ لیے۔ جنوبی افریقا کے تمام اہم بینکوں نے گپتا خاندان کی کمپنیوں سے لین دین کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہے، گپتا خاندان اب ایک ایک کر کے اپنی تمام کمپنیاں فروخت کر رہا ہے۔

جنوبی افریقن میڈیا کا دعویٰ ہے کہ عنقریب گپتا خاندان مملکت کو خیرباد کہہ کر بھارت واپس چلا جائے گا مگر یہ حقیقت ہے کہ اپنے فراڈ، دھوکے بازیوں اور عیاری کے باعث گپتا خاندان نے اپنا ہی نہیں کم از کم جنوبی افریقا میں ہندو قوم اور بھارت کا نام بھی خاصا بدنام کر دیا۔ اب جنوبی افریقا میں عوام و خواص ہندوؤں خصوصاً بھارتیوں سے معاملات طے کرتے ہوئے بہت چوکنا رہتے ہیں۔ گپتا برادران کو اپنے گاندھی کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے تھا:

''زمین ہر انسان کو اتنا کچھ عطا کرتی ہے کہ اس کی ضروریات پوری ہو سکیں مگر وہ ایک لالچی اور ہوس پرست انسان کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں کر سکتی۔''

اہل پاکستان کو گپتا خاندان کا عبرت ناک زوال اور ان کی حیرت انگیز داستان یہ سبق دیتی ہے کہ وہ بیرون ممالک خصوصاً ہر قسم کی کرپشن اور غلط حرکتوں سے دور رہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ بیرون ممالک ان کی ہی نہیں ملک و قوم کی عزت بھی ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ایک کرپٹ پاکستانی کی بدحرکت تمام پاکستانیوں کے لیے باعث شرم بن جاتی ہے۔ ◆◆◆

القرآن الکریم کی برکت

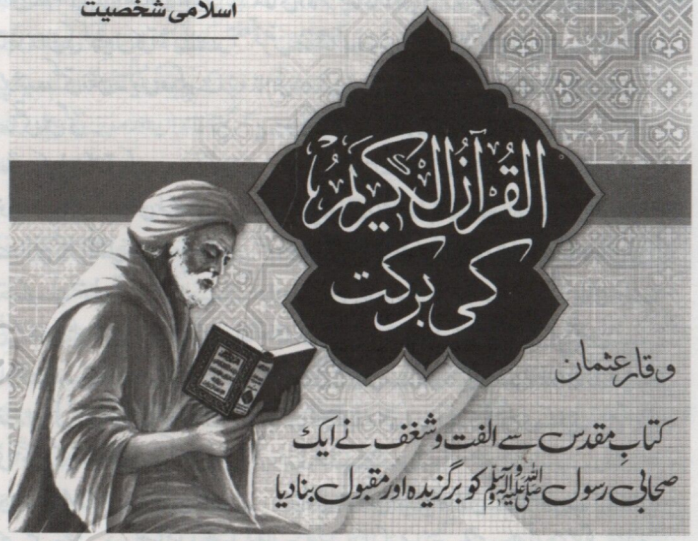

وقار عثمان

کتابِ مقدس سے الفت و شغف نے ایک صحابی رسول ﷺ کو برگزیدہ اور مقبول بنا دیا

مدینے کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا اسلم غلام پسینے سے شرابور تھا۔ سورج کی شعاعوں نے اس کی جلد کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ رنگ کالا ہو چکا تھا۔ کمزور اتنا جیسے ہڈیوں کا ڈھانچا ہو۔ نہ خوش شکل تھا نہ عقل تھی۔ اسے ایک یہودی، سلام بن جبیر نے شام سے تجارتی سامان خریدتے وقت خریدا، تاکہ اس سے نفع مل سکے لیکن خرید کر پچھتا رہا تھا کہ کوئی اس کا خریدار نہیں۔ غصے میں اسے دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ سائے میں بھی جانے نہ دیتا، کیوں کہ تین دن میں اس کا سب سامان بک چکا تھا۔ اب وہ غلام کی وجہ سے بیٹھا تھا۔ ہر کوئی غلام کی اس حالت پر ترس کھاتا، لیکن خریدتا کوئی نہ تھا۔

ایک جوان العمر لڑکی جس کا نام شبیتہ تھا، مدینے میں رہتی تھی۔ اس نے دو دن سے غلام کو دھوپ میں کھڑا دیکھا تو ترس کھاتے ہوئے اس کے مالک کے پاس گئی۔ اس سے کہا:

''تم اس غلام کو کتنے میں بیچو گے؟''

مالک نے کہا: ''جتنے کا خریدا ہے، اتنی ہی رقم دے دو۔ میں تو اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں''۔ شبیتہ نے رقم دے کر اسے لے لیا۔ اب یہ نوجوان شبیتہ کا غلام بن گیا۔

ایک دن ایک عرب تاجر مکہ سے شام آیا اور سامان لے کر لوٹتے ہوئے مدینہ ٹھہرا۔ اسے کسی نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک رحم دل لڑکی ہے جس نے ترس کھا کر غلام کو خریدا ہے۔ وہ اس بات سے بہت متاثر ہوا اور اس کے گھر نکاح کا پیغام بھیجا۔ والد کو رشتہ پسند آیا۔ بیٹی کا اس سے نکاح کر دیا۔ اس عرب تاجر کا نام ابو حذیفہؓ تھا۔ وہ کچھ دن وہاں ٹھہرا، پھر بیوی شبیتہ کو لے کر مکہ چلا۔ سالم چونکہ شبیتہ کا غلام تھا، اس لیے یہ بھی ساتھ چل پڑا۔

مکہ پہنچ کر ابو حذیفہؓ نے ایک بات محسوس کی۔ ان کے دوستوں میں ایک عثمان بن عفانؓ بھی تھے۔ جب وہ ان سے ملتے تو بڑی سرد مہری سے! ابو حذیفہؓ بہت پریشان ہوئے اور پوچھا:

''عثمان کیا بات ہے؟ اتنی سرد مہری کیوں؟'' حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

''میں اب کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکا ہوں۔ تم ابھی مسلمان نہیں ہوئے۔ ہماری دوستی کیسے آگے چلے گی؟''

انہوں نے کہا:

مجھے نبی ﷺ کی خدمت میں لے چلیں۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن پاک کی تلاوت کی۔ ابو حذیفہؓ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ گھر آ کر بیوی کو بتایا تو وہ بھی

مسلمان ہو گئی۔ جب غلام نے سنا تو اس نے بھی کلمہ پڑھ لیا۔

ایک روز نبی کریم ﷺ نے خواتین کی محفل میں وعظ فرماتے ہوئے غلام کو آزاد کرنے کا اجر بتایا۔ شبیتہ گھر آئی، غلام سے کہا:

''سالم تم میری جانب سے آزاد ہو''۔

یہ سن کر سالم رونے لگے اور کہا ''یہاں میرا کوئی نہیں، میں پردیسی ہوں۔ آپ مجھے چھوڑ دیں گی تو میرا کیا بنے گا؟''

ابو حذیفہؓ نے کہا: ''کوئی بات نہیں، میں تمہیں اپنا بیٹا بنا لیتا ہوں''۔ اس طرح ابو حذیفہؓ نے انہیں اپنے سگے بیٹے کی طرح پالا پوسا۔ پھر اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید بن عتبہؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ اس لیے آپؓ کو سالم بن ابو حذیفہؓ کہا جانے لگا۔ پھر سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر پانچ میں اللہ نے حکم دیا:

''لے پالکوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو''۔

اس حکم کے بعد ان کا نام سالم بن ابو حذیفہؓ کے بجائے، سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ ہو گیا۔ آپؓ اسلام لانے کے وقت نوجوان تھے۔ اسلام لانے کے بعد آپؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قرآن سیکھنا شروع کر دیا۔ آپؓ نے قرآن سیکھنے میں ایسی محنت کی کہ عجمی ہونے کے باوجود قرآن کریم کی تلاوت ایسے کیا کرتے تھے جیسے عربی ہوں۔

حضرت سالمؓ اتنا خوب صورت قرآن پڑھنے لگے کہ ایک بار ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کسی کام کے لیے بازار سے گزر رہی تھیں۔ اچانک ان کے کانوں میں ایک خوبصورت آواز پڑی۔ آپؓ اس آواز کو سن کر رک گئیں۔ کوئی قاری بہت ہی خوبصورت آواز میں تلاوت قرآن کر رہا تھا۔ آپؓ نے تلاوت کا کچھ حصہ سنا اور پھر اپنی ضرورت پوری کر کے گھر چلی گئیں:

''عائشہ! کیا بات ہے، تمہیں گھر آنے میں دیر کیوں ہو گئی؟'' عائشہ صدیقہؓ گھر پہنچیں، تو حضور ﷺ نے ان سے دیر سے گھر آنے کے متعلق سوال کیا۔

''یا رسول اللہ ﷺ! باہر ایک قاری قرآن پڑھ رہا ہے۔'' عائشہ صدیقہؓ نے جواب دیا۔ پھر انہوں نے اس قاری کی آواز کی خوبصورتی کو بیان کیا، اور قرآن کی تلاوت کی تعریف بیان کی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی ایک قاری قرآن کی تعریف سن کر نبی کریم ﷺ نے اپنی چادر اٹھا کر لپیٹی اور انسانی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ دیکھنے نکلے کہ وہ قاری کون ہے؟ جس کی تلاوت قرآن کی تعریف عائشہ صدیقہؓ نے کی۔ باہر نکل کر آپ ﷺ نے تلاش کیا تو دیکھا کہ ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے تلاوت سن رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر دیکھا تو تلاوت کرنے والے قاری قرآن حضرت ابو عبداللہ سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ تھے۔

آپ ﷺ نے انہیں پڑھتے ہوئے سنا تو خوش ہو کر فرط جذبات سے فرمایا:

''سب تعریفیں اس ذات کی ہیں جس نے میری امت میں ایسے قرآن پڑھنے والے پیدا فرمائے''۔

سالمؓ کا شمار ان چار چوٹی کے قراء کرام میں ہوتا ہے، جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن سیکھنا ہے تو ان سے سیکھو۔

جب مدینہ ہجرت ہوئی تو چند صحابہؓ پہلے پہنچے، ان میں حضرت عمرؓ اور سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ بھی شامل تھے۔ اس موقع پر امامت کے لیے لوگوں نے سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ کو چن لیا۔ یہ نماز کی امامت کرنے لگے اور مقتدیوں میں عمر بن خطابؓ اور ابو سلمہ بن عبدالاسدؓ جیسے جید صحابہ کرام بھی شامل تھے۔ مدینے کے یہودیوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کی کوئی قدر نہیں تھی اور اسے کوئی خریدنے والا نہیں تھا۔

قرآن پاک کے اعجاز نے سالم کو فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا۔

آپؓ قاری قرآن، عابد، زاہد، عالم دین اور سخی ہی نہیں بلکہ بہترین مجاہد بھی تھے۔ آپؓ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر کئی غزوات میں شرکت کی اور میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھائے۔

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں نبوت کے جھوٹے دعویدار مسیلمہ کذاب کے خلاف

لڑی جانے والی جنگ یمامہ میں بھی آپؓ نے اپنے منہ بولے والد ابو حذیفہؓ کے ساتھ مل کر شرکت کی۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے اپنا جھنڈا سالمؓ کے ہاتھ میں دیا اور کہا:

''سالمؓ! تم مسلمانوں کے علم (جھنڈے) کی حفاظت کرو۔''

حضرت سالمؓ نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول کیا اور علم کی حفاظت کرتے ہوئے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے لگے۔ ایسے میں چند مسلمانوں نے ان کے ہاتھ میں علم دیکھ کر اعتراض کیا۔ ایک شخص نے کہا: ''(سالمؓ)! ہمیں تمہاری طرف سے اندیشہ ہے۔ تم اس علم کی حفاظت ٹھیک سے نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم یہ علم کسی دوسرے شخص کو دے دو۔''

سالمؓ نے اس شخص کی بات سن کر جوش سے جواب دیا: ''اگر میں نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مسلمانوں کا علم بردار (جھنڈا اٹھانے والا) ثابت نہیں کیا، تو میں بہت ہی برا حافظ قرآن ہوں گا۔'' اس سے پہلے کہ اعتراض کرنے والا کوئی جواب دیتا، مسلمانوں پر مرتدوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ کچھ مسلمان زوردار حملے کے باعث پیچھے ہٹنے لگے۔ ایسے میں ایک زوردار آواز میدان جنگ میں گونجی:

''مسلمانو! کہاں بھاگ کر جا رہے ہو؟ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تو ہم اس طرح نہیں لڑتے تھے۔'' لوگوں نے پلٹ کر دیکھا تو یہ الفاظ کہنے والے کوئی اور نہیں سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ تھے۔ انھوں نے اپنے قدموں کو ڈگمگانے اور پیچھے ہٹنے سے بچانے کے لیے میدان جنگ میں ایک گڑھا کھود کر، اپنے پاؤں اس گڑھے میں رکھ کر مٹی سے دھنسا دیے۔ ان کی للکار سن کر اور انھیں اس طرح بلاخوف وخطر کھڑے دیکھ کر دوسرے مسلمانوں کا بھی حوصلہ بلند ہوا۔ وہ ہمت کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے واپس مڑے۔

مرتدوں کا ایک زبردست ریلا سالمؓ کو اکیلے زمین میں پاؤں دھنسائے کھڑے دیکھ کر ان کی طرف بڑھا، تاکہ انھیں شہید کر کے مسلمانوں کا علم گرا دیں۔ علم کے گرنے سے مسلمانوں کو کھلی شکست ہو جاتی۔ تب سالمؓ نے اکیلے ہی ان سے زبردست جنگ کی اور کشتوں کے پشتے لگا دیے، مگر ریلا کافی بڑا تھا۔ سالمؓ کا اس کو تنہا سنبھالنا ناممکن تھا۔ اس کے باوجود وہ ڈٹ کر کھڑے تھے۔ کسی مرتد نے علم گرانے کے لیے ان کا ہاتھ کاٹ دیا۔ ہاتھ کٹ کر گر ہی رہا تھا کہ سالمؓ نے اپنے درد کی پروا کیے بغیر علم کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا جبکہ پہلے ہاتھ سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ اس بدبخت نے جب ان کی یہ ہمت دیکھی تو بزدلوں کی طرح سالمؓ کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ دوسرا ہاتھ نیچے گر ہی رہا تھا کہ سالمؓ نے بجلی کی سرعت سے علم کو اپنی گردن اور کندھے سے ملا کر پکڑ لیا۔ بدبخت نے ان کے دونوں ہاتھ تو کاٹ دیے تھے مگر وہ ان کی ہمت کو کافور نہ کر سکا۔ آپؓ اس وقت سورۃ آل عمران کی آیت ۱۴۴ تا ۱۴۶ تلاوت فرما رہے تھے۔

حضرت سالمؓ کے پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے تھے۔ اس لیے علم کو گرانا بہت ہی مشکل کام تھا۔ آخر بزدل مرتدوں نے آپؓ کو نیزوں اور تلواروں سے چھلنی کر دیا۔ خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے آپؓ کمزوری کے باعث گر گئے۔ تب تک مسلمان مجاہد واپس پلٹ چکے تھے۔ ان کا حملہ دیکھ کر مرتد پیچھے ہٹ گئے۔

نزع کے عالم میں انھوں نے مسلمانوں سے پوچھا: ''ابو حذیفہؓ کا کیا حال ہے؟'' انھیں جواب دیا گیا: ''وہ اللہ کے راستے میں شہید ہو چکے ہیں۔'' اب انھوں نے پوچھا: ''وہ مجاہد کہاں ہے؟ جس نے مجھ پر علم کے معاملے میں اعتراض کیا تھا۔''

لوگوں نے جواب دیا: ''وہ بھی شہید ہو چکے ہیں۔''

''مجھے اس مجاہد اور ابو حذیفہؓ کے درمیان میں دفن کرنا۔''

حضرت سالمؓ نے وصیت فرمائی۔ اس کے بعد آپؓ کی روح پرواز کر گئی۔ شہادت کے وقت سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ کی عمر ۵۴ سال تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپؓ شہید ہوئے تو آپؓ کا سر ابو حذیفہؓ کے قدموں میں تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ابو حذیفہؓ کا سر آپؓ کے قدموں میں تھا۔ ◆◆◆

زندگی حسین ہے، اسے منفی سوچوں سے ضرر رساں مت بنائیے

سعدیہ جبار

انسان کو نعمتوں کی قدر اس وقت آتی ہے جب وہ چھن جائیں۔ لمبے بال، خوبصورت سراپا اور صحت و تندرستی لگتا ہے ہمارا حق تھا اور ہے۔ سہولتیں اور نعمتیں پانا ہم اپنا پیدائشی حق سمجھتے اور اس پر اتراتے بھی ہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ سب چیزیں تو فانی ہے۔

دو سال قبل اچانک میری بائیں بغل میں ایک چھوٹا سا دانہ ہو گیا۔ میں نے اُس کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور نہ ہی کوئی دوا لی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دانہ ختم ہو گیا مگر دو مہینے گزرنے کے بعد دوبارہ اسی جگہ پر ہلکا سا درد رہنے لگا۔ گھر کے ڈاکٹروں سے رائے لی تو انھوں نے ایک درد کم کرنے والی گولی تجویز کر دی۔

ہفتہ گزرنے کے بعد احساس ہوا کہ کسی خاتون ڈاکٹر سے معائنہ کروا لینا چاہیے۔ معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ تجویز کیے اور کہا کہ شوکت خانم اسپتال سے کروا لوں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں لاہور گئی اور ٹیسٹ کروا لیے مگر جب رپورٹس ملیں تو جان ہی نکل گئی۔ کینسر کا سنا تو تھا مگر یہ نہیں پتا تھا کہ میں خود بھی اس موذی مرض کا شکار ہو چکی۔ لگا کہ زندگی ختم ہو گئی ہے اور اب صرف موت سامنے ہے۔

جب خاندان والوں کو پتا چلا تو انھوں نے بہت حوصلہ دیا اور علاج شروع کرنے کے لیے مجھ پر زور ڈالا۔ میں دوبارہ شوکت خانم اسپتال گئی۔ ڈاکٹروں سے ملی۔ مرض کی نوعیت کے بارے میں جاننا چاہا۔ انٹرنیٹ کھنگال ڈالا۔ خوب تحقیق کی اور پھر اللہ عزوجل تعالیٰ کا نام لے کر فیصلہ کیا کہ مجھے علاج کروا لینا

چاہیے۔ علاج کروانا سنت نبوی ﷺ بھی ہے۔

ڈاکٹر نے سب سے پہلے کیموتھراپی تجویز کی کیونکہ میرا کینسر تیسری سٹیج کا تھا۔ ڈاکٹر چاہ رہے تھے کہ سب سے پہلے مرض کو پھیلنے سے روکنا ضروری ہے پھر سرجری کا فیصلہ کریں گے۔ کیموتھراپی ایک صبر آزما اور تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ اتنا تکلیف دہ ہوگا اور مجھے اس کے نتائج ساری عمر بھگتنا ہوں گے۔

پہلے ٹیکے کے بعد تو کچھ خاص مسئلے نہ ہوئے مگر دوسرے کے بعد طبیعت بوجھل رہنے لگی اور ہر چیز کی خوشبو یا بدبو انتہائی ناگوار لگتی۔ کیموتھراپی کی تیسری خوراک نے تو بدحال کر دیا۔ ایک دن جب میں نہا کر نکلی تو اپنے بالوں کو تولیے میں لپیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اُن میں کنگھی کرنے لگی تو وہ گچھوں کی صورت ہاتھ میں آنے لگے۔ میں نے آہستہ آہستہ بالوں کو سلجھانا چاہا مگر آدھے سے زیادہ سر خالی ہوگیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سارا سر خالی ہوگیا۔ آہستہ آہستہ بھنویں اور پلکیں بھی گرنے لگیں۔ آنکھیں ویران اور رنگت عجیب سی مٹیالی ہوگئی۔

اللہ رب العزت بڑا رحیم ہے۔ اس نے مجھے ان حالات میں بھی حوصلہ عطا کر دیا۔ میں اپنے گنجے سر اور ویران چہرے کے ساتھ بھی گھومتی پھرتی اور دنیا کا سامنا کرتی رہی۔ کئی دفعہ بس کے ٹرمینل پر بیٹھے، بازار میں گھومتے اور صبح کی سیر کرتے ہوئے مجھے لوگوں کی تمسخر آمیز نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی دفعہ میری ہمت ٹوٹی، کئی دفعہ مایوسی کا شکار ہوئی مگر مجھے لڑنا تھا، جینا تھا اور اپنے بچوں کو حوصلہ دینا تھا۔

ان حالات سے دوچار ہو کر ہی میں نے جانا کہ ہر چیز فانی ہے۔ صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ذات دائمی ہے۔ یہ نعمتیں، یہ آسائشیں سب کچھ عارضی ہیں۔ رب جب چاہے چھین لے اور جب چاہے ان سے نواز دے۔ کسی کے گنجے سر کو دیکھ کر اس کا مذاق نہ اڑائیے۔ کسی کے موٹاپے یا دبلے پن سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ نہ جانے کون اپنے اندر کیسی جنگ لڑ رہا ہے۔

نعمتوں کی قدر کریں۔ لوگوں سے پیار کیجیے اور ہر نئے دن اپنے رب کا شکر ادا کریں۔ جئیں اور جینے دیں۔ کوئی ہم مریضوں سے پوچھے کہ زندگی کا حسن کیا ہے۔ جسمانی اعضاء کی اہمیت کیا ہے۔ کھانا پینا اور چلنا پھرنا کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' کا مطلب اسپتالوں میں لیٹے لاچار مریضوں سے پوچھیں۔ وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کا بتائیں گے جنھیں پانے کے لیے وہ روز ترستے ہیں۔

دنیا بہت ظالم ہے تو دوسری طرف انتہائی مددگار اور مہربان بھی۔ لوگ دانستہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی کی بھی تکلیف میں اُس کے کام آئیں۔ تکلیف رفع کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ میں نے اپنی بیماری اور علاج کے دوران زیادہ تر لوگوں کو معاون ہی پایا۔ اگرچہ کچھ کوتاہ نظر لوگوں نے میری ظاہری حالت کا مذاق بھی بنایا اور مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ میں کتنی بدصورت ہو چکی۔

اس تحریر کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ خدارا مرتے ہوئے انسان کو وقت سے پہلے نہ ماریے۔ اگر آپ کسی کو حوصلہ دینے کا باعث نہیں بن سکتے تو اُس کی دل آزاری بھی نہ کریں۔ ایک بیمار شخص ذہنی اور جسمانی ہر لحاظ سے کمزور ہوتا ہے اور ایسا انسان منفی سوچوں میں گھرا ہوتا ہے۔ اُسے اور کم حوصلہ نہ بنائیں۔ خاموش رہیں یا اُسے مثبت اور حوصلہ افزا سوچ دیں۔ زندگی حسین ہے، اسے حسین تر بنائیے۔

شہنشاہ جہانگیر کا لالچ

حبیب اشرف صبوحی

عدل وانصاف کی اہمیت اُجاگر کرنے والا یادگار واقعہ

مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:

''ایک بادشاہ شکار کھیلنے اپنے محل سے نکلا۔ اُس کا محافظ دستہ اور تمام نوکر چاکر بھی اس کے ساتھ تھے۔ سلطان جنگل میں پہنچا تو اُسے ایک ہرن نظر آیا۔ سلطان نے گھوڑا اس کے پیچھے دوڑایا اور اس کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا۔ آخر ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا نظروں سے غائب ہوگیا۔

اس دوران سلطان بھی اپنے محافظ دستے سے بچھڑ گیا۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ سلطان کو پیاس نے ستایا۔ دور دور نظر دوڑائی لیکن کہیں پانی کا نشان نظر نہ آیا۔ اس پریشانی میں ایک باغ کے دروازے پر جا پہنچا۔ وہاں ایک بوڑھا باغبان کھڑا تھا۔ سلطان نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ''بابا جی! کیا اس باغ میں انار ہے؟''

باغبان بولا ''الحمدللہ! آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی آپ کے لیے انار کا رس منگواتا ہوں۔''

یہ کہہ کر باغبان نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ آواز سنتے ہی پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی نمودار ہوئی جو صورت کے جمال اور سیرت کے حسن سے آراستہ تھی۔ باغبان نے اُسے مخاطب کر کے کہا ''بیٹی! شدت کی گرمی میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس اس مہمان کو بھیجا ہے۔ اس کے لیے ایک پیالہ انار کا رس لے آؤ۔''

لڑکی گئی اور چند لمحوں میں ایک پیالہ لے آئی۔ پیالے کے اوپر انار کی کچھ پتیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ سلطان نے اس سے پیالہ لیا اور منہ سے لگایا لیکن انار کی پتیوں کے باعث وہ جلدی جلدی رس نہ پی سکا۔ رس پینے کے بعد اس نے باغبان کی لڑکی سے پوچھا ''تم نے پیالے میں رس کے اوپر یہ پتیاں

کیوں رکھ دی تھیں؟"

لڑکی کی اداؤں میں جس قدر دلکشی تھی، زبان بھی اسی قدر شیریں اور فصیح تھی۔ اُس نے کہا:

"حشر کی اس گرمی میں آپ جب یہاں آئے تو پسینے میں شرابور تھے۔ اس وقت انار کے رس کا ایک سانس میں پی جانا آپ کے لیے نہایت نقصان دہ ہوتا۔ اس سے معدہ اور اعصاب، دونوں متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ میں نے احتیاطاً پتیاں اس لیے ڈال دی تھیں کہ آپ اسے آہستہ آہستہ نوشِ جاں فرمائیں۔

سلطان کو یہ حسنِ ادا بہت پسند آئی۔ اس کے جی میں آیا کہ باغبان کی یہ لڑکی تو اس کے محل میں رہنے کے قابل ہے۔ لڑکی پیالہ لے کر واپس گئی تو سلطان نے باغبان سے پوچھا "تم کو اس باغ سے ہر سال کیا حاصل ہوتا ہے؟"

باغبان بولا "یہی تین سو دینار۔"

سلطان نے پوچھا "شاہی دیوان کو کیا دیتے ہو؟"

باغبان نے کہا کہ ہمارے بادشاہ نے پھل دار درختوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ وہ صرف کھیتی سے عُشر لیتا ہے۔ یہ سن کر سلطان کے دل میں خیال آیا کہ میری مملکت میں بہت سے باغات اور درخت ہیں۔ اگر تمام باغات پر ٹیکس لگا دیا جائے تو اس سے شاہی خزانے میں بہت سارے روپے جمع ہو جائیں گے اور رعیت کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے محل میں جا کر پہلا حکم یہی دوں گا کہ آئندہ باغات سے بھی ٹیکس وصول کیا جائے۔

یہی سوچتے ہوئے سلطان نے ایک بار پھر انار کا رس پینے کو مانگا۔ اس دفعہ لڑکی رس لانے کے لیے گئی تو بہت دیر میں آئی۔ سلطان نے پیالہ اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے پوچھا "تم پہلی بار گئی تھیں تو بہت جلد انار کا رس لے آئی تھیں۔ پیالہ بھی بھرا ہوا تھا لیکن اس مرتبہ بہت انتظار کے بعد آئیں اور رس بھی بہت کم لائیں۔ ایسا کیوں ہوا؟"

لڑکی بولی "پہلی بار ایک ہی انار سے پیالہ بھر گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے پانچ چھ انار نچوڑے۔ پھر بھی ان کے رس سے پیالہ نہیں بھرا۔"

یہ سن کر سلطان کو بہت حیرت ہوئی۔ پوچھا "اس کی کیا وجہ ہے؟"

بوڑھا باغبان جو دونوں کی باتیں سن رہا تھا، بولا "بات دراصل یہ ہے کہ رعایا کی آمدنی اور محصول کی برکت سلطان کی نیت پر منحصر ہوتی ہے۔ میرا خیال غلط نہیں تو آپ ضرور بادشاہ ہیں۔ آپ نے جس وقت باغ کی آمدنی مجھ سے پوچھی تو ضرور آپ کی نیت میں تبدیلی پیدا ہوئی جس سے پھل سے برکت چلی گئی۔"

یہ بات سُن کر بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ فوراً دل سے باغات پر ٹیکس لگانے کا خیال جھٹک دیا۔ پھر رس کا ایک پیالہ اور مانگا۔ لڑکی گئی اور جلد ہی پیالہ بھر کر انار کا رس لے آئی اور خوشی خوشی سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔

سلطان نے انار کا رس پی کر باغبان کی فراست کی بہت داد دی۔ پھر اپنے دل کی بات بتائی اور اپنے محل کی زینت کے لیے اس حور شمائل اور پری وش کا خواستگار ہوا۔

یہ قصہ بیان کرنے کے بعد شہنشاہ جہانگیر لکھتا ہے:

"یہ قصہ صفحہ روزگار کے لیے یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بادشاہ کی نیک نیتی پر ہی انصاف کے پھل کا دارومدار ہے۔ جب انصاف پسند سلاطین کی نیند اور کوششیں لوگوں کی آسودگی اور رعایا کی بہبود کے لیے وقف ہوں گی تو پھر زراعت اور باغات ہی نہیں بلکہ لوگوں کی روزمرہ آمدن میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ میری سلطنت میں کسی درخت سے کوئی ٹیکس وغیرہ وصول کرنے کا رواج نہیں۔ ایک حصہ بھی اس طرح کی آمدنی کا خزانے میں داخل نہیں کیا جاتا اور نہ دیوان لوگوں سے وصول کرتا ہے۔ میرے نزدیک یہ صریحاً ظلم ہے کہ رعایا پر خواہ مخواہ ٹیکس عائد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے اس نیاز مند کی نیت کو ہمیشہ بخیر رکھے۔" ♦♦♦

طلبہ کا بیت المال

معمولی سکّے ہزارہا بچے بچیوں کی قسمت بدل سکتے ہیں...
ایک صائب مشورے کا دلنواز قصہ

فیصل یعقوب عرب

"یہ لیجیے بھائی آپ کا سامان اور بقایا پیسے۔" نور چاچا نے سامان کا پیکٹ اور چند روپے نوجوان شخص کو تھماتے ہوئے کہا۔

"اس میں دو روپے کم ہیں۔" نوجوان نے روپے گنتے ہوئے کہا۔

"جی وہی دیکھ رہا تھا...... دراصل سکّے ختم ہو گئے ہیں...... آپ ایسا کیجیے یہ دو ٹافیاں رکھ لیجیے۔"

"ٹافیوں کو میں کیا کروں گا...... غور سے دیکھیے نکل آئیں گے پیسے۔"

"واقعی نہیں ہیں بھائی...... ہوتے تو دے نہ دیتا۔"

"ویسے یہ اچھا طریقہ نکالا ہے آپ ...لوگوں نے ٹافیاں بسکٹ بیچنے کا۔" نوجوان اب ذرا طیش میں آ گیا تھا۔

"بھائی مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں ...دو روپے سے کونسی اپنی بلڈنگ کھڑی کر لوں گا۔" ...ر چاچا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"قطرہ قطرہ ہی سمندر بنتا ہے چاچا۔۔۔" نوجوان کا انداز طنزیہ تھا۔ "سنا ہے شہر میں تعمیر ہونے والی ایک نامی گرامی بلڈنگ بھی لاکھوں لوگوں کے روپے دو روپے جوڑ کر ہی بنائی گئی ہے...... پھر موبائل سموں میں رہ جانے والے معمولی بیلنس کے غائب ہو جانے کا تجربہ بھی ہوا ہو گا آپ کو...... اور یہ جو بعض پیٹرول پمپس پر پیٹرول کی قیمت کو راؤنڈ آف کر کے ایک روپیا اضافی وصول کیا جاتا ہے یہ بھی آپ کے مشاہدے میں آیا ہو گا۔ اب لگا لیجیے حساب دن بھر میں کتنی گاڑیاں فیول اسٹیشن پر آتی ہیں۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔"

"بھائی یہ سب میں بھی جانتا ہوں لیکن میرے پاس سکّے نہیں ہیں ورنہ روپے دو روپے کی کیا اوقات ہے۔" نور چاچا نے دُہائی دی۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں چاچا۔ قطرے دو قطرے کی کوئی اوقات نہیں ہوتی لیکن یہی قطرے مل کے سمندر بنا دیتے ہیں...... رکھ لو یہ ٹافیاں میری طرف سے کسی بچے کو دے دینا۔"

ایک طرف نور چاچا کی دکان پر یہ بحث چل رہی تھی اور دوسری جانب وہاں سے بہت دور محلہ خیر آباد کے ایک تنگ و تاریک مکان میں مہرو اپنی آٹھ سالہ بچی کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"دیکھ عید آنے والی ہے۔۔ اچھی سلائی آ گئی تو تجھے خرید دوں گی۔"

"مگر میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔۔۔ سب بچے

میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہنستے ہیں میرے جوتے دیکھ کر۔“

مہرو نے ایک نظر دور پڑے اپنی لاڈلی کے جوتوں کی جانب دیکھا۔ جوتوں کی حالت واقعی نہایت خستہ تھی۔ چمڑا جگہ جگہ سے اُدھڑ چکا تھا، اصل رنگ کی پہچان ممکن نہیں تھی اور تلوا چمڑے کا ساتھ چھوڑنے پر تُلا ہوا تھا۔ شکوہ اور پھر فرمائش تو وہ پہلے بھی کر چکی تھی لیکن آج اس ننھی پری کا دل طنز کے نیزوں اور حقارت بھری نظر کے تیروں سے کچھ زیادہ ہی چھلنی تھا۔ آنسو تھے کہ ضبط کے تمام بندھن توڑ کر اُس کی آنکھوں سے بہے چلے جا رہے تھے۔

سال بھر پہلے اس گھرانے کے حالات ایسے نہ تھے۔ اچھا بھلا گزارہ ہو جاتا تھا۔ بلکہ مہرو اپنی کفایت شعاری کی بدولت ہر ماہ کچھ رقم پس انداز بھی کر لیتی تھی۔ مگر ایک دن فیکٹری میں لگنے والی آگ اس گھر کی ساری خوشیاں نگل گئی۔ رحیم بخش نکلا تو روزی کمانے کے لیے تھا لیکن وہ اپنے حصے کا رزق پورا کر چکا تھا لہٰذا واپس پلٹ کر گھر نہ آسکا اور پیچھے رہ گئیں صرف حسرتیں۔

جہاں دن میں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا غنیمت سمجھا جاتا ہو، وہاں بھلا جوتوں، کپڑوں، کتابوں اور کھلونوں کا کیا کام! یہ سب تو بھرے پیٹ کی باتیں ہیں، امیروں کے چونچلے ہیں مگر آج رحیم بخش کی لاڈلی انہی چونچلوں پر اتر آئی تھی۔ وہ بھول گئی کہ اس کی ماں نادار اور وہ یتیم ہے اور یتیموں کی کل کائنات اُن کا پیٹ ہوتا ہے۔

دیگچی سے ابلتے پانی کے گرنے کی آواز نے مہرو کے خیالات کو جھنجھوڑ دیا۔ ننھی گڑیا مسہری پر سو چکی تھی اور اندھیرے میں اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیر چمک رہی تھی۔

نوجوان منہ بسورتا ہوا دکان سے نکلا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ قریب ہی ایک سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ وہ نوجوان اور نور چاچا کے

ذرا سوچیے!

آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا دھیان اللہ کی طرف رہے تو دو باتوں کا خیال رکھیے:

اپنی دولت رب کی راہ میں خرچ کریں۔

دھیان...... رحمان کی طرف رہے۔

یہ تجربہ شدہ بات ہے، جدھر دھن ہو، دھیان اُدھر ہی جاتا ہے!

☆☆☆

آپ کے پاؤں میں جوتا نہ ہو..........

آپ کے پاس برتن نہ ہوں..........

آپ کے گھر کی صفائی کرنے والے نہ ہوں..........

آپ کے جسم پر کپڑے نہ ہوں..........

تو آپ کی شخصیت کیسی ہوگی ؟؟؟

آپ ان لوگوں کو، جو آپ کو پروقار، مختار (پسندیدہ) بناتے ہیں، ملنے جلنے والوں میں آپ کی عزت بڑھاتے ہیں، انھیں آپ موچی، کمہار، نوکر اور کاسی کہہ کر بلاتے ہیں......

واہ...... کیا کبھی محسنوں کا شکریہ ادا کیا؟

شاید نہیں! ذرا سوچیے، کیا اب بھی وقت نہیں آیا؟

درمیان ہونے والی گفتگو سن چکے تھے۔ نوجوان کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر نور چاچا کے قریب آئے اور اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے لگے ”غلط وہ نوجوان بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس نے ہوش سنبھالتے یہی سب کچھ دیکھا ہے۔ لیکن دیکھیے! ابھی جو کچھ ہوا اس میں ایک انتہائی اہم بات سامنے آئی ہے جس پر ہمیں ضرور غور کرنا چاہیے“۔

”ہم میں سے بعض لوگ اتنے لاپروا اور بے وقوف ہوتے ہیں کہ وہ روپے دو روپے کو معمولی رقم سمجھتے ہوئے انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اکثر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ زیادہ سامان کی خریداری کے بعد جو معمولی رقم بچ جائے

دکاندار واپس کرنا چاہے تو ان سے بے مقصد اور اناپ شناپ چیزیں خرید لی جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری جانب کچھ لوگ، چاہے مکاری اور بے ایمانی سے ہی سہی، انہی سکّوں کو ہزاروں لاکھوں سے ضرب دے کر محل بنا لیتے ہیں۔“

نور چاچا غور سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”دیکھیے نور چاچا! دنیا کے ہر کام میں خیر کا پہلو ہوتا ہے اور شر کا بھی۔ یہی معمولی اور بے قدر سکّے اگر برائی اور بددیانتی کے ہاتھوں ہزاروں لاکھوں روپوں میں ڈھل سکتے ہیں تو نیکی اور ایمانداری کے راستے سے گزر کر بھی یہ لاکھوں میں بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں تدریس کے شعبے سے وابستہ اور جانتا ہوں کہ بے شمار طلبہ ایسے ہیں جو مناسب رقم نہ ہونے کے باعث اپنا تعلیمی سفر جاری نہیں رکھ سکتے، کتنے ہی طلبہ ہیں جو فیس معاف کیے جانے کے باوجود کتابیں، بیگ، یونیفارم خریدنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔ نور چاچا ہم ان معمولی سکّوں سے کئی طالب علموں کی زندگیاں سنوار سکتے ہیں۔ جب ہمارے کام کے ثمرات دیگر لوگ دیکھیں گے تو وہ بھی اس نیک کام کا آغاز کر دیں گے۔ اس طرح ایک محلے سے دوسرے محلے، ایک قصبے سے دوسرے قصبے اور پھر شہر اور ملک بھر میں یہ نیک مقصد ایک فلاحی مہم اور ادارے کی شکل اختیار کرتا چلا جائے گا۔“

نور چاچا کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے ”مگر ہم چند لوگ اتنے معمولی پیسوں سے اتنے غریب اور نادار بچوں کے لیے بھلا کیا کر پائیں گے؟“

ہیڈ ماسٹر صاحب نے سمجھایا ”میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک شخص صبح تڑکے ساحل سمندر پر چہل قدمی کرنے گیا۔ چہل قدمی کرتے ہوئے اُسے دور ایک انسانی ہیولا سا نظر آیا۔ دور سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص ورزش یا پھر کوئی رقص کر رہا ہو۔ وہ شخص اُس ہیولے کی جانب بڑھنے لگا...... ساحل پر تاحدِ نظر ستارہ مچھلیاں (اسٹار فِش) بکھری پڑی تھیں جو شاید رات میں تند و تیز لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی کنارے پر آ گئی تھیں۔

قریب پہنچنے پر دیکھا کہ ایک شخص زمین پر جھکتا، ستارہ مچھلی کو ہاتھ میں اٹھاتا اور پوری طاقت سے سمندر کی جانب اچھال دیتا ہے۔ دوبارہ تیزی کے ساتھ زمین پر جھکتا اور پھر وہی عمل دہراتا ہے۔ چہل قدمی کرنے والا شخص اُس کے قریب گیا اور کہا ”بھائی کیوں اتنی محنت کر رہے ہو، تم ایک ایک مچھلی اٹھا کر سمندر میں پھینک رہے ہو جبکہ پورا ساحل ان مچھلیوں سے اٹا پڑا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں دھوپ بھی نکل آئے گی اور اس کی تپش سے یہ ہزاروں لاکھوں مچھلیاں مر جائیں گی۔ تمھارے اس طرح ایک ایک مچھلی اٹھا کر سمندر میں پھینکنے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟“

اُس شخص نے بات سنی، کوئی جواب دیے بغیر دوبارہ زمین پر جھکا، ستارہ مچھلی کو ہاتھ میں اٹھایا اور پوری طاقت سے سمندر کی طرف اچھال کر پانی میں گرتی ہوئی مچھلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا ”اِس کے لیے تو فرق پڑ گیا نا! اسے تو زندگی مل گئی۔“

”یاد رکھیے نور چاچا! نیکی کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ پیسا نہیں جذبوں کو دیکھتا ہے۔ نیکی کا پودا بنجر زمین پر بھی تناور اور پھل دار درخت ضرور بنتا ہے۔ جس کی چھاؤں میٹھی ہوتی ہے اور پھل بھی...... کیوں نہ اس نیک کام کا آغاز آپ کی دکان سے کیا جائے، اس یقین کے ساتھ کہ دیے سے دیا ضرور جلے گا۔“

چند گھنٹوں بعد نور چاچا کی دکان پر ایک بکس رکھا تھا جس پر یہ تحریر کندہ تھی:

”طلبہ کا بیت المال

بچے کھچے سکّوں کو معمولی مت جانیے۔ یہ بے شمار نادار اور مستحق طلبہ کے تعلیمی سفر کو آسان بنا سکتے ہیں“۔ ♦♦♦

فکاہیہ

صحیح ہے جناب!

جو آپ سے اختلاف ہی نہ کریں، ان کی قدر افزائی کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا؟

عطاء الحق قاسمی

گزشتہ روز ہم اپنے ایک دوست کے گھر گئے تو اس کی کوٹھی کا مرکزی دروازہ اندر سے مقفل تھا اور گھنٹی باہر نہیں، اندر گیراج کی دیوار کے ساتھ تھی۔ یہ مین گیٹ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے آسانی سے پھلانگ کر گھنٹی تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔ پہلے ہم نے سوچا کہ اپنے وسیع تجربے کو بروئے کار لائیں اور جب اس میں کامیاب ہوں تو یہ شعر پڑھیں۔

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا
جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

مگر پھر سوچا کہ ہر کام کے لیے ایک عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں اس قسم کے کاموں کا نتیجہ صرف ''چک'' کی صورت میں نکلتا ہے، لہٰذا سورج کی تیز کرنوں کا غصہ ہم لوہے کے دروازے پر مکے کی صورت اتارتے رہے حتیٰ کہ افلاک سے ہمارے نالوں کا جواب آیا یعنی اندر سے ہمارے دوست کے ایک عزیز دروازہ کھولنے باہر تشریف لائے۔ ہم ان سے پہلی دفعہ متعارف ہوئے تھے۔ سو دروازہ کھلنے پر ہم نے اندر داخل ہو کر گفتگو شروع کرنے کی غرض سے کہا: ''بڑی گرمی ہے۔''

انہوں نے جواب دیا: ''صحیح ہے۔''

ہم نے عرض کی ''تھوڑی دیر پہلے موسم بہت خوشگوار تھا۔'' بولے ''صحیح ہے۔''

ہم نے کہا ''بارش ہو جائے تو شاید موسم ایک بار پھر ٹھیک ہو جائے۔'' بولے ''صحیح ہے۔'' گرمی نے ہمیں نروس کیا ہوا تھا، چنانچہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو یہ کہنے کے بجائے کہ گرمی زیادہ ہے ذرا پنکھا تیز کر دیں، ہم نے کہا ''گرمی زیادہ ہے ذرا پنکھا بند کر دیں۔'' انہوں نے کہا ''صحیح ہے'' اور پنکھا بند کر دیا۔

خیر ان محترم سے تو ہمارا تعارف نہیں تھا چنانچہ ہم نے تخمینہ لگایا کہ یہ ''صحیح ہے۔'' دراصل ان کا تکیہ کلام ہے، ورنہ کچھ لوگ عادتاً نہیں مجبوراً یا ضرورتاً بات بات پر ''صحیح ہے'' کہتے اور من کی مرادیں پاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب ہمارے دفتر میں تشریف لائے۔ انہوں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا ہمارے ہاتھ میں تھمایا۔ ان کی

وضع قطع سے ہم نے اندازہ لگایا کہ شاید انہوں نے کچھ اسی قسم کا رقعہ ہمیں تھمایا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے۔ ''برادرانِ اسلام میں گونگا بہرا مسکین و محتاج ہوں، میری مدد فرما کر عنداللہ ماجور ہوں!'' چنانچہ ہم ان سے معذرت کرنے ہی کو تھے کہ کاغذ پر ہماری نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو غزل تھی۔ سو ہم نے ایک نظر غزل پر ڈالی تو پتا چلا کہ اس غزل کے ''اوزان'' خطا ہیں۔ ہم نے یہ غزل بصد معذرت واپس کی۔ بولے ''یہ صحیح ہے؟'' ہم نے چڑ کر کہا ''جناب والا یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔'' انہوں نے پہلے جیسی فرمانبرداری ہی سے جواب دیا:

''آپ بجا فرماتے ہیں جناب، یہ ''صحیح نہیں ہے۔'' تب ہم پر کھلا کہ وہ بیچارے تو شروع ہی سے ہماری بات کی تصدیق کر رہے تھے سو اس دن سے ان کی غزلیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ ایسے شریف النفس لوگ جو آپ سے اختلاف ہی نہ کریں ان کی قدر افزائی کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا؟ اور ہماری زندگی میں کون سا گوشہ ایسا ہے جہاں پہلے دن سے لے کر آج تک ایسے شریف النفس لوگوں کی قدر نہیں ہوئی؟ یہ ہر ایک کے سامنے ''صحیح ہے، صحیح ہے'' کہتے اور اس کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں سے ''صحیح ہے صحیح ہے'' کہلواتے ہیں یعنی:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مگر ہمارے ایک دوست ایسے بھی ہیں جنہیں اس طرح کے ''سویٹ'' لوگ بالکل پسند نہیں، چنانچہ ہم نے انہیں کئی دفعہ ایسے بلند اخلاق لوگوں کو جھاڑتے دیکھا ہے تاہم ایسے لوگوں سے ان کا اختلاف ذرا فروعی نوعیت کا ہے۔ یعنی ان کا مطالبہ ہے کہ میرے فقرے کے درمیان میں نہیں، جب میں فقرہ مکمل کر لیا کروں اس وقت ''یس سر'' کہا کرو لیکن قصور ان شریف النفس لوگوں کا بھی کوئی نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عہدہ اور منصب آنی جانی چیزیں ہیں۔ ممکن ہے فقرہ مکمل ہونے تک انہیں ''یس سر'' کہنے کا موقع محل ہی نہ رہے، لہٰذا وہ درمیان ہی میں ''یس سر'' کہہ دیتے ہیں۔

اس ضمن میں بات ہمارے دوست کی بھی درست ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فقرہ مکمل ہونے سے پہلے اس کی تصدیق کر دینے سے بسا اوقات کچھ نامناسب سی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک دفعہ انہوں نے کہا۔ ''لعنت ہے مجھ پر.....'' مگر پاس بیٹھے ہوئے ایک شریف النفس نے ان کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے کہا۔ ''صحیح ہے'' جس پر یہ برافروختہ ہو گئے اور پھر ان کے منہ میں جو آیا انہوں نے کہا اور اس پر متذکرہ شریف النفس کو ہر بار ''صحیح ہے، صحیح ہے جناب'' کہنا پڑا۔

تاہم پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہم نے کچھ لوگ اس کے بالکل برعکس بھی دیکھے ہیں، مثلاً ایک روز ہم باغ جناح کی سیر کو گئے تو ہم نے ایک ویران گوشے میں ایک تنہا شخص کو دیکھا جو اکیلا کھڑا ہاتھ فضا میں بلند کر کے کہہ رہا تھا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آپ بالکل غلط کہتے ہیں، میں آپ کی بات ماننے کو تیار نہیں۔'' اس پر ہم اس کے قریب گئے مگر اس نے ہماری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا اختلاف جاری رکھا، ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جناب آپ بھول جائیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں غلط کہہ رہے ہیں!''

ہم نے اسے کندھے سے جھنجھوڑا اور کہا ''عزیزی کیا بات ہے؟ یہ تم کس سے جھگڑ رہے ہو؟'' اس نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور پھر بولا ''کچھ نہیں صاحب! آپ جائیں میں یس مین (YES MAN) ہوں اور آج چھٹی پر ہوں!'' اسے دیکھ کر ہمارا دل شاد ہوا کیوں کہ یہ پہلا ''یس مین'' تھا جو چھٹی پر تھا ورنہ یہ اتنے ڈیوٹی پسند ہوتے ہیں کہ چھٹی پر بھی نہیں جاتے اور اتنے تابع فرمان کہ اگر شدید گرمی یا حبس میں غلطی سے منہ سے نکل جائے ''گرمی بہت ہے ذرا پنکھا بند کر دیں۔'' تو یہ جواب میں ''صحیح ہے'' کہتے اور پنکھا بھی بند کر دیتے ہیں۔

ویت کانگ گوریلوں کے قیدی

قسط دوم

ڈاکٹر جمیل انور

ان آشوب زدہ دنوں کی کہانی جب کمیونسٹوں نے اپنے دیس کو خانہ جنگی سے تباہ کر ڈالا

ہم دریائے میکانگ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں ویت نام کے جنوب مغربی حصے میں واقع صوبے ونبن کا حصہ تھا۔ شہر ہمارے گاؤں سے تقریباً پانچ میل دور تھا۔ ہمارے کافی رشتے دار شہر میں رہتے تھے۔ میں جب بھی شہر جاتا، دو چار دن اپنی خالہ کے ہاں ضرور ٹھہرتا جو مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ خالہ کے علاوہ میرے دو ماموں بھی شہر میں رہائش پزیر تھے جن میں سے ایک مقامی بینک میں منیجر تھا۔ گاؤں کے بچے جب پرائمری کر لیتے تو ہائی اسکول کے لیے انہیں بھی شہر جانا پڑتا تھا۔

ہمارا علاقہ ملک بھر کے چاول پیدا کرنے والے علاقوں میں سرِفہرست تھا۔ اس کی وجہ شاید وہ تازہ اور زرخیز مٹی تھی جو دریائی پانی ہر سال ہماری زمینوں میں بکھیر جاتا۔ بارشوں کے موسم میں جب دھان کی فصل بوئی جاتی تو گاؤں کے چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آتا۔ بوائی کے چند ہفتوں بعد جب پودے نئے پتے نکال لیتے تو علاقے میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دیکھنے کو ملتی پھر کچھ دنوں بعد ہر پودا بور سے لد جاتا اور اس میں سے میٹھی میٹھی خوشبو آنے لگتی۔ سمندر کی جانب سے جب ہوائیں چلتیں تو ان میں دھان کی مدبھری باس موجود ہوتی۔ ہوا کے چلنے سے پودے سرسراتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی مدھم سروں میں گیت گا رہا ہو۔ میں تخیل میں آج بھی اس گیت کو سن اور نشیلی خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا جو دھان کے پودوں سے اٹھتی تھی۔

ہمارا شمار گاؤں کے متمول گھرانوں میں ہوتا تھا۔ میرے دادا ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے یہ گاؤں آباد کیا۔ میرے والد اس گاؤں سے کامیاب زمیندار تھے۔ میری پیدائش سے قبل انہوں نے گورنمنٹ سے قرضہ لے کر دو سو

ایکڑ زمین خرید لی تھی۔ بیشتر زمین دریا کنارے بے آباد پڑی ہوئی تھی۔ والد کی انتھک محنت نے اسے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں بدل دیا۔ لگاتار کوشش اور محنت کے باعث میرے والد نے دس سالوں کے اندر اندر قرضہ واپس کر دیا۔ اگلے دس برسوں میں ان کا شمار علاقے کے بڑے زمینداروں میں ہونے لگا۔ چاول کی فصل ہماری آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ایکڑوں میں پھیلے ہوئے کیلے، مالٹے اور انناس کے باغات بھی تھے۔

یہ غالباً ۱۹۶۷ء کے کسی مہینے کا ذکر ہے جب ایک رات میرے والد پنچایت سے واپس آئے تو کافی فکرمند تھے۔ ماں کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شمالی ویت نام والے جنہیں کمیونسٹ حکومتوں کی حمایت حاصل ہے، جنوبی ویت نام پر بڑے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم ابھی تک جنگ کی صرف باتیں سنتے آئے تھے ہمیں عملاً کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اگرچہ شمالی اور جنوبی ویت نام میں قضیہ چھڑے تیرہ سال ہو چکے تھے مگر جنوبی ویت نام کی افواج اور ویت کانگ گوریلوں میں جھڑپیں صرف شمالی علاقوں تک محدود تھیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب امریکا نے اپنی فوجیں ویت نام میں اتاریں، تو جنگ میں تیزی آ گئی۔ جنوبی ویت نام ایک طرح سے خانہ جنگی کی لپیٹ میں تھا۔

جنوبی ویت نام میں رہتے ہوئے بھی بعض لوگوں کی ہمدردیاں ویت کانگ گوریلوں کے ساتھ تھیں۔ یہ لوگ ہوچی منہہ کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے اور اس انتظار میں تھے کہ کب شمالی ویت نام کی فوجیں جنوبی ویت نام کو فتح کر لیں۔ انہی میں سے کچھ لوگ سرکاری اور امریکی فوجیوں کی نقل و حرکت کے بارے میں ویت کانگ کو باخبر بھی رکھتے تھے۔ اکثر اوقات جنوبی ویت نام میں رہنے والے غدار ہی ویت کانگ کی گوریلا کارروائیوں میں مددگار ثابت ہوتے۔ بظاہر یہ شیطان صفت لوگ معصوم شہری یا کسانوں کے روپ میں رہتے مگر موقع ملنے پر یہ اپنا کام کر گزرتے۔

گزشتہ دس سالوں میں ویت نام کا معاشرتی ڈھانچا تباہ ہو چکا تھا۔ ہر فرد دوسرے شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ باہمی نفرت شہروں محلوں اور گلیوں سے ہوتی ہوئی گھروں تک پہنچ چکی تھی۔ کئی گھروں میں والدین کی ہمدردیاں اگر جنوبی ویت نام کے ساتھ تھیں تو بچے ہوچی منہہ کو اپنا لیڈر مانتے تھے۔ گزشتہ بارہ سال سے ویت نام ایک آگ میں جل رہا تھا اور خبر نہیں مزید کتنے سال اسے اس آگ میں جلنا تھا۔

ہمارے اردگرد چھڑی ہوئی جنگ آہستہ آہستہ طول پکڑتی گئی۔ ہمارا گاؤں کبھی ''ویت کانگ'' کے قبضے میں آ جاتا اور کبھی جنوبی ویت نام کی فوجیں گوریلوں کو سرحد پار دھکیل دیتیں۔ جن دنوں گاؤں پر جنوبی ویت نام کی فوجیں قابض ہوتیں، ہماری زندگی تقریباً نارمل ہو جاتی۔ جنگ سے تباہ ہونے والے مکانوں کی مرمت کی جاتی، کھیتوں میں دوبارہ کام شروع ہو جاتا بچے اسکول جانا شروع کر دیتے اور سٹوپا میں دوبارہ عبادت شروع کر دی جاتی۔ چند ہفتوں بعد ویت کانگ گوریلے دوبارہ یلغار کرتے تو سب کچھ تلپٹ ہو جاتا۔ فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور ہیلی کاپٹروں کی گھر رگھر رپھر سے شروع ہو جاتی۔ بچوں کو گھروں سے نکلنے سے روک دیا جاتا۔ مرد بھی گھروں میں مقید ہو جاتے اور ذخیرہ کی گئی خوراک پر گزارہ شروع ہو جاتا۔ مقامی لوگ اب کچھ اس طرزِ زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ کئی لوگ گاؤں چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے مگر تقریباً سارا ملک ہی ایسی صورتحال سے گزر رہا تھا۔ کسی شہر، قصبے یا گاؤں کو مکمل طور پر محفوظ اور پرامن قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

جنوبی ویت نام کی افواج تعداد اور وسائل میں کمی کے

باعث ملک کو گوریلوں سے حتمی طور پر پاک کرنے سے قاصر تھی۔ اگرچہ جنوبی ویت نام کو امریکی افواج اور فضائیہ کی مدد حاصل تھی مگر امریکی سپاہی زیادہ تر چھاؤنیوں میں رہتے تھے۔ وہ چھاپہ مار جنگ کے بجائے باقاعدہ جنگ کے لیے تربیت یافتہ تھے۔ دوسری طرف چند گوریلے پل یا سرکاری عمارت کو اڑا دینے پر قادر تھے۔ انہیں عددی برتری کی ضرورت نہیں تھی باقاعدہ جنگ سے وہ کتراتے تھے مگر چھاپہ مار کارروائیوں کے ماہر تھے۔ ویت کانگ اکثر نقصان پہنچاؤ اور بھاگ جاؤ پر عمل کرتے تھے۔

امریکی فضائیہ البتہ ایک ایسی قوت تھی جس سے ویت کانگ خوفزدہ تھے۔ جہاں ویت کانگ گوریلوں کا دباؤ بڑھتا وہاں پر امریکی ہیلی کاپٹروں سے مدد ملی جاتی۔ ویت نام کے شہری اس صورتحال میں پس کر رہ گئے تھے۔

ان آشوب زدہ دنوں میں بھی ہمارے ماں باپ کے دلوں میں ہمارے لیے پیار اور محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دونوں ممکن حد تک ہماری حفاظت، خوراک اور تعلیم کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ خاص طور پر میری ماں ہر وقت اپنے بچوں کے لیے فکرمند رہتی اور انہیں کسی محفوظ اور پرامن جگہ پر منتقل کرنے کا سوچتی رہتی۔ رات کے پچھلے پہر جب کبھی اچانک لڑائی چھڑ جاتی، وہ ہم سب کو محفوظ کمرے میں منتقل کرتی اور پھر تمام رات پنکھا ہاتھ میں لیے ہماری کمریں سہلاتی رہتی تاکہ ہم آرام سے سو جائیں۔

جولائی اور اگست کے مہینوں میں ویت نام میں حبس، مچھر اور وبائی امراض بہت بڑھ جاتے ہیں۔ بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ماں ہمیں جڑی بوٹیوں کا سوپ پلاتی رہتی۔ امن کے دنوں میں والدین کی کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ اناج اور اشیائے ضرورت گھر میں اکٹھی کر لی جائیں تاکہ جنگ کے دنوں میں بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ مجھے والدین کی محبت، قربانی اور ایثار تمام عمر نہیں بھولے گا۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ گھر میں اناج ہونے کے باوجود ماں بھوکی سو جاتی تاکہ آنے والے دنوں میں بچوں کو خوراک کی کمی کا سامنا نہ ہو۔ ہم اسے جب کچھ کھانے کے لیے کہتے تو وہ پیٹ خرابی کا بہانہ بنا کر میز سے اٹھ جاتی۔ میں اب سوچتا ہوں کہ میرے ماں باپ کے دلوں سے اپنی جانوں کا خوف نکل چکا تھا۔ وہ اگر فکرمند یا پریشان تھے تو صرف ہم بچوں کے لیے ہوتے۔ جنگ کے دوران کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ بچوں کو کونے والے نسبتاً محفوظ کمرے میں سلا کر میری ماں کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی اور پہروں تاریکی میں گھورتی رہتی جہاں گولیاں، راکٹ اور مارٹر گولے چنگھاڑ رہے ہوتے۔ اس دوران شاید وہ ماضی کے ان پرسکون دنوں کو یاد کرتی جب جنگ اس علاقے سے بہت دور تھی یا پھر وہ ہم بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہوتی۔

ایسے میں میرے والد اسے کافی پینے کی خواہش ظاہر کر کے کھڑکی سے واپس بلا لیتے۔ پھر دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے رہتے یہ باتیں زیادہ تر جنگ ہی کے بارے میں ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے اور جنگ جلد ختم ہو جانے کی امید کا اظہار کرتے۔ ''زندگی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے!'' یہ کہہ کر میرے والد چارپائی پر لیٹ جاتے اور ماں اپنے بستر پر چلی جاتی۔

زندگی اسی ڈھب سے گزرتی رہی۔ میں شہر والے اسکول میں آ گیا۔ یہاں بھی میں محنت سے پڑھتا رہا۔ جماعت میں ہر سال میری پہلی یا دوسری پوزیشن ہوتی۔ مجھے علم تھا کہ اگر میں فیل ہو گیا تو مجھے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ پھر یا تو مجھے جبری طور پر جنوبی ویت نام کی فوج میں بھرتی کر لیا جائے گا یا پھر ویت کانگ گوریلے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ مجھے یہ دونوں صورتیں ہی ناپسند تھیں۔ میرے کئی بچپن کے

دوست اسی انجام کو پہنچے تھے۔ ان میں سے کئی تو شاید اب اس دنیا میں بھی نہیں تھے۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ جنگ میں عملی طور پر حصہ لینے سے بچا ہوا تھا اور ایک نیک مقصد یعنی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف تھا۔

دو سال بعد جب میں نے سیکنڈری اسکول کا امتحان دیا تو صوبے بھر میں اول آیا پھر میں نے یونیورسٹی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے قومی امتحان میں قسمت آزمائی کی۔ یہاں بھی مجھے کامیابی ملی اور مجھے ۷۵۔۱۹۷۴ سیشن میں یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ میں سائیگون چلا گیا جہاں ہاسٹل کے بجائے اپنی ایک خالہ کے ہاں ٹھہرا جو ایک بیکری اور اس سے ملحقہ ریسٹورنٹ چلاتی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی ہم پڑھائی سے زیادہ ملک میں چھڑی خانہ جنگی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے۔ بعض اوقات ہمارے اساتذہ بھی ہمارے ساتھ بحث میں شریک ہو جاتے لڑائی آہستہ آہستہ سائیگون کے قریب آتی جا رہی تھی۔

۱۵/اپریل کو میری سالگرہ تھی جو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گاؤں جا کر منانا چاہتا تھا مگر اپریل کے پہلے ہفتے میں سیکورٹی کے پیشِ نظر شہر سے نکلنے والے تمام راستے فوج نے بند کر دیے۔ ہم لوگ شہر میں محصور ہو کر رہ گئے۔ شمالی اور جنوبی ویت نام کی فوجوں کے درمیان شہر سے چند میل کے فاصلے پر شدید جنگ جاری تھی۔ سائیگون کے اندر ویت کانگ گوریلوں کی چھاپہ مار کارروائیوں نے حکومت کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آخر کار ۳۰/اپریل کو شہر کا آخری حصار بھی ٹوٹ گیا شمالی ویت نام کے ٹینک مرکزی شاہراہ سے ہوتے ہوئے صدارتی محل تک پہنچ گئے۔ سائیگون کا سقوط ہو چکا تھا۔

محل کا حفاظتی عملہ شمالی ویت نام کے ٹینکوں کے آنے سے پہلے ہی رفو چکر ہو گیا۔ جنوبی ویت نام کے فوجی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں شہر میں بکھر گئے اور اب بھی مدافعتی جنگ لڑ رہے تھے۔ تمام شہری گھروں میں محصور ہو چکے تھے۔ شمالی ویت نام کے فوجیوں نے صدارتی محل سے جنوبی ویت نام کا جھنڈا اتار کر اپنا زرد ستارے والا جھنڈا لہرا دیا۔ شہر میں کوئی امریکی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا البتہ کبھی کبھار کوئی امریکی ہیلی کاپٹر ویت کانگ پر گولیاں برسانے آ نکلتا۔ شہر کے گلی کوچوں سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جب خالہ کو اپنے ارادے سے باخبر کیا تو وہ خوفزدہ ہو گئی اور مجھے گھر میں ہی چھپے رہنے کا مشورہ دینے لگی مگر میں قیامت کی اس گھڑی میں اپنے والدین تک پہنچنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ میں نے ایک دودھ بیچنے والے کسان کا بھیس بدلا اور گلیوں میں چھپتا چھپاتا شہر سے باہر نکل آیا۔ خوش قسمتی سے مجھے مرکزی شاہراہ پر جنوب کی طرف جاتا ہوا ریڈ کراس کا ایک ٹرک مل گیا جو سائیگون سے اقوام متحدہ کی نرسوں کو لے کر نکل رہا تھا۔ دس گھنٹے کے متواتر سفر کے بعد اس ٹرک نے مجھے میرے قصبے وِنہ بن پہنچا دیا جہاں سے میرا گاؤں چند میل کے فاصلے پر تھا۔

ہم سحری کے وقت وِنہ بن پہنچے تھے۔ میں جب ٹرک سے اترا مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میری جیب میں کچھ رقم تو موجود تھی مگر اس وقت ایسی کوئی دکان نہیں کھلی تھی جہاں سے کھانے پینے کی کوئی چیز مل جاتی۔ ناچار میں بارہ گھنٹے کا بھوکا پیاسا ہی اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے دو ویت کانگ گوریلوں نے مجھے روک لیا مگر میرے یہ بتانے پر کہ میں اس گاؤں کا رہائشی ہوں اور سائیگون سے آ رہا ہوں، انہوں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس ملاقات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا گاؤں مکمل طور پر ویت کانگ کے قبضے میں ہے۔

جب میں گھر پہنچا تو میرے والدین اور بہن بھائی مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ سائیگون کے سقوط کی خبر ان تک پہنچ چکی تھی اور وہ میری سلامتی کے لیے بے حد فکر مند تھے۔ ماں نے مجھے کھانا نکال کر دیا۔ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا میں عرصے بعد کھا رہا تھا۔ میں جتنی دیر کھانا کھاتا رہا وہ مجھے گاؤں کے بدلے ہوئے حالات کے بارے میں بتاتی رہی۔ گاؤں اب عملاً ویت کانگ کے زیرِ انتظام تھا۔ گاؤں کے باسی ویت کانگ انتظامیہ کے غلام تھے۔ کوئی شخص انتظامی کمیٹی کی اجازت کے بغیر گاؤں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ گوریلے جب چاہے گاؤں کے کسی گھر میں گھس کر خوراک قبضے میں لے سکتے تھے۔ ذاتی ملکیت نظر انداز کرتے ہوئے ویت کانگ نے گھروں میں موجود کام کرنے والے افراد کی بنیاد پر کاشت کاری کے لیے کھیت بانٹ دیے تھے۔ نتیجے میں ہماری بہت ساری زمین پر اب گاؤں کے دوسرے لوگ فصلیں بو رہے تھے۔

بچوں کے اسکول میں کتابیں اور استاد تبدیل ہو گئے تھے۔ اب ہر صبح انہیں اسکول کے صحن میں عبادت کروانے کے بجائے ہو چی منہ کی تعلیمات پر لیکچر دیا جاتا۔ کتابوں میں کمیونزم پر مضامین شامل کر دیے گئے تھے۔ یہ سب کچھ سنانے کے لیے ماں میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں کھانا کھاتے ہوئے متواتر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جس پر جھریوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ جاگیردار کی بیگم کے بجائے عام کسان کی بیوی لگتی تھی۔ پرانے دنوں کو یاد کرتے کرتے آنسو اس کی آنکھوں میں بھر آئے جنہیں وہ کلائی کی پشت سے صاف کرتی رہی۔ میں کھانا کھا کر سو چکا تھا۔

اگلے دو چار دن مجھے گاؤں میں وہی کچھ نظر آیا جس کی تفصیل ماں نے بتائی تھی۔ میرا نام بھی انتظامی کمیٹی کے رجسٹر میں درج ہو گیا یوں میں بھی غلاموں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ گاؤں کا کوئی بھی شخص کسی بھی چیز کو اپنی ملکیت قرار نہیں دے سکتا تھا۔ عوام کے نام کا غلط استعمال کرتے ہوئے ویت کانگ نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔ گاؤں کے تمام مردوں کو حکم تھا کہ ہر صبح وہ سٹوپا کے صحن میں حاضری کے لیے اکٹھے ہوں۔ حاضری کے بعد کمیونزم اور سوشلزم کی برکات پر طویل لیکچر دیا جاتا پھر ہر مرد کے ذمے کام سونپ دیا جاتا جو اسے ہر حال میں شام تک مکمل کرنا ہوتا۔ شام ساڑھے پانچ بجے ایک مرتبہ پھر حاضری لگائی جاتی۔ خواتین البتہ اس حاضری سسٹم سے مستثنیٰ تھیں۔ سٹوپا میں جانے اور بدھ کے مجسمے کی زیارت کرنے کی ہفتے میں صرف ایک دفعہ اجازت تھی۔ کسی شخص نے اگر کسی رشتے دار سے ملنے کے لیے دوسرے گاؤں جانا ہوتا تو اسے کمیٹی کے چیئرمین سے اجازت لینا پڑتی۔ اسے ایک اجازت نامہ جاری کیا جاتا جو وہ سفر کے دوران اپنے پاس رکھنے کا پابند تھا۔ چوپال، پنچایت یا اس طرح کے کسی بھی قسم کے عوامی اجتماع پر پابندی تھی۔ کسی بھی گھر میں افراد خانہ کے علاوہ چار افراد اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان قوانین پر عمل پیرا ہونا ہر مرد و زن پر لازمی تھا۔

شروع شروع میں چند نوجوانوں نے ویت کانگ کے دیے گئے ان اصولوں سے انحراف کی کوشش کی مگر انہیں اس طرح غائب کر دیا گیا کہ پھر کبھی ان کا سراغ نہ مل سکا۔

ہم ایک صبح حاضری کے لیے سٹوپا کے صحن میں جمع تھے کہ میگافون پر اعلان کیا گیا، حاضری کے بعد تمام لوگ قریبی فٹ بال گراؤنڈ میں پہنچ جائیں۔ سارے افراد نے حکم کی تعمیل کی اور حاضری کے بعد فٹ بال گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ وہاں ملٹری کے دو ٹرک کھڑے تھے جن پر ترپال چڑھی ہوئی تھی۔ جب سب لوگ گراؤنڈ میں پہنچ گئے تو ٹرک میں دو جنوبی ویت نامی قیدی اتارے گئے اور انہیں دو ستونوں سے باندھ دیا گیا۔ قیدیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں اور ان کے

شت پر جکڑے ہوئے تھے۔

ایک ویت کانگ سپاہی نے قیدیوں سے تقریباً پچیس ے فاصلے پر سٹین گن نصب کر دی۔ قیدیوں کی حالت بتا ی کہ وہ کئی دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ ایک طرف ایک اور تین کرسیوں پر مشتمل سمری عدالت لگائی گئی۔ تین کانگ اس پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک سپاہی ذوں کا پلندہ نکالا اور قیدی کے خلاف فردِ جرم پڑھنی کر دی۔ ''یہ شخص فلاں ابن فلاں سی۔ آئی۔ اے کا رہا ہے۔ اس نے ویت کانگ کے خلاف کام کیا ہے۔ یوں کا پٹھو ہے۔ اس جرم کے لیے کیوں نہ اسے موت ادی جائے؟ یہ الفاظ پڑھنے کے بعد ویت کانگ سپاہی مجمعے کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا اور بولا ''یقیناً ی سزا موت ہونی چاہیے''۔

پہلے ہجوم میں چند افراد بولے اور پھر پورا مجمع ان کے از ہو گیا۔ دوسرے بدنصیب قیدی کی فردِ جرم بھی اسی ھنے کے بعد موجود لوگوں سے ''گواہی'' لی گئی۔ بیٹھے افسر نے فردِ جرم والے کاغذ پر ''سزائے '' لکھا اور سٹین گن پر بیٹھے ہوئے سپاہی کو اشارہ کر یس فٹ کے فاصلے سے چار انچ لمبی گولیوں کی ایک ل اور بدنصیب قیدیوں کے لاغر جسموں سے آر پار ہو دونوں قیدیوں کی لاشیں ستونوں سے ہٹا لی گئیں اور ک دو نئے قیدی باندھ دیے گئے۔ اس دن دس قیدی ں کا نشانہ بنے۔

ٹ بال گراؤنڈ سے ہم لوگ جب واپس لوٹے تو ک مکمل خاموش اور سوگوار تھے۔ شاید سبھی یہ سوچ تھے کہ یہ تو وہ سحر نہیں تھی جس کی نوید ہو چی منہ نے جن گھروں کے مرد لاپتا تھے، انہیں اپنے پیاروں انجام کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا مگر احتجاج کرنا لاحاصل کو دعوت دینا تھا۔ زبان سے نکلی ہوئی بات آپ کے گلے کا پھندہ بن سکتی تھی۔ تمام لوگ خاموشی سے اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔ میری ڈیوٹی ان دنوں پرائمری اسکول میں بچوں کو پڑھانے پر لگی ہوئی تھی مگر اس دن میں کچھ بھی پڑھا نہ سکا۔ بار بار بدنصیب قیدیوں کی شکلیں میری نگاہوں میں گھوم جاتیں اور سٹین گن کی تڑتڑاہٹ میرے کانوں میں گونجنے لگتی۔

۱۵ر مئی کو ویت کانگ کی خفیہ پولیس کے لوگوں نے ہمارے گھر پر ہلہ بول دیا۔ تمام اہل خانہ کو گھر سے باہر کھڑا کر کے گھر کی مکمل تلاشی لی گئی۔ اس دوران ایک گوریلا سٹین گن تانے ہمارے سروں پر کھڑا رہا۔ میری ماں اور بہنیں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ مکان کے اندر ہر الماری کو کھنگالا گیا، ٹرنک خالی کیے گئے، دراز فرش پر الٹ دیے گئے ہینگروں پر لٹکے ہوئے کپڑوں تک کی تلاشی لی گئی مگر شکر ہے کہ ہمارے گھر سے ویت کانگ کو کوئی قابلِ اعتراض چیز نہ مل سکی مگر جاتے ہوئے وہ پھر بھی میرے والد کو ساتھ لے گئے اور عارضی طور پر بنائی ہوئی حوالات میں قید کر دیا۔

ہمیں اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ جب ہم فرش پر بکھری ہوئی چیزوں کو دوبارہ الماریوں اور ٹرنکوں میں رکھ رہے تھے تو میری ماں کے کہنے کے مطابق بہت ساری قیمتی اشیاء غائب تھیں مگر اس وقت چیزوں سے زیادہ اپنے والد کی فکر تھی۔ ہم فٹ بال گراؤنڈ میں بہت سارے قیدیوں کا انجام دیکھ چکے تھے۔ میں نے اپنے بھائی کو ساتھ لیا اور گاؤں کے چند دیگر عمائدین کے ہمراہ خفیہ پولیس کے دفتر پہنچ گیا جو گاؤں کے دوسرے کونے میں ایک مکان میں قائم کیا گیا تھا۔ خفیہ پولیس کا مقامی سربراہ ادھیڑ عمر کا ایک گوریلا تھا جو جنوبی ویت نام ہی کا باشندہ تھا مگر برسوں پہلے ہو چی منہ کی محبت میں شمالی ویت نام بھاگ گیا تھا۔

دروازے پر کھڑے ایک ویت کانگ کے ذریعے اپنی درخواست سربراہ تک پہنچائی کہ گاؤں کے کچھ عمائدین

اسے ملنا چاہتے ہیں۔ جلد ہی ہمیں جامہ تلاشی کے بعد ایک کمرے میں زمین پر بٹھا دیا گیا اور ہمارے سامنے ایک کرسی رکھ دی گئی جس پر پولیس کے سربراہ نے بیٹھنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صاحب بہادر تشریف لائے اور تمکنت کے ساتھ کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ میرے ساتھ آئے ہوئے سب سے عمر رسیدہ ساتھی کو سر کی جنبش سے اشارہ کیا گیا کہ کہو جو کہنا ہے۔ میرے ساتھی نے دھیمی آواز میں میرے والد کی صفائی پیش کرنی شروع کی۔

اس نے بتایا کہ میرا والد ایک نہایت ایماندار، شریف اور محنتی شخص ہے جس نے کبھی جنوبی ویت نام کی حمایت اور ویت کانگ کی مخالفت نہیں کی۔ اسے ہمیشہ اپنے کام سے غرض رہی ہے بلکہ وہ کبھی کبھار ویت کانگ کو غلہ اور اناج بھی دیتا رہا ہے۔ اپنی بات کے ثبوت میں اس نے توڑ مروڑ کر وہ واقعہ پیش کر دیا جس دن ویت کانگ ہمارے گھر سے چاولوں کی بوریاں اٹھا کر لے گئے تھے۔ باقی عمائدین گاؤں نے بھی اپنے عمر رسیدہ ساتھی کے بیان کی تائید کر دی۔ ساری باتیں سننے کے بعد سربراہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔

میں اور بھائی والد کی رہائی کے بارے میں ناامید ہو چکے تھے کیونکہ ہم پولیس سربراہ کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں دیکھ سکے تھے جس سے ہم یہ سمجھ سکتے کہ ہماری باتیں اسے قائل کر سکی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ویت کانگ نے ہمیں کمرے سے باہر آنے کو کہا۔ جب ہم باہر نکلے تو میرا والد تھانے کے صحن میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہم دونوں بھائی اس سے لپٹ گئے۔ ہم خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ میرے والد کو نئی زندگی ملی تھی۔

مجھے پھر خبر ملی کہ سائیگون میں نئی انتظامیہ کے تحت زندگی معمول پر آ گئی ہے اور یونیورسٹی بھی کھل گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں اور حالات جیسے بھی ہوں، اپنی تعلیم مکمل کروں میرے ماں باپ بھی یہی چاہتے تھے بلکہ ان خواہش یہاں تک تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اگر مجھے م ملے تو میں ویت نام کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں لہٰذا میں ا مرتبہ پھر سائیگون اپنی خالہ کے گھر چلا گیا اور یونیورسٹی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یونیورسٹی کے حالات میں خاص تبدیلی نہیں آئی تھی سوائے یہ کہ یونیورسٹی کا صدر ا ایک شمالی ویت نام کا باشندہ تھا۔ یونیورسٹی کی حدود میں و کانگ کی ایک چوکی بھی قائم کر دی گئی تھی تاکہ طلبا اگر ہوں تو ان پر بروقت قابو پایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ثقافت بھائی چارے کے نام پر ہفتے میں ایک دفعہ ہمیں سوشلزم کمیونزم کی برکات پر لیکچر بھی سننے کو ملتا۔

جنگ کے باعث شہر میں اناج اور خوراک کے لوازمات کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ ناجائز پوچھ گچھ کے باعث اردگرد کے قصبوں کے کسان اناج، دودھ اور غلہ وغیرہ سائیگون لانے سے کتراتے تھے۔ دوسرے ان چیزوں کو میں لانے پر انہیں کافی محصول بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کا کسانوں نے یہ نکالا کہ دودھ، سبزیاں اور اناج وغیرہ شہر میونسپلٹی کی حدود سے باہر ہی بیچ دیتے تھے۔ دکا کسانوں سے یہ چیزیں شہر سے باہر ہی خرید لیتے اور وہ شہریوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ تازہ اور سستی سب خریدنے کے لیے شہر سے باہر اس مارکیٹ میں جانا پڑتا جسے بلیک مارکیٹ کہا جاتا تھا۔ شہر کی انتظامیہ کو ساری صورت کا علم تھا مگر حکام نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں ہر بلیک مارکیٹ سے خریداری کرنے جاتا جس میں زیادہ تر اور سبزیاں شامل ہوتیں۔ اس کے لیے مجھے دو جگہ بس پڑتی اور تقریباً ڈیڑھ میل پیدل چلنا پڑتا۔ یہ غالباً جون کا ہفتہ تھا۔ میں بلیک مارکیٹ سے شاپنگ کرنے کے لیے کے گھر سے روانہ ہوا۔ ایک بس سے اتر کر جب میں دو کے اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا تو میرے قریب سے ایک

گزرا۔ وہ شخص بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی کا تعاقب کر رہا ہو۔ میں نے بھی لاشعوری طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی ایک ویت کانگ سپاہی اس کے تعاقب میں آ رہا تھا میں سپاہی کو راستہ دینے کی خاطر فٹ پاتھ طرف ہو گیا۔ سپاہی بھاگتا ہوا میرے قریب سے گزر آگے بھاگنے والا شخص اکہرے جسم کا نوعمر لڑکا تھا جو تیزی بھاگتا ہوا سپاہی کی دسترس سے دور نکل گیا۔ شکار ہاتھ جانے پر سپاہی رک گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں شاید وہ کوئی سواری تلاش کر رہا ہے۔ اچانک سپاہی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ میرے قریب آ گیا۔ ''کون ہو تم اور یہاں جا رہے ہو'' سپاہی نے نہایت درشت لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں نے بڑے تحمل سے اسے بتایا کہ میں یونیورسٹی کا طالب علم ہوں اور ضروریاتِ زندگی خریدنے فلاں مارکیٹ جا رہا ہوں۔ سپاہی کے پوچھنے پر میں نے یونیورسٹی کا شناختی کارڈ اسے دکھایا۔ ''تمہیں اپنی شناخت کی تصدیق کے لیے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا'' سپاہی بولا۔

''مگر میرا قصور کیا ہے؟ اب میں نے بھی ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ اچانک اس نے اپنی کمر سے ہتھکڑی کھولی، میرے ہاتھوں میں ڈال دی اور ہولسٹر سے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہو گیا کہ میں اپنے دفاع میں کچھ بھی کہہ سکا۔ ''تمہارا قصور تمہیں تھانے چل کر بتایا جائے گا'' یہ کہہ کر اس نے مجھے واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پہلے تو فرار کرنے کا ارادہ کیا مگر سپاہی کے ہاتھ میں پستول دیکھ اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ میں اس کے بتائے ہوئے راستے چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں کسی ذمہ دار سے بات کروں گا اور غلط فہمی دور ہونے پر چھوڑ دیا جاؤں گا مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

پولیس اسٹیشن وسیع جگہ کے مرکز میں بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی جو کسی زمانے میں ملٹری پولیس کے زیرِ استعمال بھی رہی تھی۔ بیرونی دروازے سے گزر کر جو راستہ عمارت تک جاتا تھا، اس کے دائیں طرف وسیع گراؤنڈ تھا جو کبھی سپاہیوں کی پریڈ کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ بائیں جانب مطبخ اور دھوبی گھاٹ کی سہولتیں موجود تھیں۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میرے احتجاج کے باوجود مجھے ایک لاک اپ میں ڈال دیا گیا جہاں تین لوگ پہلے سے موجود تھے۔ یہ تینوں کسی گتہ فیکٹری میں مزدور تھے۔ وہ زیادہ کام اور کم اجرت کے خلاف احتجاج کے جرم میں وہاں ڈالے گئے تھے۔ ان کے بقول گتہ فیکٹری کے مالک نے رشوت کے ساتھ پولیس کو یہ اطلاع بھی دی تھی کہ یہ لوگ سائیگون کی نئی انتظامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ جاتے ہی مجھے کسی بڑے افسر کے سامنے پیش کیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ دن ڈھل گیا شام ہو گئی مگر میری کہیں پیشی نہ ہوئی۔ میں نے دو تین دفعہ لاک اپ کے قریب سے گزرتے ہوئے سپاہیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر کسی نے میری بات سننے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے لاتعلقی سے ایسے گزر جاتے تھے جیسے میں کسی پاگل خانے میں ہذیان بکتا ہوا ذہنی مریض ہوں۔ میرا غصہ اب آہستہ آہستہ مایوسی میں بدل رہا تھا۔ جب میں نے ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہوا، میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکا۔ میرے گھر والے کوسوں دور اور میرے حالات سے بے خبر تھے۔ میری خالہ کو بھی مجھ پہ پڑنے والی افتاد کا علم نہیں تھا۔ اگر ہو بھی جاتا تو وہ بیچاری اکیلی عورت کیا کر سکتی تھی؟ یونیورسٹی میں ابھی میرا کوئی ایسا قریبی دوست نہیں تھا جو میری غیر موجودگی محسوس کرتے ہوئے میری تلاش میں نکل پڑتا۔ صورتِ حال کا ادراک ہوتے ہی میں نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

رات تقریباً آٹھ بجے ایک ملازم ہمیں تام چینی کی پلیٹوں

میں تھوڑے تھوڑے چاول کھانے کے لیے دے گیا جن پر دال کا نہایت پتلا سا شوربہ ڈالا گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے وہ چاول زہر مار کر لیے کیونکہ میں صرف ناشتا کر کے گھر سے نکلا تھا۔ حوالات کے ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹکے میں پانی موجود تھا مگر پانی نکالنے کے لیے کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ جس پلیٹ میں چاول ملے تھے اسے ہی استعمال کرتے ہوئے میں نے بمشکل تمام چند گھونٹ پانی پیا اور کمرے کے ایک کونے میں موجود شکستہ سی چٹائی پر لیٹ گیا۔ نئی صورتحال پر غور کرتے کرتے نجانے کب مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ رات بھر مچھر اور حشرات الارض مجھے کاٹتے رہے مگر میں لیٹا رہا۔ سوتے جاگتے رات کٹ گئی دن نکل آیا۔ تقریباً دس بجے ہمیں ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور نہایت بدمزہ چائے دی گئی جو میں نے اس خیال سے پی لی کہ پولیس اسٹیشن میں یہ میرا آخری ناشتا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ آج مجھے کسی بڑے افسر یا مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور میری بے گناہی سامنے آنے پر مجھے رہا کر دیا جائے گا مگر یہ سب میری خام خیالی تھی۔ دوپہر کو ایک سپاہی آیا اور میرے سامنے چند سفید کاغذ اور قلم پھینک چلا گیا کہ میں اپنا ''اقرار نامہ'' تحریر کروں۔ کیسا اقرار نامہ؟ کس جرم کا اقرار نامہ؟ میں لاکھ اس سے پوچھتا رہا مگر وہ چہرے پر ایک لاتعلقی کا تاثر لیے واپس چلا گیا۔ دن کے دو بجے ہمیں سبزیوں کا شوربا اور ساتھ دو چپاتیاں کھانے کے لیے دی گئیں۔ سہ پہر کو وہ سپاہی دوبارہ آیا اور مجھ سے اقرار نامہ تحریر کرنے پر اصرار کرنے لگا۔ میں نے اسے صاف صاف بتایا کہ میں نے کسی جرم کا ارتکاب ہی نہیں کیا تو اقرار کس چیز کا کروں؟ مگر وہ مصر رہا کہ میں ان کاغذات پر کچھ نہ کچھ اپنے بارے میں لکھوں کیونکہ اس کے بقول میری رہائی اس ''اقرار نامے'' سے مشروط تھی۔ طے یہ پایا کہ میں ان کاغذوں پر اپنی گزشتہ زندگی کا مختصر سا خلاصہ تحریر کر دوں تاکہ میری رہائی عمل میں آ سکے۔

میں رات گئے تک جاگتا رہا اور جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا اس دن سے کر اپنی گرفتاری تک کے حالات من عن تحریر کر دیے۔ میرے پاس چھپانے کو رکھا ہی کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح جب میری سرگزشت کسی ذمہ دار افسر کو دکھائی جائے گی تو پڑھنے کے بعد وہ فوراً میری رہائی کے احکامات صادر کر دے گا مگر میری امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب سہ پہر کو پھر وہی سپاہی چند کاغذ اور قلم لے آیا کہ میں اپنے خاندانی حالات تفصیل سے لکھوں۔ میری حالت دیدنی تھی۔ میں گزشتہ تین دن سے بغیر کسی قصور کے حوالات میں قید تھا۔ ناقص ترین غذا مجھے دی جا رہی تھی، زمین پر سوتا تھا، ساری رات مچھر اور زمینی کیڑے کاٹتے رہتے، رفع حاجت کے لیے میں کمرے کے کونے میں بنا ہوا گندہ ترین واش روم استعمال کر رہا تھا مگر یہ سب میرے مسائل تھے۔ سپاہی کاغذ اور قلم میرے سامنے پھینک کر جا چکا تھا۔ مجھے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ میں توقع سے زیادہ گہرے کنویں میں گر چکا جہاں سے نکلنا اس قدر آسان نہیں مگر میں نے پھر ایک موہوم سی امید کے ساتھ اپنے دادا کی گاؤں میں آمد سے لے کر تمام حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے۔ اس رات میں صبح کے تین بجے تک جاگتا رہا مگر اگلے دن پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ خالی کاغذ اور قلم میرے سامنے پڑے تھے جنہیں میں نے نفرت اور غصے سے زمین پر پھینک دیا۔

حوالات نما جیل میں قید ہوئے مجھے آٹھواں دن تھا جب تھانے میں ایک ٹرک آ کر رکا۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ٹرک میں بٹھا دیا گیا۔ جب ہم لوگ سوار ہو رہے تھے تو مجھے احساس ہوا کہ ٹرک کے پچھلے خانے میں پہلے بھی کچھ قیدی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے سوار ہونے کے بعد ٹرک پر ترپال چڑھا دی گئی اور ٹرک روانہ ہو گیا۔ میرے خدشات سچ ثابت ہو رہے تھے۔ ہمیں بیگار کیمپ لے جایا جا رہا تھا۔ ◆◆◆

اس دلچسپ داستان کی اگلی قسط شمارہ نمبر میں ملاحظہ فرمائیے

قوتِ ارتکاز کی سائنس

ارم ناز

کام پر توجہ مرکوز کروانے والے مفید اور بیش قیمت سائنسی مشورے

''افوہ! کیا مصیبت ہے؟'' حنا نے جھنجھلاتے ہوئے کاغذ مروڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جو پہلے ہی مڑے تڑے کاغذوں سے لبالب تھی اور بے مقصد کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پچھلے چھ گھنٹوں سے وہ مسلسل ذہن میں ہی ایک کہانی کا خاکہ تیار کر کے لکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی بمشکل چند صفحے ہی لکھ پائی تھی لیکن اس کا دماغ تھا کہ بار بار بھٹک جاتا۔ لامتناہی سوچیں بار بار ذہن میں ابھر رہی تھیں، نتیجتاً وہ شدید کوفت میں مبتلا ہو چکی تھی۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے حالانکہ وہ بڑی دیر سے یکسوئی کے ساتھ صرف لکھنے کا ارادہ کر کے بیٹھی تھی۔

ایسی صورتحال کا سامنا ہمیں اس وقت کرنا پڑتا ہے جب ہم کوئی بور، خشک یا مشکل کام کر رہے ہوں یا پھر زبردستی دماغ کو کسی کام کی طرف مائل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ تب ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے کام پر توجہ مرکوز کرنا خاصا مشکل ہے۔ توجہ یا ارتکاز کی کمی کے باعث ہم اکثر اپنے طے کردہ ہدف مکمل نہیں کر پاتے اور ہمیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

قوتِ ارتکاز یا توجہ ہے کیا.....؟ جو ہمارے کام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کی رو سے ''وہ صلاحیت جس کی بنا پر انسان اپنا تمام دھیان کسی ایک خیال یا نقطے پر مرکوز کر دے، قوت ارتکاز یا توجہ کہلاتی ہے''۔

جب توجہ کسی ایک نقطے پر قائم ہو جائے تو انسان نہ صرف اپنے امور زندگی بہتر انداز اور کم وقت میں انجام دینے لگتا ہے بلکہ اپنے اہداف مکمل کرنے کی خوشی، اطمینان، سکون اور کامیابی بھی قوت ارتکاز میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اکثر اوقات توجہ اور یکسوئی کی کمی کی وجہ سے ہم اپنے طے کردہ مقاصد پورے نہیں کر پاتے۔ چناں چہ مستقبل کے انجانے خدشات، ناآسودہ حالات، لاحاصل آرزوئیں اور پے در پے ناکامیوں جیسے عوامل خیالات کو منتشر کرتے اور شخصیت کو بکھیر

کر رکھ دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں جہاں دن بہ دن نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں، دماغ کو خلفشار سے کیسے بچایا جائے؟ یکسوئی سے کام پر توجہ کیسے مرکوز کی جائے؟ اکثر اوقات کام کرتے ہوئے لوگوں کا ذہن غیر حاضر ہو جاتا ہے اور مختلف قسم کے خیالات ان کو پریشان کرتے ہیں لیکن وہ بذاتِ خود یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ کون سی چیز ان کو پریشان کر رہی ہے یا کیا شے ان کے لیے باعث تفریح ہے۔ کیا وہ سوشل میڈیا بند کر کے پرسکون طریقے سے کام کر سکتے ہیں یا پھر سارا دن ہیڈ فون لگا کر یا الگ تھلگ رہ کر۔

ماہر نفسیات یہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انسانی دماغ کیسے کام کرتا ہے۔ ان کے مطابق بہت سی ایسی باتیں جو ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں کام پر توجہ اور ارتکاز حاصل کرنے کے لیے کرنی چاہئیں، دراصل اس قدرتی طریقہ کار کے خلاف ہیں جس کے ذریعے ہمارا دماغ کام کرتا ہے۔ تو کیا ہم زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لیے سائنس سے اس حوالے سے سیکھ سکتے ہیں اور کیا کچھ تجاویز حقیقتاً کام کرتی ہیں؟ آیئے ہم آپ کو اس حوالے سے کچھ تحقیقات سے آگاہ کرتے ہیں کہ کام کو توجہ اور یکسوئی کے ساتھ کیسے کیا جائے۔

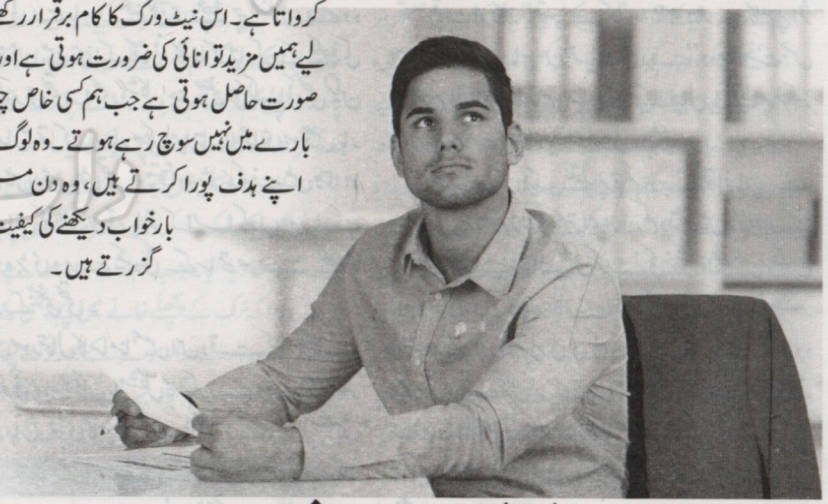

دن میں خواب دیکھنا

ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ، اگر آپ کوئی ایسا کام کر رہے ہیں جس میں بہت زیادہ توجہ اور ارتکاز کی ضرورت ہے تو اپنے دماغ کو آزادانہ گھومنے پھرنے دیں یعنی اس کو مختلف سوچیں سوچنے دیں۔ ماہرین بتاتے ہیں کہ ایک عام آدمی اپنے دن کا آدھا حصہ یا ۵۰ فیصد وقت دن میں خواب (day dreaming) دیکھتے ہوئے بسر کرتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک دماغ کا یوں آزادانہ مختلف خیالات کا سوچنا کوئی خرابی نہیں بلکہ اس خود کار نظام کا حصہ ہے جو ہمارے دماغ کو بہتر طریقے سے کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔

قوتِ ارتکاز حاصل کرنے کے لیے دماغ کے مکمل نیٹ ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں دماغی حصہ فرنٹ کورٹیکس بھی شامل ہے۔ جو پریشانیوں کا مقابلہ کرنے میں انسان کو تیار کرتا ہے نیز ہم سے تسلسل کے ساتھ کام کرواتا ہے۔ اس نیٹ ورک کا کام برقرار رکھنے کے لیے ہمیں مزید توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اس صورت حاصل ہوتی ہے جب ہم کسی خاص چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہے ہوتے۔ وہ لوگ جو اپنے ہدف پورا کرتے ہیں، وہ دن میں کئی بار خواب دیکھنے کی کیفیت سے گزرتے ہیں۔

اگر دن میں خواب دیکھنا فائدہ مند ہے تو کیوں نہ اس کا باقاعدہ وقت مقرر کیا جائے۔ پاؤل سیلی ہارورڈ یونیورسٹی کے سائیکالوجسٹ ہیں۔ انہوں نے حادثاتی اور جان بوجھ کر دماغ کو مختلف سوچوں میں مصروف رکھنے کے بارے میں فرق بتاتے ہوئے کہا کہ اپنے کام کو مکمل کرنے کے لیے نادانستہ طور پر اِدھر اُدھر کی سوچیں سوچنا صحیح بات نہیں۔

اگر کام آسان ہے تو دماغ ''آوارہ گردی'' (wandering) کو کوئی خاص فائدہ فراہم نہیں کرتی لیکن اگر ٹاسک مشکل ہے جیسے کسی چیز کی منصوبہ بندی کرنا، مسائل کو حل کرنا یا حساب کتاب وغیرہ تو دماغی آوارہ گردی بہت فائدہ مند ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اگر آپ دماغ کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے دن میں خواب دیکھنے دیں تو اس سے آپ کے کام کی رفتار اچھی ہوتی ہے اور آپ اپنا ہدف جلدی پورا کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچیں جو آپ کے دماغ کو خوشی دیتی ہو، ہلکی پھلکی ہو اور آپ کے کام سے متعلق نہ ہو پھر واپس اپنا کام کریں تو آپ واضح مثبت فرق محسوس کریں گے۔

مزاح سے فائدہ اٹھائیے

نفسیات کی ایک نئی تحقیق کے مطابق اپنے کام کی رفتار بڑھانے اور کارکردگی میں بہتری لانے کے لیے مزاح اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہنسی مذاق اور مزاحیہ ویڈیوز دماغ کو ارتکاز سے روکتی ہیں اور کام پر توجہ مرکوز نہیں کرنے دیتیں۔ آپ کی قوتِ ارادی بے شک زیادہ ہو۔ آپ اپنے کام سے جتنا مرضی پیار کرتے ہوں اور مشکل چیزوں کو توجہ سے کرنے کی کوشش کرتے ہوں لیکن اگر آپ تناؤ والے ماحول میں کام کریں گے تو اس سے آپ کی کارکردگی متاثر ہوگی۔

ماہرینِ نفسیات کے مطابق ایسی تمام ویڈیوز اور تصاویر جو آپ کے چہرے پر ہنسی لے آئیں، وہ دماغ سے بہتر کام کروانے میں معاون بنتی ہیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے چند تجربات کیے گئے جن میں کچھ لوگوں کو مزاحیہ ویڈیو دکھائی گئیں اور کچھ کو عام سی سنجیدہ ویڈیوز پھر ان کو مشکل پزل حل کرنے کے لیے دیے گئے۔ جنہوں نے مزاحیہ ویڈیوز دیکھیں انہوں نے وہ ناممکن پزل بہت جلد حل کر لیے بہ نسبت ان کے جنہوں نے سنجیدہ ویڈیوز دیکھی تھیں۔ ان پر کوئی دباؤ یا تناؤ نہیں تھا بلکہ ان کو آرام دہ ماحول بھی مہیا کیا گیا پھر بھی وہ اس پزل کو حل نہیں کر سکے۔

ثابت ہوا کہ مزاح ہمارے کام کی توانائی کو مؤثر انداز میں تبدیل کر دیتا ہے لہٰذا ہر کام کرنے والی جگہ پر ہلکا پھلکا مزاح کا ماحول ہونا چاہیے تاکہ تمام افراد اپنے کام کو جلد اور اچھے انداز میں انجام دے سکیں۔

ڈیوڈ شینگ (David Cheng) آسٹریلیا نیشنل یونیورسٹی میں محقق ہیں۔ وہ اس بات پر ریسرچ کر رہے ہیں کہ کیا ٹیم کی کارکردگی بڑھانے کے لیے مزاح کا ماحول ترتیب دینا چاہیے؟ ان کا کہنا ہے کہ یقیناً آپ تمام دن مزاحیہ ویڈیوز نہیں دکھا سکتے لیکن کبھی کبھار کا مذاق بہت مفید ہے۔ چاہے وہ کسی لطیفے کی صورت میں ہو، کوئی ویڈیو یا پھر کوئی واقعہ یا ای میل۔ اس سے کارکنوں کی کارکردگی حیرت انگیز طور پر بڑھے گی اور ایسا آپ اس وقت بھی کر سکتے ہیں جب کام کا دباؤ بہت زیادہ ہو اور کارکن ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ محسوس کر رہے ہوں۔ ایسے ماحول میں ہلکی سی مسکراہٹ ان کی جسمانی و ذہنی کلفت دور کر کے ان کو پھر سے کام کے لیے تازہ دم کر دیتی ہے۔

انتشار سے دور رہیے

مناسب طریقے سے ارتکاز حاصل کرنے کے لیے آپ

کا تمام بیرونی اور غیر ضروری پریشانیوں وخلفشار سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے۔

یونیورسٹی کالج لندن کی ماہرِ نفسیات نیلی لاوی نے ۱۹۹۵ء میں اپنی لوڈھیوری میں بتایا تھا کہ ایک وقت میں ہمارا دماغ بیرونی دنیا سے کس حد تک معلومات حاصل کر کے اس پر عمل کر سکتا ہے۔ ان کے مطابق جب ہمارے دماغ کے تمام حصوں میں معلومات بھر جاتی ہیں تب دماغ میں توجہ کا نظام فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی معلومات غیر ضروری ہیں۔ ان کو نکال باہر کرنا ہے اور کن پر فوکس کرنا ہے۔

لاوی اپنے تجربات کے نتائج بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہم صاف اور پرسکون ماحول میں بہتر کام کر سکتے ہیں بہ نسبت گندے اور پرشور ماحول کے۔ مثال کے طور پر اگر ہم دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ہماری میز فضول چیزوں سے بھری ہوئی ہے یا اس کے اردگرد گندگی ہے تو ہمارا دماغ اپنے کام پر توجہ نہیں کر پائے گا۔ تب بار بار دھیان اس گندگی کی طرف جاتا ہے۔ جیسے ہی ماحول صاف ہو جائے تو وہ ذہنی خلفشار ختم ہو جاتا ہے۔

ہمارا دماغ ان کے متعلق سوچنا چھوڑ کر کام پر توجہ دیتا ہے پھر دماغ فوکس کرتا ہے کہ کون سا کام زیادہ اہم ہے اور اس پر پہلے کام کیا جائے، باقی غیر ضروری باتیں پس پردہ چلی جاتی ہیں۔

روزمرہ زندگی میں دماغی طور پر ایک کام پر توجہ دینا اور اس کو غیر ضروری سوچوں میں بھٹکنے سے بچانا بہت مشکل ہے لیکن اس حوالے سے کوشش کی جاسکتی ہے۔ ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ریڈیو آن کر لیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ اپنے دماغ کو کام میں اس طرح مصروف رکھیں کہ اسے کسی اور جانب سوچنے کا موقع نہ ملے۔

کام کرنا ترک کر دیں

تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ جب آپ مسلسل کام کرتے رہیں تو کام کی رفتار نہ صرف سست ہوتی بلکہ کارکردگی بھی متاثر ہونے لگتی ہے۔ اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ آپ کچھ دیر کے لیے کام کرنا ترک کر دیں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں تحقیقات سے ثابت ہوا کہ قدرتی طور پر ہم مسلسل فعال اور سرگرم ہو کر کام نہیں کر سکتے۔ ہمارا دماغ صرف نوے منٹ تک مسلسل ایک کام پر توجہ اور ارتکاز

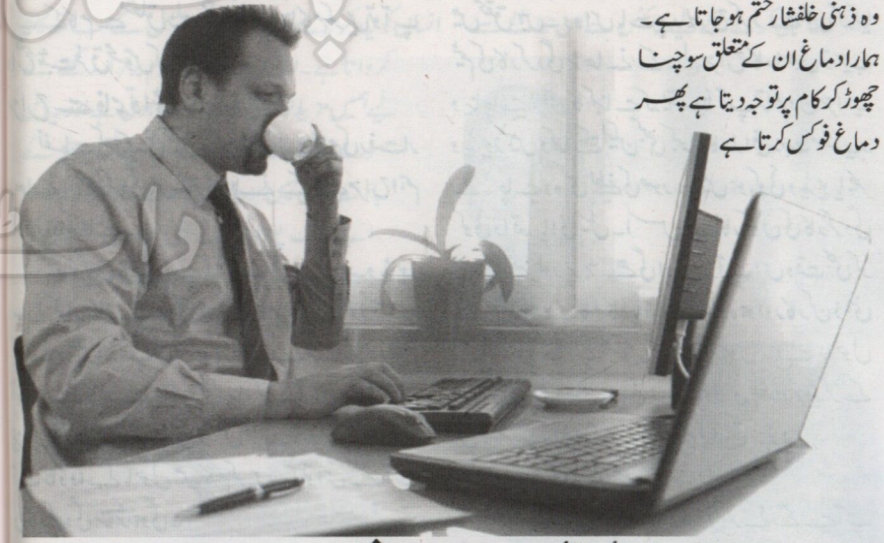

کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ اس دوران بھی پندرہ منٹ کی بریک ضروری ہوتی ہے۔

ایک اور تحقیق کے مطابق کام سے چند سیکنڈ کی بریک بھی فائدہ مند ہوتی ہے۔ اگر انسان مسلسل ریاضی کی کوئی پیچیدہ مشق کر رہا ہے اور وہ چند سیکنڈ کی بریک لے کر کھڑکی سے باہر دیکھ لے یا پھر جب بھی کسی معاملے پر سوچ بچار درکار ہو یا کسی فیصلے پر پہنچنا مقصود ہو، تو دیوار یا کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا بھی تازہ دم ہونے کے لیے کافی ہے۔

وقفے کے دوران ورزش کرنا بہت اچھی چیز ہے۔ یہ دماغ کو مزید کام کرنے کے لیے دوبارہ سے تیار کر دیتی ہے۔ خاص طور پر اگر آپ ایسے مشروبات پئیں جن میں کیفین ہو اور اس کے بعد ورزش کریں تو یہ زیادہ سودمند ہے۔ فطرت کا حسن اور قرب یکسوئی میں اضافہ کرتا ہے۔ خوبصورت مناظر، کھلی تازہ ہوا، پانی کی آبشار یا جھیل، پھول اور سبزہ ذہن اور آنکھوں کو طراوت بخشتا اور مزاج خوشگوار کرتا ہے۔ نتیجتاً یادداشت بہتر ہو جاتی ہے، ذہن بھٹکتا نہیں اور توجہ ایک نقطے پر مرکوز کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے ورزش اگر باہر کھلی فضا اور قدرتی ماحول میں کی جائے تو یہ توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت کو مزید نکھار کر دماغی صحت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

مراقبہ ایک اور اچھا انتخاب ہے۔ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہے کہ جو لوگ باقاعدگی سے مراقبہ کرتے ہیں وہ اپنے ذہن کو بآسانی کام پر مرکوز کر سکتے ہیں بہ نسبت ان کے جو یہ نہیں کرتے۔ ذہنی گردوغبار جھاڑنے، تازہ دم ہونے اور خوبصورت خیالات وتصورات کو پروان چڑھانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ مراقبہ کرنے والے افراد وقفے کے بعد تازہ دم ہو کر اپنے امور انجام دیتے ہیں۔

بعض لوگوں کو آرام، ورزش اور مراقبہ کرنے میں دقت ہوتی ہے کیونکہ ان پر وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس وقت کی کمی ہو وہ وہ کافی یا چائے کا ایک کپ پی کر خود کو تازہ دم کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں کیفین ہوتی ہے۔ کیفین مختصر وقت میں توجہ کو ایک چیز پر مرکوز کرنے، فوری ردعمل اور ذہن کو بہتر بنا دیتی ہے لہٰذا اس چیز کا انتخاب آپ خود کریں کہ بریک کے دوران کیا کرنا ہے۔

کام میں وقفہ بہتر ہے

جب آپ کو طویل عرصے کے لیے توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا وقفہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ممتاز امریکی ماہرِ نفسیات جوئے ڈی گوٹس اور مائیک ایسٹر مین کہتے ہیں اگر طویل عرصے تک کسی بھی کام پر توجہ رکھنی ہو تو بہترین حکمتِ عملی یہ ہے کہ پہلے مختصر وقت کے لیے فوکس بنائیں اور چھوٹی سی بریک لیں پھر دوبارہ کام پر ارتکاز کریں۔ جو لوگ ہر وقت ارتکاز سے کام کرنے کی کوشش کرتے اور بریک نہیں لیتے، وہ زیادہ غلطیاں کرتے ہیں۔

وریج یونیورسٹی آف ایمسٹرڈیم کے کرسچین اولیورز بھی اسی قسم کی تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق جو لوگ مکمل طور پر توجہ اور ارتکاز حاصل کرنے سے پہلے ہلکے پھلکے انداز میں مختلف چیزوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور پھر اپنے ہدف پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، ان کے دماغ میں مختلف النوع قسم کے آئیڈیاز آتے ہیں۔ وہ اپنے کام کو زیادہ مؤثر طریقے سے انجام دے پاتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم یہ تحقیق کریں اور جانیں کہ ہم اپنے دماغ کو تناؤ سے دور رکھ کر کام کس طرح کر سکتے ہیں کیونکہ تناؤ ارتکاز کا دشمن ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو وقت دیں کیونکہ اگر آپ پرسکون ہوں گے تبھی آپ کا دماغ ٹھیک طرح سے کام کر سکے گا۔ ◆◆◆

سنسان جنگل میں انسان اور حیوان کے درمیان زندگی اور موت کی کشمکش

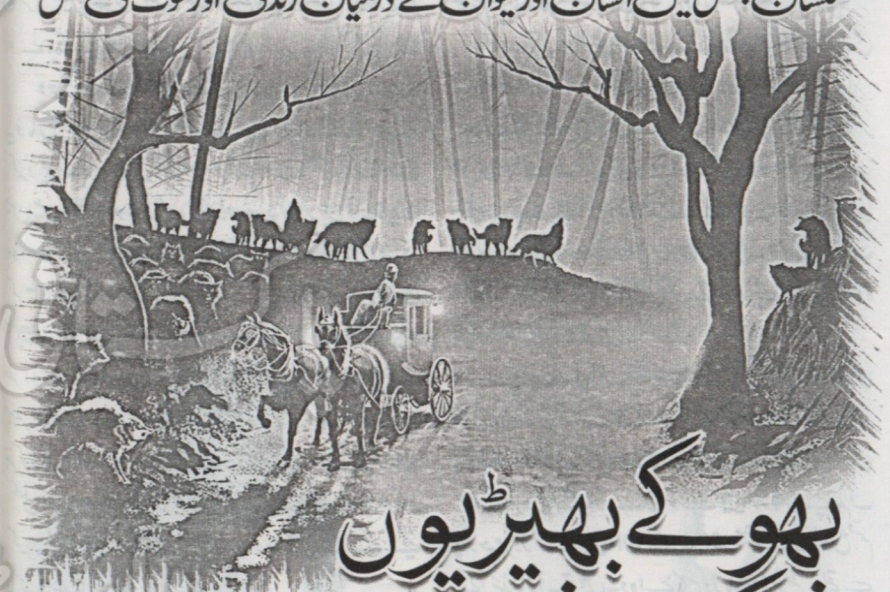

بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں

ٹوم بولٹن/صبا عمران

آج سے کئی برس پرانا قصہ ہے کہ مجھے کاروباری مصروفیات کی بنا پر روس کے ایسے علاقے میں جانا پڑا جہاں جنگلات کی کثرت ہے۔ دراصل میری کمپنی کی وہاں پر قائم ایک شاخ میں کرپشن اور بے ایمانی کے ثبوت سامنے آئے تھے۔ یہ جنوری کے آخری دن تھے اور موسم ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اُس علاقے میں شکار کے لیے بہت سے جانور مل جاتے ہیں۔ سو میں نے ڈھیر سارے کارتوس، بندوق اور رائفل بھی ساتھ لے لی۔

آدھے سے زیادہ سفر تو میرا ریل گاڑی پر آرام سکون سے چائے پیتے اور کتاب پڑھتے گزر گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ہفتے بھر سے برف نہیں پڑی تھی اور پٹڑی بالکل صاف تھی۔ ورنہ ان علاقوں میں برفباری کی وجہ سے اکثر ریل کو رُکنا پڑتا ہے۔ سو میرا سفر بغیر وقفوں کے جلد ہی کٹ گیا۔ میرا پہلا پڑاؤ اڈالہ نامی قصبے میں تھا۔

ضروری کام نمٹانے کے بعد میں تقریباً دو سے تین گھنٹوں میں دوبارہ عازمِ سفر ہوا۔ اب کی بار میری سواری گھوڑوں والی بگھی تھی جس کا انتظام میں نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ یہ نہایت مضبوط بگھی تھی۔ اس کو کھینچنے کے لیے تین گھوڑے تھے۔ اس پر چھت بھی تھی اور قالین بچھا ہوا تھا

تاکہ دورانِ سفر سستایا جا سکے۔

اڈالہ سے آگے سڑک بہت خراب تھی۔ اس پر گہری برف پڑی تھی۔ برف کے بڑے بڑے ڈھیلے ٹوٹی پھوٹی سڑک کو مزید ناہموار کر رہے تھے۔ گھوڑے بھی بار بار گرتے اور سنبھلتے۔ کبھی کوچوان بھی بار بار جھٹکے لگتے اور کبھی وہ بُری طرح اچھل جاتی۔ کوچوان بے چارا خود کو سنبھالتا اور اپنی بدقسمتی کو کوسنے لگتا۔

کبھی وہ سڑک کو، کبھی گھوڑوں اور کبھی برف کو گالیاں دینے لگتا اور کبھی کبھی اس کی توپوں کا رُخ میری طرف ہو جاتا۔ وہ میری رائفل دیکھ کر سمجھ رہا تھا کہ میں محض شکار کی نیت سے آیا ہوں۔ وہ اپنی زبان میں مجھے پاگل، جنونی اور خونریزی کا شوقین کہتا جس کو اتنی سردی میں بھی چین نہیں تھا۔ تمام رات سفر جاری رہا۔ میری آنکھ لگ جاتی مگر وقتاً فوقتاً لگنے والے بڑے بڑے جھٹکوں سے کھل جاتی۔ اگلے دن ہم نے ایک سرائے میں پہنچ کر گرم گرم کھانا کھایا۔ گھوڑوں کو تازہ دم کیا اور سفر پھر سے شروع ہو گیا۔

سفر کے چوتھے دن جب ہم گھنے جنگل سے گزر رہے تھے، بہت سے بھیڑیے سڑک پر آ گئے اور میلوں تک ہمارا پیچھا کرتے رہے۔ میں اُن سے خوفزدہ نہیں تھا مگر میرا کوچوان بہت گھبرا گیا۔ گھوڑے بھی خوفزدہ ہو کر تیز تیز بھاگنے لگے۔ اچانک ایک کالے بھیڑیے نے لمبی سی قلانچ بھری اور اچھل کر ہمارے سامنے آ کر غرانے لگا۔ میں نے کوچوان کو بگھی روکنے کا اشارہ کیا۔ اپنا ریوالور نکالا اور اُس کے کندھے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ زخمی ہوا اور دُم دبا کر جنگل میں اپنے بقیہ ساتھیوں کے پیچھے بھاگ گیا۔ کوچوان نے مجھے بتایا کہ وہ اس لیے گھبرا گیا تھا کہ پچھلے سال سردیوں میں اسی جگہ بھیڑیوں نے ایک بگھی پر حملہ کر کے دونوں مسافروں اور گھوڑوں کو کھا لیا تھا۔

میں نے روس میں بھیڑیے کے شکار کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مقامی لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ بگھی میں بیٹھ کر جنگل سے گزرتے۔ گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا رسی کے ذریعے بگھی سے باندھ لیتے۔ ایسا وہ بھیڑیوں کو متوجہ کرنے کے لیے کرتے تھے۔ بھیڑیے گوشت کی خوشبو پا کر بگھی کے پیچھے آتے تو اس میں بیٹھے شکاری اُنھیں شکار کر لیتے۔ میں نے بھی دل ہی دل میں ایسی ہی کسی مہم کا ارادہ کر رکھا تھا۔ حالانکہ میرا کوچوان مجھے وقتاً فوقتاً بھیڑیوں کی سفاکی اور خونخواری کے قصے سنا سنا کر میرا دل دہلا رہا تھا مگر میرا ارادہ بھی پختہ تھا۔

پانچویں رات میں اپنی منزل پر پہنچا۔ کھانا کھایا اور پُرسکون ہو کر سویا۔ اگلی صبح میں نے اپنے کاروباری کام نمٹائے جن کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا تھا۔ مقامی منیجر اور اکاؤنٹنٹ بے ایمانی کے مرتکب پائے گئے۔ میں نے دونوں کو فارغ کر دیا۔ سو میرے کندھوں پر بہت سا کام آ پڑا اور میں اُلجھی گتھیاں سلجھانے اور کھاتے درست کرنے میں ایسا مصروف ہوا کہ دس دن بعد ہی فارغ ہوا۔ اس دوران بہت زیادہ برف باری ہوتی رہی۔ رستوں پر دبیز برف کی تہیں چڑھ چکی تھیں۔

اب میرے پاس کچھ وقت تھا تو میں نے سوچا کیوں نہ اپنا شکار کا شوق پورا کر لیا جائے۔ جب میں آیا تھا تو یہاں مجھے کیپٹن کومینوف ملا جو ساتھ والے گاؤں کا جاگیردار اور ہر قسم کے شکار میں ماہر تھا۔ میں نے اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ ہنسنے لگا اور پھر اُس نے بتایا کہ وہ خود بہت سے بھیڑیے شکار کر چکا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں جب چاہوں وہ میری اعانت کے لیے میرے ساتھ جانے کو وقت نکال لے گا۔

جب دس دن بعد مجھے فرصت نصیب ہوئی تو میں نے کیپٹن سے اپنی خواہش پوری کرنے کا ذکر کیا۔ اُس نے فوراً تین گھوڑوں والی بغیر چھت کے بگھی کا انتظام کر لیا۔ ہم ریوالور، بندوق، ڈھیر سارے کارتوس اور شکاری چاقو وغیرہ سے پوری طرح مسلح اور ہر ناگہانی سے نمٹنے کے لیے تیار ہو کر اپنی مہم پر نکلے۔ ہمارا کوچوان بھی شکاری تھا اور کئی بھیڑیے شکار کر چکا تھا۔ اُس کا نام ایوان تھا۔ وہ نہایت منجھا ہوا کوچوان تھا اور بڑی مہارت سے دبیز برف پر بگھی دوڑا رہا تھا۔

رات صاف اور پُرسکون تھی۔ ہم نے خود کو گرم رکھنے کے

لیے تھرماس میں کافی، کچھ کھانے پینے کا سامان اور ایک کمبل رکھ لیا تھا۔ گاؤں سے دور اور جنگل کی حدود میں پہنچ کر ہم نے وہ گوشت تھیلے سے نکالا جو ہم چارے کے طور پر استعمال کرنے ساتھ لائے تھے۔ اُسے چالیس گز لمبی رسی سے باندھ کر اس کا دوسرا سرا بگھی کے ساتھ باندھ دیا۔ یہ پورے چاند کی رات تھی اور چاندنی برف سے منعکس ہو کر دن کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ دو گھنٹے تک ہم نہایت آہستگی سے جنگل میں پھرتے رہے مگر بھیڑیے نظر نہ آئے۔

کیپٹن کہنے لگا ''نجانے کہاں چلے گئے ہیں سارے ورنہ بھیڑیوں کی موجودگی کے حوالے سے یہ جگہ تو بہت مشہور ہے۔''

ہمارا کوچوان ایوان مسکرانے لگا اور بولا ''گھبراؤ نہیں کیپٹن، میں دوبارہ چکر کاٹتا ہوں۔ شاید تمھیں اپنی بندوق استعمال کرنے کا موقع مل ہی جائے۔'' ابھی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ ہمیں اپنی دائیں سمت سے ایک بھیڑیے کی غراہٹ سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ ہم رک گئے۔

جلد ہی ہم نے بہت سے بھیڑیوں کی آوازیں سنیں۔ گھوڑوں نے بھی اُن کی غراہٹیں سن لی تھیں۔ سو وہ گھبرا کر خود کو چھڑوانے کی کوششیں کرنے لگے۔ وہ زور زور سے ہنہنانے لگے مگر ایوان نے انھیں قابو میں رکھا۔ کچھ ہی دیر بعد جنگل سے بہت سے کالے نقطے نمودار ہوئے جو تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ بھیڑیے تھے جو نہایت خاموشی سے ہمارے قریب ہونے لگے۔ ہم نے اپنے کوٹ اتارے اور بندوقیں تیار کر لیں۔

گھوڑے بری طرح خوفزدہ تھے۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتے اور گھبرا کر اور تیز بھاگنے لگتے۔ ایوان اُن کو قابو کرنے میں ہلکان ہو رہا تھا۔ بھیڑیے پوری دلیری سے یوں ہماری طرف بڑھ رہے تھے جیسے ہم شکاری نہیں کوئی ہرن ہوں اور وہ ہمیں شکار کرنے آئے ہیں۔ میں نے ایک تومند بھیڑیے کا نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ وہ ایک دم اچھلا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ میری اگلی دو گولیوں سے دو مزید بھیڑیے ٹھنڈے ہو گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ باقی ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ مگر یہ کیا ہوا...... وہ لمحہ بھر رکے اور اپنے مردہ ساتھیوں کو منٹوں میں چٹ کرنے کے بعد دوبارہ ہمارا پیچھا کرنے لگے۔ اب ایوان گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ ''دعا کرو ہم زندہ یہاں سے نکل جائیں کیونکہ جب یہ اس طرح ایک دوسرے کو کھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شدید بھوکے ہیں اور ہر چیز کھا جائیں گے۔'' یہ کہہ کر ایوان نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اور انھیں تیز بھاگنے کا حکم دیا۔

ہماری رفتار بڑھتے ہی بھیڑیوں نے بھی تیزی پکڑ لی۔ پھر ایوان ایک دم چیخا اور اس نے گھوڑوں کا رخ یوں اچانک موڑا کہ بگھی الٹنے لگی تھی۔ میں اور کیپٹن کمبل پر گر گئے اور بندوقیں ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ دراصل ہمارے سامنے سے بھی بھیڑیوں کا ایک غول اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ایوان کو اچانک رخ بدلنا پڑا۔ وہ اب ہم سے بس چند گز دور تھے۔ میں اور کیپٹن جلد سنبھل گئے۔ میں نے رائفل سنبھال لی اور بنا رکے گولیاں چلانے لگا۔ بھیڑیے چند لمحے رکتے، اپنے مرے ساتھیوں کو منٹوں میں ہڑپ کرتے اور زیادہ تیزی سے ہمارا پیچھا کرنے لگتے۔

اب کیپٹن نے چارے والے گوشت کی بھی رسی کاٹ دی۔ وہ اُس پر جھپٹے اور ہم نے فائر کھول دیا۔ اُن میں سے بہت سے مر گئے مگر باقی بغیر رُکے، تھکے یا ڈرے ہمارے قریب پہنچ گئے۔

صورت حال بہت گمبھیر اور جان لیوا ہو چکی تھی۔ خون کے ذائقے اور خوشبو سے اُن کی بھوک دوچند ہو گئی تھی۔ بھیڑیوں کا بھوک سے پاگل گروہ موت کی سی بے رحمی سے ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ اُن کے کالے جسم سفید برف پر اُچھل رہے تھے۔ آنکھوں اور لمبے باہر نکلے دانتوں کی چمک اور ٹپکتی رالیں ہمیں بتا رہی تھیں کہ اگر اس وقت بگھی یا گھوڑوں کو کچھ ہوا تو ہم لمحوں میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

کیپٹن کہنے لگا ''وہ ہمارے انتہائی قریب پہنچ چکے۔ اگر انھوں نے گھوڑوں پر حملہ کر دیا تو ہماری موت یقینی ہے۔ اس لیے تم دائیں طرف سے آگے بڑھنے والوں کو مارو اور میں بائیں طرف سے مارتا ہوں تاکہ یہ گھوڑوں تک نہ پہنچ سکیں۔''

ایک میل تک ہم مسلسل گولیاں چلاتے رہے۔ وہ مرتے رہے مگر ڈھٹائی سے ہمارا پیچھا بھی جاری رکھا۔ اچانک ایک بھیڑیا اچھل کر کیپٹن کی سمت سے گھوڑے پر جھپٹا۔ کیپٹن کی گولی اُسے نہ لگ سکی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنا رخ موڑا اور اُسے گولی ماری دی مگر اس دوران گھوڑا خوفزدہ ہو کر لڑکھڑا گیا لیکن ایوان بہت ماہر کوچوان تھا۔ اُس نے جلد ہی اُسے سنبھال لیا اور بگھی کا رخ ایک خالی مکان کی طرف موڑ دیا جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔

کیپٹن کہنے لگا ''مجھے پتا ہے یہ کہاں جا رہا ہے۔ جو صورت حال بن گئی ہے ہم وہاں پہنچ کر ہی زندہ بچ سکتے ہیں۔ وہ بھی صرف اس صورت میں کہ مکان کا دروازہ کھلا ہو۔''

''یہ مکان ہی ہماری آخری امید تھا۔'' ایوان نے کہا ''تیار رہو۔ اپنے ہتھیار سنبھال لو۔ میں جیسے ہی کہوں، چھلانگ لگا دینا۔''

کچھ دیر بعد ہی چھوٹا سا ایک مکان نظر آنے لگا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ جیسے ہی بگھی رُکی ہم کندھوں پر کوٹ، اپنے بیگ اور دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھامے فائر کرتے نیچے اُترے۔

بھیڑیے ایک دم رک گئے جیسے ہمارے اس طرح رکنے پر کشمکش و پیچ میں ہوں۔ اسی دوران کیپٹن نے گھوڑوں کی لگامیں کھول دیں۔ وہ جنگل کی طرف بھاگے تو ہمارے بھوکے قاتلوں میں سے بھی چند اُن کے پیچھے ہو لیے۔ اس دوران کیپٹن ایک زوردار دھکے سے دروازہ کھول چکا تھا۔ شکر ہے اس پر تالا نہیں لگا تھا ورنہ ہماری موت یقینی تھی۔ ہم تینوں جلدی سے اندر داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

یہ لکڑی کا خاصا مضبوط دروازہ تھا۔ ایک کمرے کا یہ چھوٹا سا مکان اس وقت ہماری پناہ گاہ بن گیا۔ مکان کے ارد گرد جلد ہی بھیڑیوں کا ڈھیر لگ گیا اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے پنجوں سے دیواریں کھرچنے لگے۔ اس میں سے کچھ دروازے پر زور آزمائی کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب ہماری سانسیں بحال ہوئیں تو ہم نے دیکھا کہ دیواروں میں دو سوراخ بنے ہوئے تھے جو شاید اسی لیے بنائے گئے تھے کہ باہر موجود خونخوار جانوروں پر گولی چلائی جا سکے۔ سو ہم نے بھی ان سوراخوں میں رائفلیں رکھ کر ایک بار پھر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ جب ہم پچیس سے تیس کے قریب کو جہنم رسید کر چکے تو بقیہ بھیڑیے مکان سے ذرا ہٹ کر ان کو کھانے میں مصروف ہو گئے۔

ان کی غراہٹیں اور ہڈیاں چبانے کی آوازیں ہمارا دل دہلا رہی تھیں۔ وہ چند منٹوں میں ہی اپنے مردہ ساتھیوں کو چٹ کر گئے اور مکان کے گرد غراتے رہے۔ ہم نے اپنا کھانا کھایا، کافی پی اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہمیں پوری امید تھی کہ صبح ہوتے ہی وہ چلے جائیں گے۔ ہمیں مایوسی نہیں ہوئی۔ جیسے ہی سورج کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی، بھیڑیوں کا غول جنگل کی جانب کھسکنا شروع ہو گیا مگر وہ خونخوار اور درزیدہ نظروں سے یوں مڑ مڑ کر مکان کی طرف دیکھتے جیسے ہمارے زندہ بچ جانے پر کف افسوس مل رہے ہوں۔

جب دن پوری طرح نکل آیا تو ہم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلے۔ وہاں سے گاؤں کا فاصلہ تقریباً پانچ میل کا تھا۔ ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ پوری طرح مسلح آدمیوں کا ایک دستہ جو ہماری ہی تلاش میں آ رہا تھا ہمیں مل گیا۔ دراصل ہمارا ایک گھوڑا بچ کر گاؤں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گاؤں والوں نے گھوڑے کی زخمی حالت اور کٹی ہوئی لگاموں سے اندازہ لگا لیا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بے چارے باقی کے دونوں گھوڑوں کی ہڈیاں مکان سے کچھ فاصلے پر ہی ہمیں مل گئی تھیں۔

اس خوفناک تجربے نے بھیڑیے کے شکار کا میرا سارا شوق ہرن کر دیا۔ میں کئی ہفتے وہاں رہا اور چھوٹے موٹے شکار کیے مگر بھیڑیے کو دوبارہ دیکھنے اور شکار کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ◆◆◆

شامی یتامیٰ کے درمیان

ڈاکٹر آصف محمود جاہ
(ستارہ امتیاز)

بیرون ممالک سرگرم ایک ہمدرد پاکستانی سماجی کارکن کی دل افروز یادیں

حضرت بدیع الزماں نورسی کی آرام گاہ کے قریب مدرسہ کے دو ترک طالب علم ملے۔ بڑی محبت سے گلے لگایا۔ گال سے گال ملائے اور بتانے لگے کہ یہ جگہ علامتاً حضرت بدیع الزماں نورسی کی آخری آرام گاہ ہے کیونکہ ۱۹۶۰ء میں افواج نے یہاں سے حضرت بدیع الزماں کی میت کو نکالا اور نامعلوم مقام پر پھینک دیا تھا۔ وہ چالیس سال جیل میں گزارنے کے بعد خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بشارت ملنے پر ادرفہ آئے تھے اور اسی جگہ ان کا آنے کے تین دن بعد انتقال ہوا۔ ان کے جنازے میں ملک بھر سے ان کے شاگرد لاکھوں کی تعداد میں شامل ہوئے۔

دونوں طالب علم عبدالقادر نورزادہ اور محی الدین بڑے ادب کے ساتھ بدیع الزمان نورسی کا نام لے رہے تھے اور ان کی تعلیمات کا ذکر کر رہے تھے۔ ترکی میں آکر احساس ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کا رشتہ کتنا مضبوط اور مقدس ہے کہ ایک دفعہ السلام علیکم کہنے سے سارے فرق مٹ جاتے ہیں۔

زمان و مکان کی قید سے بندہ آزاد ہو جاتا ہے۔

صرف ایک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی رہ جاتی ہے۔ ترک ویسے ہی پاکستان سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

جھیل کے ساتھ والی مسجد پہلے چرچ تھا۔ اسے خلیفہ مامون الرشید کے دور میں مسجد بنا دیا گیا۔ اس پورے کمپلیکس میں ایک بڑی مسجد کے علاوہ ایک اور مسجد بھی ہے جہاں باقاعدہ پانچ وقت نماز ادا کی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی جائے پیدائش، آگ سے گل گلزار بننے والی جھیل اور اس میں تیرتی مچھلیاں دیکھ کر دل کو قرار اور سکون حاصل ہوا اور اللہ کا لاکھوں بار شکر ادا کیا جس نے یہاں

بلایا اور مقدس جگہوں کی زیارت کروائی۔

ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی جھیل اور سنہری مچھلیاں

ناشتے سے فارغ ہو کر سب ساتھیوں نے خلیل اللہ کمپلیکس کی طرف رخ کیا۔ صبح کے وقت زائرین کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ ساتھیوں نے بڑی عقیدت سے ابراہیم علیہ السلام کے نام سے منسوب جھیل کی زیارت کی اور مچھلیوں کو دانہ ڈالا۔ جھیل کی رنگ برنگ مچھلیاں خوب اچھل کود رہی تھیں اور موٹی تازی تھیں کیونکہ ان مقدس مچھلیوں کو کوئی نہیں پکڑتا۔ مولد النبی علیہ السلام کی ایک دفعہ پھر زیارت کی۔ روایات ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہونے والی تھی تو نمرود کو کاہنوں نے بتایا کہ تمھارا دشمن پیدا ہونے والا ہے۔ اس نے کوشش کی کہ ابراہیم علیہ السلام پیدا نہ ہوں اور تمام حاملہ عورتوں کو اس عرصے کے دوران قتل کرنا شروع کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ ان غاروں میں آکر بیٹھ گئیں اور یہیں انہوں نے جنم لیا۔

نمرود کی بیٹی کا قبول اسلام

جب نارِ نمرود گل و گلزار بنی تو نمرود کی ایک بیٹی اللہ کا یہ معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گئی۔ نمرود نے اپنی بیٹی کو بھی آگ میں پھینکوایا اور اسے جلتا دیکھتا رہا۔ اللہ نے اس جگہ سے بھی پانی جاری کر دیا اور وہاں ایک پھول اُگ آیا۔ اسی جگہ اس شہید بیٹی کے نام کی جھیل بنی ہوئی ہے۔ جھیل کے اوپر اس جگہ کا دور سے مشاہدہ کیا جہاں سے منجنیق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نیچے پھینکا گیا۔ سینکڑوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے۔ اس لیے نیچے سے ہی دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اوپر سے نیچے جھیل تک کے فاصلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت بڑی آگ جلائی گئی تھی اور اس کا پھیلاؤ دور دور تک تھا۔ اس کے قریب سے جو بھی پرندہ گزرتا جل کر راکھ ہو جاتا۔

روایات میں ہے کہ ایک چڑیا اپنی چونچ میں بار بار پانی لا رہی ہے اور آگ پر اوپر سے ڈالتی جا رہی ہے۔ کسی نے چڑیا سے کہا کہ تیرے پانی کے چند قطروں سے اتنی بڑی آگ پر کیا اثر ہوگا؟ چڑیا نے کہا، آگ بجھے نہ بجھے میرا نام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی گئی آگ بجھانے والوں میں شامل ہو جائے گا۔

یتیموں کے سر پہ ہاتھ

مسجد ابراہیم علیہ السلام سے نکل کر حیرۃ Yardim کے تعاون سے چلنے والے ایک یتیم خانے میں گئے جہاں شام سے آنے والے یتیم بچے قیام پزیر تھے۔ ادرفہ کی پرانی گلیوں سے گزرتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ پرانے دور سے لے کر اب تک یہاں ہر چیز ایک سسٹم اور ترتیب کے تحت بنائی جاتی ہے۔ پرانی گلیاں اور سڑکیں بھی صاف تھیں۔ کہیں گندگی، گندے پانی یا کوڑا کرکٹ کا نشان تک نظر نہ آیا۔

یتیم خانے میں شام سے ہجرت کر کے ادرفہ میں آ بسنے والے گورے چٹے، لال سرخ گالوں اور نیلی آنکھوں والے ننھے فرشتے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ اہلاً وسہلاً کہہ کر استقبال کیا۔ پھول جیسے معصوم بچوں کو دیکھ کر دل سے آہ نکلی کہ ان معصوموں کا کیا قصور تھا کہ انہیں گھروں سے نکال دیا گیا۔ ان کے ماں باپ کو شہید کر دیا گیا۔ اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ جس محبت و پیار اور اپنائیت سے اہل ترکی ان یتیموں کا خیال رکھ رہے ہیں۔ اس کے لیے اہل ترکی کو جزائے خیر عطا فرما اور ان کو دنیا میں بلندی اور سرفرازی عطا فرما۔

بچوں کے لیے اس دارالیتامیٰ میں بہترین انتظام ہے۔ رہائش کی صاف ستھری جگہ، صاف ستھرا باتھ روم، پڑھائی کے کمرے میں اے سی اور دوسری تمام سہولیات موجود ہیں۔ ادرفہ میں ایک چیز خاص طور پر دیکھی کہ سڑکوں، گلیوں، میدانوں اور گراؤنڈ میں صفائی کا اعلیٰ معیار موجود ہے۔ مجال ہے کہیں گندگی یا کوڑا کرکٹ نظر آئے۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بھی صفائی کا بہترین نظام ہے۔ لوگ بھی اجلے اجلے ہیں۔ کپڑے صاف ستھرے پہنتے ہیں۔ اندر کی طرح باہر سے بھی اجلے اور نکھرے نکھرے ہیں۔

یتیم خانے میں صفائی کا اعلیٰ معیار، بچوں کے لیے رہائش کی معیاری سہولتیں اور ان کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ..... یہ سارا سلسلہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ بچوں میں پھل تقسیم کیے اور رقم بھی دی۔ شام سے ہی آنے والے ایک سادہ طبیعت اور عاجز سے ٹیچر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہیں۔ حیرۃ کے عبداللہ نے بتایا کہ ہم ان بچوں کو تعلیم و تربیت کی اعلیٰ سہولتیں بہم پہنچا رہے ہیں تاکہ آگے جا کر یہ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں اور شام کا مستقبل بہتر بنانے کی خاطر اپنا کردار ادا کرنے کو تیار ہو جائیں۔

انہوں نے مزید بتایا کہ یہ ان کا ماڈل یتیم خانہ ہے۔ اس طرح کے یتیم خانے شام اور ترکی کے دوسرے شہروں میں بھی بنائے گئے ہیں اور مزید بنائے جا رہے ہیں کیونکہ یتیموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یتیم بچوں سے مل کر اور ان کا اچھا مستقبل دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ بچوں کو گلے سے لگایا اور ان کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جو یتیم کے سر پہ محبت سے ہاتھ پھیرتا ہے اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آتے ہیں اللہ تعالیٰ اتنے گناہ معاف فرما دیتا ہے“۔

اورفہ کا تاریخی شہر اور غاروں میں گھر:

اورفہ قدیم شہر ہے۔ یہاں کی پرانی گلیاں بہت تنگ ہیں۔ استنبول کی نسبت یہاں مشرقیت زیادہ نظر آتی ہے۔ دین دار لوگوں کی اچھی بھلی تعداد موجود ہے۔ مسجدوں میں رش ہوتا ہے۔ نماز سے پہلے اور بعد میں ذکر اور اذکار کی آوازیں گونجتی ہیں۔ الروحہ ہوٹل سے نکلیں تو سامنے چھوٹے بڑے غار ہیں جن میں باقاعدہ گھر بنے ہوئے ہیں۔ یہ غار ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کے ہیں اور چار ہزار سال گزرنے کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ غاروں کے اندر جا کر پتا چلتا ہے کہ پتھروں کے یہ گھر ہزاروں سال گزرنے کے باوجود جوں کے توں پڑے ہیں۔ بعض گھر ایک قطار میں ہیں۔ روشنی اور ہوا کے آنے کا زبردست انتظام ہے۔ باہر گرمی بھی ہو تو اندر ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

اورفہ میں عرب بستے ہیں، ترک بھی ہیں اور کُرد بھی، ایشیائی لوگ بھی ہیں اور مذہبی تہذیب کے دل دادہ بھی۔ آرمینیا کے بھی کچھ لوگ موجود ہیں جو پرانی تہذیب کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ پارک میں ان کی شادی کا منظر دیکھا جس میں اونچی آواز میں ڈھول کی دھمک کے ساتھ گیت گائے جا رہے تھے اور رقص ہو رہا تھا۔ کئی محلوں، گلیوں اور بازاروں میں عربی میں لکھے بورڈ نظر آتے ہیں۔ ان پہ شامی علاقہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ عبداللہ نے بتایا کہ آرمینیائی لوگوں کی بھی یہاں اچھی خاصی تعداد تھی لیکن آرمینیا کے زیادہ تر باشندے جنگ عظیم دوم کے بعد یہاں سے چلے گئے۔

کارڈ دکھائیں اور لباس لے جائیں

اورفہ شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑی مارکیٹ پہنچے جہاں حیرۃ Yardim نے ایک بہت بڑا سٹور بنایا ہوا ہے۔ وہاں ہر قسم کے کپڑے، جوتے اور استعمال کی دوسری اشیاء موجود ہیں۔ سٹور کی انچارج عراقی خاتون نے بڑی صاف انگریزی زبان میں ہمیں خوش آمدید کہا اور بتایا کہ ہم یہاں شامی رجسٹرڈ فیملیز کو کارڈ دیتے ہیں۔ وہ جب چاہیں یہاں سے آ کر اپنے اور بچوں کے ماپ کے مطابق کپڑے اور جوتے لے جائیں۔ پچھلے تین ماہ سے کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کی طرف سے پہنچائے گئے کپڑے، بچوں کے کھلونے، بستے، کتابیں، عورتوں کے عبایا اور حجاب یہاں موجود تھے جو اسماء اور میں نے وقار کے ساتھ مل کر سٹور میں موجود شامی مہاجرین عورتوں اور بچوں میں تقسیم کیے۔ الحمد للہ! جس مقصد کے لیے سارے کپڑے اور دوسری اشیاء بھیجی تھیں، وہ ادھر آ کر پورا ہوگیا۔ شام کی نیک سیرت باپردہ بیبیوں کو عبایا اور حجاب ملے تو وہ خوش ہوگئیں۔ یتیم اور نادار بچوں کو لاہور سے بھیجے ہوئے گفٹ بھی دیے جس پر وہ خوش ہوئے۔

اورفہ کے مزیدار کھانے

شہر کے مرکز میں ایک روایتی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا

کھایا۔ استنبول میں کھانے پھیکے ملتے تھے لیکن اورفہ میں مرچوں والے بھی ملتے ہیں۔ کھانے کی میز پر پیازوں کی ٹوکری، دھنیا، پودینہ، کٹے ہوئے ٹماٹر، کھیرا اور چٹنی موجود ہوتی ہے۔ پیاز کی ٹوکری کے ساتھ چھری رکھی ہوتی ہے۔ پیاز کاٹیں، دھنیا اور پودینہ کے ساتھ ملا کر کھائیں۔ ہماری طرح پیاز بدبودار اور کڑوا نہیں ہوتا جس کو کاٹتے کاٹتے آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور سر چکرانے لگتا ہے۔

ترکوں کی صحت کا راز ان کی کھانے کی عادات ہیں۔ وہ لنچ مرچ سے بے نیاز پھیکے کھانے کھاتے ہیں۔ سبزیاں اور سلاد بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ زیتون کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ تلی ہوئی اشیاء بہت کم لیتے ہیں۔ کولا ڈرنکس کی بجائے فرحت بخش ”لسی“ پیتے ہیں۔ ترکی میں زیادہ تر لوگ سمارٹ اور صحت مند نظر آتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہیں جن کے پیٹ نکلے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسی وجہ سے ترکی میں دل کے امراض بہت کم ہیں۔

گھر گھر اشیائے ضرورت اور راشن کی تقسیم

کھانے کے بعد حیرۃ Yardim کے دفتر میں ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ادا کیں۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ حیرۃ فاؤنڈیشن والوں نے شامی مہاجرین کی لسٹیں بنائی ہوئی ہیں۔ ان لسٹوں کے مطابق وہ سب رجسٹرڈ خاندانوں کو باقاعدگی سے راشن وغیرہ بہم پہنچاتے ہیں۔ شامی مہاجرین کے محلوں میں ایک ایک گھر جا کر فوڈ پیکٹس، کپڑے، عبایا اور دوسرے تحائف تقسیم کیے۔ جس جگہ بھی گئے وہاں بچوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ ان پھول جیسے بچوں میں لاہور سے لائے ہوئے تحائف تقسیم کیے۔ بچے خوبصورت تحائف اور کھلونے حاصل کر کے بہت خوش ہوئے۔

اورفہ والوں کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی

حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کے شہر اورفہ کے لوگوں میں مہمان نوازی اور خوش اخلاقی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ روایات میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک ان کے ساتھ مہمان شامل نہ ہوں۔ ان کا لقب ہی مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے والا ہے۔ اورفہ والوں نے آج تک اس حسین روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

فجر کی نماز مسجد خلیل اللہ علیہ السلام میں پڑھنے اور ذکر کی محفل میں شرکت کے بعد واپس لوٹ رہے تھے کہ ایک ترک بھائی نے تعارف کے بعد دعوت دی کہ آئیں ہمارے ساتھ ناشتے میں شامل ہوں۔ مسجد سے دو سو میٹر فاصلے پر قادریہ سلسلے کی خانقاہ تھی جہاں مل کر لوگ ذکر و اذکار اور درود و سلام میں مصروف تھے۔ ساتھ ساتھ ناشتے کی تیاریاں بھی جاری تھیں۔ اورفہ کی خاص ڈش سرما ہے جو پتوں میں قیمہ کی طرح کی چیز ڈال کر بنائی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں اروی کے پتے بیسن میں تلے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ پنیر اور شہد سے بنا ہوا پاؤ ندری حلوہ موجود تھا۔ ذکر سے فارغ ہو کر تعارف ہوا۔ خانقاہ کے سجادہ نشین نے کہا کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ ہفتے میں چھ دن دور دراز سے آنے والوں کی خدمت کرتے تھے اور جب تک مہمان ساتھ شامل نہ ہوں، کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ذکر کی مجلس کے سربراہ نے پاکستان سے آنے والے مہمانوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہا اور کھانے کی دعوت دی۔ سرما اور خاص کر حلوہ اتنا لذیذ تھا کہ میں انگلیاں چاٹتے چاٹتے رہ گیا۔ میزبان بھی بھانپ گئے اور مجھے پوری پلیٹ پیش کر دی جو مزے لے کر ختم کی۔ سب مجھے ”استاذ“ کہہ کر پکار رہے تھے۔ آخر میں سب نے مجھے اجتماعی دعا کرنے کا کہا۔ اللہ سے عرض کیا کہ یا اللہ عثمانی دور کے سنہری ایام واپس لوٹا دے۔ ترکی کے مسلمانوں کو پھر سے مسلمانوں کا خلیفہ بنا دے۔ جس طریقے سے ترکی کے لوگ انصار مدینہ بن کر شام کے مہاجرین کی خدمت کر رہے ہیں، انہیں جزائے خیر اور بہتر بدلہ عطا فرما، عالم اسلام کے مسلمانوں کو اکٹھا کر دے۔ ان کے دُکھ تکلیف ختم فرما دے۔ یا اللہ

اغیار کی ریشہ دوانیوں سے بچا۔ (آمین)

مقام ایوب علیہ السلام

ذکر کی مجلس سے فارغ ہو کر ہوٹل کا رخ کیا جہاں حسیرۃ Yardim اور رفقہ کے روح رواں عبداللہ کردی موجود تھے۔ آج صبح سویرے مقام حضرت ایوب علیہ السلام جانا تھا۔ اور رفہ میں حضرت ایوب علیہ السلام صابر پیغمبر کے نام سے مشہور ہیں۔ تین دن پہلے ان کی یاد میں دن منایا گیا۔ سڑکوں اور میدانوں میں ایوب صابر پیغمبر علیہ السلام کے نام کے بڑے بڑے بینر آویزاں تھے۔ میں چشم تصور میں حضرت ایوب علیہ السلام کے غار میں بیٹھا صدیوں پہلے کے دور میں پہنچ گیا۔ اللہ کا بندہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہا ہے۔ کوئی بات سن رہا ہے، کوئی نہیں سنتا مگر اللہ کا بندہ، پیغمبر اپنا کام کیے جا رہا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام بڑے ہی صابر تھے یہاں تک کہ صبر ایوب علیہ السلام زبان زد عام ہے۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں جب آپ علیہ السلام کی آزمائش شروع ہوئی، اہل و عیال مر گئے۔ مال فنا ہو گیا کوئی چیز ہاتھ تلے باقی نہ رہی تو آپ علیہ السلام اللہ کے ذکر میں اور بڑھ گئے۔ کہنے لگے، "اے تمام پالنے والوں کے پالنے والے تو نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کیے، مال دیا، اولادیں دیں، اس وقت میرا دل بہت مشغول تھا۔ اب تو نے سب کچھ لے کر میرے دل کو ان فکروں سے پاک کر دیا۔ اب میرے دل میں اور تجھ میں کوئی حائل نہ رہا۔

آپ کی دعاؤں میں یہ بھی دعا تھی "اے اللہ! تو نے جب مجھے تونگر اور اولاد اور اہل و عیال والا بنا رکھا تھا تو خوب جانتا ہے کہ اس وقت میں نے نہ کبھی غرور و تکبر کیا نہ کبھی کسی پر ظلم و ستم کیا۔ میرے پروردگار تجھ پر روشن ہے کہ میرا نرم و گرم بستر تیار ہوتا اور میں راتوں کو تیری عبادت میں گزارتا۔ اپنے نفس کو اس طرح ڈانٹ دیتا کہ تو اس لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ تیری رضا مندی کی طلب میں، میں اپنی راحت و آرام کو ترک کر دیا کرتا تھا۔" (ابن ابی حاتم)

علم کے موتی

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جبرائیلؑ پہلی دفعہ غار حرا میں اللہ کا پیغام اقرا کے الفاظ کی صورت لے کر آئے۔ پھر پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو مومن کی گم شدہ میراث قرار دیا۔ مسلمانوں کو علم کی سب سے بڑی کتاب قرآن مجید کا تحفہ دیا جس میں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کا علم ہے۔ کتاب اور علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مشہور فلسفی ابن عربی کہتے ہیں "کتاب پھلوں کا ایسا باغ ہے کہ آپ اس میں ہر طرح کا پھل کھا سکتے ہیں۔" جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔ کتابوں کے بغیر درسگاہ ایسے ہی ہے جیسی طالب علموں کے بغیر اور ایک شہر کتب خانے کے بغیر ویران ہے۔ سقراط کہتا ہے "جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ زندہ مردوں کا قبرستان ہے۔"

افسوس کہ آج کا معاشرہ کتابوں سے کوسوں دور ہے اور یہ فاصلہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید کے دور میں وزرا و امرا کی حیثیت کا اندازہ اُن کے ذخیرہ کتب سے لگایا جاتا تھا۔ جس کے پاس جتنا بڑا ذخیرہ کتب ہوتا اُس کو زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ جبکہ ملک عزیز کے سابق صدر پرویز مشرف نے ایک غیر ملکی دورے کے دوران ایک پاکستانی سفارت کار کے پاس وافر مقدار میں کتابیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور تعجب سے پوچھا "آپ اتنی زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں؟" یعنی وہ کتب بینی کو وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔

(مرسلہ: احسان اللہ گھرتل، چک ۴۲ ارب، فیصل آباد)

ایک پُراسرار پاگل بوڑھے کو دیکھ کر اُسے اپنا باپ یاد آگیا

ملاقات

علی اکمل تصور

وقار دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ ٹائی کی گرہ میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی بیوی بولی:

"آپ سے کتنی بار کہا ہے مگر آپ سنتے ہی نہیں......"

"سن تو رہا ہوں۔ کیا کہا ہے...... میں نے تو کچھ بھی نہیں......"

"آپ ہر بات کو ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔" اس نے شکوہ

"نہیں تو...... کیا کہا ہے......؟" وقار فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

"یہی کہ کبھی ابو جی سے بھی مل آیا کریں۔" یہ وہ لمحہ تھا گرہ درست ہو چکی تھی۔ اب جو وقار نے ایک دم ٹائی کھینچی تو کھانسی سی آگئی۔ اس کی بیوی گھبرا گئی۔ وہ اس کے لیے گلاس لے آئی۔ ایک گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا:

"ہاں تو کیا کہا تم نے کہ کبھی ابو سے بھی ملنے چلا جاؤں۔ تو سوچتا میں بھی ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ ابو سے مل آؤں مگر وقت ہی نہیں ملتا۔ زندگی اتنی تیز رفتار ہو چکی ہے نا کہ بس کیا بتاؤں۔ گھر سے دفتر...... دفتر سے گھر...... ساتھ میں اوور ٹائم......"

"ہفتے میں ایک چھٹی کا دن بھی تو آتا ہے نا......"

"ہاں...... مگر پورے ہفتے کی اتنی تھکاوٹ ہوتی ہے کہ سارا دن بس آرام کرنے میں گزر جاتا ہے۔"

"چلیں آپ کی مرضی"۔ اس کی بیوی نے ہار مان لی۔

اب وقار گھر سے نکلا اور بس اسٹاپ پر آ کھڑا ہوا۔ جس کمپنی میں وقار کام کرتا تھا۔ ملازمین کو لانے لے جانے کی سہولت اس کی طرف سے دی گئی تھی۔ اب وقار کمپنی کی مسافر بس کا انتظار کر رہا تھا۔

دل لگی کے لیے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر وہ چونک پڑا۔

اس نے ایک بزرگ آدمی دیکھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ ٹھٹھک کر رک گیا، یوں جیسے اچانک اسے کچھ نظر آ گیا ہو۔ فٹ پاتھ کے قریب ہی سڑک کنارے کچرے کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ فٹ پاتھ سے اترا اور کچرے کے ڈھیر کے اوپر آ کھڑا ہوا۔ اب وہ غور سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ یوں جیسے کچرے میں اُسے خزانہ نظر آ گیا ہو۔ وہ کچرے کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس کے اس طرح کچرے کے پاس بیٹھنے پر وقار کو حیرت ہوئی۔ پھر وقار کو زور کا جھٹکا لگا۔ بزرگ نے کچرے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اب وہ کچرے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ وقار کو ایک لمحے کے لیے گھن آئی مگر ساتھ ہی بہت سے سوالات نے اُسے گھیر لیا۔ بزرگ نے اچھا لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ اس نے نظر والا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ شکل سے نہ تو وہ بھکاری لگتا تھا اور نہ ہی بھوکوں مرا..... جو کچرے میں اپنی روزی تلاش کرنے پر مجبور ہو۔ پھر چکر کیا ہے؟

وقار سوچنے لگا۔ اس کی نظر بزرگ پر جمی ہوئی تھی۔ کچرے میں کچھ ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ وہ خوف زدہ نظروں سے اطراف میں بھی دیکھ رہا تھا، جیسے کہ یہ خزانہ سمیٹتے ہوئے اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ جیسے اُسے کسی کے آنے کا خوف ہو۔ دور ہونے کی وجہ سے وقار سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ بزرگ کچرے سے ایسی کون سی چیز اٹھا رہا ہے جو اس کے لیے بہت قیمتی ہے۔

پھر وہ بزرگ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک سمت قدم اٹھانے لگا۔ اتنے میں وقار کی بس بھی اسٹاپ پر آ گئی۔ اب وقار کے سامنے دو راستے تھے، یا تو وہ روزانہ کی طرح اپنے کام پر روانہ ہو جاتا یا پھر اپنی الجھن دور کرنے کے لیے اس بزرگ کا تعاقب کرتا۔ فیصلہ کرنے کے لیے وقت بہت کم تھا۔ پھر وقار نے اپنے قدم بڑھا دیے۔ اب وہ بزرگ کا تعاقب کر رہا تھا۔

بزرگ اپنی ہی مستی میں چلا جا رہا تھا۔ اس کے چلنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ وقار کی الجھن میں اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ جس سمت وہ جا رہا تھا وہاں کوئی بھی زندہ انسان اپنی خوشی سے جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ خود ایک عرصے سے اس راستے پر نہیں چلا تھا۔ یہ راستہ قبرستان کی طرف جاتا تھا۔

''اس بزرگ کو قبرستان میں کیا کام ہو سکتا ہے؟'' وقار سوچنے لگا۔ وہ اس بزرگ کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا۔ اب قبرستان کا بیرونی دروازہ نظروں کے سامنے تھا۔ وہ بزرگ بلا جھجک قبرستان کے اندر داخل ہو گیا۔ یوں جیسے کوئی اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ وقار کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ قبرستان میں داخل ہو مگر تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا۔

''پھول لے لو صاحب!'' قبرستان کے باہر ایک ٹھیلے والا موجود تھا۔ اس کے ٹھیلے پر گلاب کی پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

''ضرورت نہیں۔'' وقار نے انکار کر دیا اور پھر قبرستان میں داخل ہو گیا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ وقار کو اس بزرگ کے علاوہ وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''آخر یہ آیا کس کے پاس ہے؟'' وقار سوچنے لگا۔ پھر اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ وہ بزرگ ایک قبر کے سامنے رک گیا۔ یہ ایک پختہ قبر تھی۔ قبر کے حجم سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بچے کی قبر ہے۔ وقار سرکتے ہوئے تھوڑا پاس آ گیا۔ اب اس بزرگ کے ہونٹ تھرتھرائے۔ وقار نے سنا بزرگ کانپتی آواز میں کہہ رہا تھا:

''دیکھ بیٹا! میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔''

ایک برقی لہر وقار کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جس کا وہ تعاقب کر رہا تھا وہ تو ایک باپ تھا اور یہاں وہ اپنے بچے سے ملنے آیا تھا۔

یہ لے میرے بیٹے اور اب کھیل ان سے۔'' اس نے اپنے بند ہاتھ قبر کے اوپر کھول دیے۔ اس کے ہاتھوں میں موجود بوتلوں کے ڈھکن چھن چھناتے ہوئے قبر پر گرنے لگے۔ یہ وہ ڈھکن تھے جو اس نے کچرے کے ڈھیر میں سے

تلاش کیے تھے۔

''چل اٹھ اب..... کھیل ان سے اور گھر چل..... دیکھ تو میں آیا ہوں تجھے لینے کے لیے.....''۔

ایک لمحے کے لیے وقار کو لگا کہ غم سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں کے کنارے سلگنے لگے۔ ایسے میں اُس نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دماغی امراض کے ایک ہسپتال کے چند ملازمین وردی میں ملبوس اسی طرف چلے آ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر بھی بزرگ نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''بابا جی! آپ بہت تنگ کرتے ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''نہیں تو..... میں تو بس اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں۔''

''تو مل لیا آپ نے!''

''نہیں تو..... وہ تو میری بات ہی نہیں سنتا۔'' وہ بزرگ مایوسی سے بولا۔

''تو چلیں پھر..... صاحب ناراض ہو رہے ہیں۔''

''ہاں چلتے ہیں۔'' وہ بزرگ ان کے ساتھ چل پڑا مگر اب وہ چلتے ہوئے بار بار پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید کوئی کرشمہ ہو جائے۔ بیٹے کی قبر کے آس پاس ڈھکن بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وقار ان کے پیچھے لپکا اور ان کے ساتھ چلنے لگا۔

''ہوا کیا تھا؟'' وقار نے ہسپتال کے ایک ملازم سے پوچھا۔

''ویسے تو ہم زیادہ کچھ نہیں جانتے مگر فائل کے مطالعے

آئینہ

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
اقبالؔ

وہ آئینے میں دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے
حسرت موہانیؔ

آئینہ دیکھتے ہیں مجھے دیکھ دیکھ کر
یہ داد مل رہی ہے مرے انتخاب کی
ریاض خیرآبادیؔ

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو
شکیب جلالیؔ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
غالبؔ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
غالبؔ

دِل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی
موجی رام موجیؔ

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
نظام رامپوریؔ

شاید ابھی وہ دیکھ کے آئے ہیں آئینہ
کہتے ہیں مانتا ہوں تمہاری نظر کو میں

سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال پہلے اس بزرگ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اس کی بیوی صدمے سے مرگئی اور یہ دماغی امراض کے ہسپتال پہنچ گیا۔ یہ ہسپتال کا سب سے پرانا مریض ہے۔ مریض ہوتے ہوئے بھی یہ مریض نہیں۔ اس لیے ہم اسے قید میں نہیں رکھتے مگر اسے جب بھی موقع ملتا ہے، نظر بچا کر نکل جاتا ہے اور ہمیشہ اسی مقام پر ملتا ہے۔''

''وہ حادثہ کیا تھا؟'' وقار نے پوچھا۔

''ہم نہیں جانتے۔'' انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مجھ سے پوچھو، میں بتاتا ہوں۔'' وہ بزرگ جلدی سے بولا۔ وقار ششدر رہ گیا۔ یہ کیسا مریض تھا۔

''میرا بچہ تھا وہ..... مجھے جان سے پیارا تھا وہ..... ابھی چار سال کا ہی تو تھا۔ اسے بوتلوں کے ڈھکنوں کے ساتھ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس بہت سے ڈھکن تھے۔ وہ ان کی مدد سے پہاڑ بنانے کی کوشش کرتا۔ جب پہاڑ گر جاتا تو وہ روتا۔ جب پہاڑ مکمل ہو جاتا تو وہ خوشی سے تالیاں بجاتا۔

ایک دن میں کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ ایک مقام پر کریانے کی دکان دیکھ کر وہ چیز لینے کے لیے مچل گیا۔ میں نے اس کی انگلی چھوڑی اور اس کے لیے چیز لینے لگا۔ میری توجہ دکان دار کی طرف تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میری دنیا اجڑ گئی۔

''ابو جی.....'' یہ اس کی آخری چیخ تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ سڑک پر موجود تھا۔ ایک مسافر بس اس کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کی مٹھی بند تھی۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ میں نے مٹھی کھولی تو اس کی مٹھی میں بوتل کا ڈھکن تھا۔ وہ یہ ڈھکن پکڑنے سڑک پر آیا تھا۔ ہائے میرا بچہ..... ہائے میرا بچہ۔''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر اپنے بچے کی قبر کی طرف دوڑا۔ ملازمین اُسے پکڑنے اس کے پیچھے لپکے۔ اس پر پاگل پن کا دورہ تو اب پڑا تھا۔ وہ رو رہا تھا، چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ ملازمین اُسے اٹھا کر لے گئے۔ وقار کے قدم تو جیسے زمین میں ہی گڑ کر رہ گئے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بزرگ کچرے میں سے بوتلوں کے ڈھکن کیوں تلاش کرتا ہے۔ یہ ڈھکن اُس کے بچے کا کھلونا تھے۔ وہ تو کھلونے کی تلاش میں رہتا تھا۔

وقار سوچتے سوچتے اچانک چونک پڑا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ اس نے ایک باپ کی محبت اپنے بیٹے کے لیے دیکھ لی تھی۔ وہ بھی تو کسی کا بیٹا تھا۔ وہ پچھلے پانچ برس سے اپنے ابو سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اس کے ابو بھی تو اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔ وہ ایک اچھا بیٹا نہیں تھا۔ بالکل نہیں تھا۔ بس یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ وقار نے دوڑ لگا دی۔ اب وہ اپنے ابو سے ملنا چاہتا تھا۔

وہ قبرستان سے باہر نکلا۔ باہر ٹھیلے والا کھڑا تھا۔ اس نے ٹھیلے والے سے گلاب کی پتیاں خریدیں اور دوبارہ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ وہ خالی ہاتھ اپنے ابو کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابو کی قبر تلاش کرنے میں اُسے تھوڑا وقت لگا مگر اس نے ڈھونڈ ہی لی۔ قبر کی مٹی خشک تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے قبر کی مٹی اُس سے شکوہ کر رہی ہو۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے پانی کی تلاش میں نکلا۔ جنازگاہ سے اُسے پانی مل گیا۔ اس نے قبر کو سیراب کیا اور پھر اوپر پھولوں کی پتیاں ڈال دیں۔ اب وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا۔ پھر اس کی واپسی ہوئی۔ وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی حیرت سے بولی۔

''کیا ہوا؟ آج آپ جلد گھر واپس لوٹ آئے۔ کام پر نہیں گئے؟''

''آج میں ابو سے ملنے گیا تھا۔'' وہ سسک کر بولا۔ پھر ایک غبار سا اٹھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''میں اچھا بیٹا نہیں ہوں..... میں اچھا بیٹا نہیں ہوں.....'' کبھی کبھی آنسو دل کا مرہم ہوتے ہیں مگر آج نہ جانے کیوں اس مرہم میں بھی شفا نہیں تھی۔ ●●●

ماضی اور حال میں کرۂ ارض کو مسکن بنانے والے تمام جانوروں میں وہیل سب سے بڑا حیوان سمجھی جاتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ بڑے سے بڑا ڈائنوسار بھی نیلی وہیل سے چھوٹا تھا۔ وہیل کی ۷۰ اقسام ہیں۔ ماہرین نے انہیں دو گروہوں ''ہڈی والی'' اور ''دانتوں والی وہیل'' میں تقسیم کیا ہے۔ وہیل ایک دُودھیل (ممالیا) جانور ہے۔ یعنی وہ بھی خشکی کے جانوروں کی طرح ہوا میں سانس لیتی، بچے پیدا کر کے ان کی پرورش کرتی اور انہیں دودھ پلاتی ہے۔ یہ شاندار جانور ہے اور پہلی بار اس کا دیکھنا یادگار تجربہ ہے۔

سمندر کی شہزادی

دنیا کے سب سے بڑے اور سحر انگیز جانور کی دلچسپ معلومات

محمد خلیل چوہدری

ہڈی والی وہیل کے گروہ میں تمام بڑی وہیلیں شامل ہیں۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والی وہیل کے منہ میں دانت نہیں ہوتے بلکہ جبڑوں میں دانتوں جیسی ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہڈیاں سینگ جیسی مضبوط ہوتی ہیں۔ ایک ہڈی ۲ سے ۱۲ فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہڈی والی وہیل کہلاتی ہے۔ ان میں نیلی، کوہان پشت، منکی، رائٹ اور گرے وہیل زیادہ مشہور ہیں۔

دانتوں والی وہیل کے گروہ میں شامل وہیلیں منہ میں دانت رکھتی ہے۔ ہڈی والی وہیل تو اپنی خوراک چبائے بغیر نگلتی ہے مگر یہ اپنے شکار کو کاٹتی، پھاڑتی اور پھر کھاتی ہے۔ سلیڈ، بوتل نما، نارا اور سپرم وہیل دانتوں والی وہیل کی مشہور اقسام ہیں۔ ان کا صرف ایک نتھنا ہوتا ہے۔ ڈولفن اور اس کی بہن پورپوائس (Porpoise) بھی اس گروہ میں شامل ہیں۔

نیلی وہیل دنیا کا سب سے بڑا جانور ہے۔ یہ ۱۰۸ فٹ لمبی اور ۱۸۰ ٹن تک وزنی ہو سکتی ہے۔ تاہم آج کل بیشتر نیلی وہیل ۷۵ تا ۸۰ فٹ لمبائی رکھتی ہے۔ اس کا منہ اتنا بڑا ہے کہ اندر ۹۰ ٹن پانی اور خوراک سما جائے۔ صرف اس کی زبان کا وزن ۲ء۷ ٹن ہے۔ اور سر اتنا بڑا ہے کہ اس پر ۵۰ آدمی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ نیلی وہیل روزانہ ۴ ٹن تک خوراک کھاتی ہے۔ اس کی عمر تقریباً ۸۰ سال ہوتی ہے اور یہ تمام بڑے سمندروں میں ملتی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کی نافرمانی اور سرکشی سے ناراض ہو گئے۔ تب وہ اللہ کے حکم کے بغیر ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ وزن کم کرنے کے لیے قرعہ اندازی ہوئی جس میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ آپؑ سمندر میں پھینک دیے گئے اور ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ بعد میں آپؑ نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اُس کی تسبیح کی۔ پھر اس مچھلی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت یونس علیہ السلام کو ساحل پر اُگل دیا۔ اس مچھلی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہیل ہی ہوگی۔

وہیل امن پسند اور ذہین جانور ہے۔ بیشتر اقسام گروہوں کی شکل میں رہتی ہیں۔ ایک گروہ میں ۵ تا ۱۵ وہیل ہوتی ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے نہیں لڑتیں اور مل جل کر رہتی ہیں۔ کوئی ایک مصیبت میں پھنس جائے تو سب اس کی مدد کرتی ہیں۔ وہیل عموماً ایک بچہ دیتی ہے۔ وہ دل لگا کر اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اسے تیرنا اور شکار کرنا سکھاتی ہے۔ اور اُس کا خوب خیال رکھتی ہے۔ اگر ماں مر جائے تو کوئی اور وہیل بچے کی پرورش کرتی ہے۔

۱۸۹۱ء میں انگلستان کے کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لیے گہرے سمندر میں گئے جہاں مچھیروں اور وہیل کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ اس میں وہیل شدید زخمی ہوئی مگر اس جنگ میں جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو وہیل نے نگل لیا۔ دوسرے روز وہی وہیل اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انہوں نے اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ نکلا۔ یہ شخص وہیل کے پیٹ میں ۶۰ گھنٹے رہا تھا۔

ننھے منے سمندری جانور کرل اور پلانکٹن بڑی وہیل کی خوراک ہیں۔ اسے بھوک لگے تو یہ منہ میں کئی ٹن پانی بھر لیتی ہے۔ جبڑوں میں بنے سوراخوں سے پانی تو نکل جاتا ہے مگر کرل وغیرہ نہیں نکل پاتے۔ پھر وہیل انہیں نگل لیتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنے بڑے جانور ننھے منے جانوروں پر پلتے ہیں جبکہ دانتوں والی وہیل مچھلیاں اور دیگر بڑی مچھلیاں سمندری جانور کھاتی ہیں۔ نیلی وہیل کا بچہ روزانہ ۱۰۰ گیلن دودھ پیتا ہے۔ یوں روزانہ اس کا وزن ۹۱ کلو بڑھتا ہے۔

وہیل مختلف آوازیں نکالتی اور سیٹیاں مارتی ہے۔ یوں وہ اپنے ساتھیوں کو کوئی پیغام دیتی، بچے کو بلاتی یا کسی کا استقبال کرتی ہے۔ یہ آوازیں سمندر میں کئی میل دور تک سنائی دیتی ہیں۔

تیرتے ہوئے وہیل کئی کرتب دکھاتی ہے۔ کبھی ہوا میں چھلانگ لگا کر زور سے پانی میں گرتی ہے جس سے سمندر میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ کبھی وہ چھلانگ لگاتے ہوئے الٹ بازی لگاتی ہے۔ ایک اور تماشے میں وہیل پانی سے سر نکالتی اور پھر پلٹ جاتی ہے۔ شاید یوں وہ اردگرد کا جائزہ لیتی ہے۔ بعض دفعہ وہیل دُم اٹھا کر زور سے پانی پر مارتی ہے۔ یوں گونج دار آواز جنم لیتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس طرح وہ اپنے ساتھیوں کو کسی خطرے سے آگاہ کرتی ہے۔

وہیل زیادہ دیر تک نہیں سو سکتی، ورنہ سمندر کے اندر دم گھٹنے سے مر جائے گی۔ اسی لیے وہیل چند منٹ اونگھ کر تھکن اتار لیتی ہے۔ ماہرین نے تحقیق کر کے دریافت کیا ہے کہ ایک وقت میں وہیل کے دماغ کے دو حصوں میں سے ایک حصہ سوتا ہے۔ یوں وہ گہری نیند نہیں سو پاتی۔

وہیل کی ناک سر پر ہے، یوں اُسے سانس لینے کے لیے پورا چہرہ پانی سے باہر نہیں نکالنا پڑتا۔ وہیل اوپر آئے تو ناک کے ذریعے جسم کی گندی ہوا باہر نکالتی ہے۔ چونکہ ناک کے اوپر بہت پانی ہوتا ہے لہٰذا وہ فوارے کی طرح اچھل پڑتا ہے۔ یہ فوارہ ۱۵ فٹ تک بلند ہوتا اور دور سے نظر آتا ہے۔ آکسیجن یا تازہ ہوا لینے کے بعد وہیل پھر پانی میں چلی جاتی ہے۔ وہ پانی میں ۳۰ سے ۴۰ منٹ تک رہ سکتی ہے۔

وہیل دنیا میں سب سے زیادہ سفر کرنے والا جانور ہے۔ گرمیوں میں وہ پیٹ بھر کر کھاتی ہے تاکہ اس پر چربی چڑھ جائے۔ جب سردیاں شروع ہوں تو وہ گرم سمندروں کا رُخ کرتی ہے۔ سفر کے دوران وہ مسلسل تیرتی ہے۔ بس کبھی کبھی کھانے کے لیے رکتی ہے۔ گرے وہیل سب سے طویل سفر کرتی ہے۔ وہ گرمیاں بحر منجمد شمالی جبکہ سردیاں میکسیکو کے سمندر میں گزارتی ہے۔ یوں وہ سالانہ ۲۰ ہزار کلومیٹر فاصلہ طے کرتی ہے۔

انسان کی طرح وہیل کا دل بھی چار خانے رکھتا ہے۔ دنیا میں سب سے بڑا دل نیلی وہیل کا ہے۔ وہ ۶۰۰ کلو وزنی اور چھوٹی سوزوکی کار جتنا ہوتا ہے۔ جانور جتنا بڑا ہو اُس کا دل اتنی ہی آہستہ دھڑکتا ہے۔ اسی لیے بڑی وہیل کا دل ایک منٹ میں ۱۰ سے ۳۰ بار دھڑکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ مچھلی کی دم دائیں بائیں جبکہ وہیل کی اوپر نیچے حرکت کرتی ہے۔ وہیل کی دم کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس میں ہڈی نہیں ہوتی۔ سائی نامی وہیل سب سے تیز رفتار ہے۔ وہ ۲۳ میل فی گھنٹا کی رفتار سے تیر سکتی ہے۔ بڑی وہیلیں ۱۵ تا ۲۰ میل فی گھنٹا کی رفتار سے تیرتی ہیں۔

دانتوں والی وہیل میں سب سے بڑی سپرم وہیل ہے۔ وہ تقریباً ۴۳ ٹن وزن رکھتی اور ۵۰ فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ سپرم وہیل تمام سمندری جانداروں میں سب سے زیادہ گہرا غوطہ لگاتی ہے۔ دراصل اُسے ایک خاص سمندری جانور عظیم الجثہ قیر ماہی بہت پسند ہے لہٰذا وہ اس کی تلاش میں ۲۰۰۰ فٹ گہرائی تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ●●●

معاشرتی کہانی

دو سو روپے

نازک احساسات سے عاری ایک سنگ دل سیٹھ کا عبرت دِلاتا ماجرا

کوثر اسلام

کرمو ڈرتے ڈرتے سیٹھ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ سیٹھ مبصر فضل میز پر رکھی ہوئی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ کرمو نے گلا صاف کیا تو سیٹھ صاحب نے نظر اٹھا کر سر سے پاؤں تک کرمو کو گھورا اور دھاڑتے ہوئے کہا ''کیا ہے؟''

لرزیدہ کرمو نے تمام تر ہمت جمع کرتے ہوئے کہا ''صاحب! میری ماں بیمار ہے۔ آج اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ اگر آپ دو سو روپے دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ میری تنخواہ سے کاٹ لیجیے گا۔''

''دو سو روپے..... نہیں ہیں میرے پاس۔ جاؤ جا کر کام کرو۔'' سیٹھ صاحب نے چنگھاڑتے ہوئے کہا ''ہر کوئی یہی رونا روتا ہے۔ مفت میں نہیں ملی ہے مجھے یہ دولت۔''

''مگر صاحب دو سو روپے کا تو سوال ہے۔ لوٹا دوں گا آپ کو۔'' کرمو نے گڑگڑا کر کہا۔

''میرے پاس تمہارے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جاؤ جا کر کام کرو۔'' سیٹھ صاحب غصے سے لال بھبھوکا ہو گئے۔

کرمو نے جب سے آنکھ کھولی، گھر میں غربت کو ہی ناچتے ہوئے پایا تھا۔ اس کا باپ ایک معمولی مستری تھا۔ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کا باپ اسے اپنے ساتھ کام پر لے جانے لگا۔ وہ اسے اسکول میں داخل نہیں کروا سکتا تھا۔ اس کے پاس داخلے، کتابوں اور کاپیوں کے پیسے نہیں تھے۔

گھر کا خرچہ بمشکل پورا ہو رہا تھا۔ عید کے موقع پر وہ گھر سے باہر محض اس لیے نہ نکلتا کہ پرانے کپڑوں کی وجہ سے بچے مذاق اڑاتے۔ وہ ماں سے نئے کپڑوں کے لیے کہتا تو اس کا دل پسیج جاتا۔ وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتی ''بیٹا! عید تو ہر سال آتی ہے۔ اگلے سال بنا دوں گی۔''

کرمو نے باپ کے ساتھ تھوڑا بہت کام سیکھ لیا۔ اس کا

باپ بھی سیٹھ فضل کے ساتھ کام کرتا تھا۔ سیٹھ فضل کی چھوٹی سی تعمیراتی کمپنی تھی۔ وہ ٹھیکے لے کر گھر، پلاٹ اور مختلف قسم کے دیگر تعمیراتی کام کرواتا تھا۔

ایک دن کرمو کا باپ کام کے دوران چھت سے گر کر موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ سیٹھ فضل لالچی اور کنجوس انسان تھا۔ اس نے کرمو کی ایک روپے کی مدد بھی نہیں کی۔ ہاں اتنا کیا کہ اس کے بیٹے کو کام پر رکھ لیا۔

کرمو کے ناتواں کندھوں پر اب ذمہ داریوں کا کوہ گراں آن پڑا۔ گھر کے خرچے کے ساتھ ساتھ اسے بہن کی شادی بھی کرنی تھی۔ اس نے دن رات کام کر کے اتنے پیسے جمع کیے کہ بہن کی شادی کر سکے۔

☆☆

بہن کا گھر بسانے کے بعد اسے تھوڑا سا سکون مل گیا لیکن اب اس کی ماں بیمار رہنے لگی تھی۔ مزدوری کے تمام پیسے وہ ماں کے علاج پر خرچ کر دیتا۔ رات کو جب وہ لیٹتا تو اس نظام کے بارے میں سوچتا جس میں غریب روز بروز زیادہ غریب اور امیر روز بروز امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سوچتا کہ کیا امیر ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے اور کیا ہم غریب ہمیشہ مصیبتیں ہی برداشت کریں گے؟ اس کا جواب اس کے ذہن میں نہ آتا اور وہ سو جاتا۔

آج صبح جب وہ اٹھا تو اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ گلی کے نکڑ پر ڈاکٹر مہربان کا کلینک تھا۔ وہ اسے بلانے گیا لیکن ڈاکٹر فیس کے بغیر آنے پر رضامند نہ تھا۔ وہ گھر آیا اور جو چیز بھی اسے نظر آئی اس نے اٹھائی اور باہر جا کر فروخت کر دی۔ ایک غربت زدہ گھر میں بھلا کتنا سامان ہو سکتا تھا۔ سب کچھ بیچ کر بھی ڈاکٹر کی فیس میں دو سو روپے کم پڑ رہے تھے۔ اسی لیے وہ سیٹھ فضل کے پاس گیا تھا تاکہ اس سے دو سو روپے لے کر ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جا سکے لیکن سیٹھ نے اسے بے عزت کر کے دفتر سے نکال دیا۔

دفتر سے نکلتے وقت اس کے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ وہ ہر امیر کو قتل کر کے اس کی دولت لوٹ لے۔ کبھی دل میں خیال آتا کہ کوئی دہشت گرد اس سے رابطہ کرلے۔ وہ ماں کے علاج کی شرط پر خود کو بم سے اڑا دے گا۔ یوں ماں کا علاج ہو جائے گا اور وہ اس خود غرض سماج سے انتقام بھی لے لے گا۔

انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں وہ گھر پہنچ گیا۔ ماں کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ چکی تھی۔ وہ دوڑ کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑایا۔ تمام عمر اس کا غلام رہنے کی قسم بھی کھائی مگر ڈاکٹر ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ مجبوراً گھر لوٹ آیا۔ اس کی ماں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہی تھی۔ اس کی زندگی کی قیمت دو سو روپے تھی...... صرف دو سو روپے۔ وہ محلے کے ہر گھر میں گیا لیکن کسی نے بھی اسے پیسے نہ دیے۔ وہ ماں کے سرہانے بیٹھ گیا۔

ماں کی طبیعت مزید بگڑ گئی تو وہ اس کے لیے پانی لینے بھاگا۔ واپس آ کر دیکھا تو اس کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا۔ صحن میں لگے پیڑ سے پرندے اڑ گئے اور ساتھ ہی ماں کی روح بھی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ماں کی پتھرائی ہوئی بے جان آنکھیں اس کی غربت کا تمسخر اڑا رہی تھیں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر خوب رویا۔ وہی بے حس لوگ جو اس کی زندہ ماں کے علاج کے لیے دو سو دینے سے انکاری تھے، اب کفن کے لیے اس کی جھولی میں روپے اور سکے ڈالنے آن پہنچے تھے۔ چندہ جمع کر کے جب وہ کفن خریدنے کپڑا مارکیٹ میں داخل ہوا تو سیٹھ فضل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں سے نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں شاپر تھے اور وہ شاپر قیمتی ملبوسات سے بھرے ہوئے تھے۔

پاکستان

اوندھی بستی

بحیرہ عرب کے کنارے واقع پُراسرار کھنڈرات کی سحر انگیز سیاحت

شاہد لطیف

کسٹمز سے تعلق رکھنے والے میرے ایک دوست کو تاریخی آثار اور کھنڈرات دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگے "لہائی بندر" چلنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ پوچھا کہ یہاں کیا شے ہے؟ جواب دیا کہ قریب ہی ایک بستی کے آثار بہت اچھی حالت میں ہیں اور سنا ہے کہ کچھ مکان اوندھے بھی ہیں؛ جن کا ذکر ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

تقریباً ۶۸۳ سال پہلے ابنِ بطوطہ برصغیر پاک و ہند سیاحت کرنے آیا تھا۔ اُس کی آمد ۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ عیسوی بنتی ہے۔ سفر کے دوران وہ یادداشتیں مرتب کرتا رہا۔ جب ۲۵ سال بعد وطن واپس پہنچا تو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ان کی مدد سے اپنا سفرنامہ لکھا۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ایک اوندھی بستی کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "پانچویں دن ہم 'لاہری' پہنچے۔ یہ خوبصورت شہر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ قریب ہی دریائے سندھ سمندر میں گرتا ہے۔ شہر سے سات کوس کے فاصلے پر ایک میدان ہے، جس کو 'تارنا' کہتے ہیں۔ وہاں بے شمار آدمیوں اور حیوانات کی پتھریلی مورتیاں، ثابت اور ٹوٹی پھوٹی پڑی ہوئی ہیں۔ غلہ، گیہوں، چنا اور دالیں وغیرہ بھی پتھرائی پڑی ہیں۔

"کھنڈرات میں پتھر کا بنا ہوا ایک گھر ہے، جس کے وسط میں ایک چبوترہ ہے۔ وہ ایک ہی طویل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ایک جگہ نہایت بدبودار پانی کھڑا ہوا تھا۔ دیواروں پر ہندی زبان کے کتبے نظر آئے۔ مقامی لوگ اور یہاں کے مورخ خیال کرتے ہیں کہ یہ شہر مسخ ہو گیا تھا۔ چبوترے پر

بادشاہ کا بُت تھا۔ اب بھی اِس کو راجا کا محل کہتے ہیں۔ یہاں کی دیوار کے کتبے سے پتا لگتا ہے کہ یہ بربادی، میرے یہاں آنے سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوئی تھی‘‘۔

آج کا ’لہائی بندر‘ غالباً کل کا لاہری بندر تھا جس کے قریب دریائے سندھ طاس (ڈیلٹا) کی صورت سمندر میں گرتا ہے۔ آج بھی وہاں درج بالا کھنڈرات اچھی حالت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ سفرنامہ پڑھنے کے بعد دِل میں آیا کہ کیوں نہ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔

اُنھی دِنوں اتفاق سے پُرانے محلہ دار زاہد احمد کے ہاں اپنے ایک پڑوسی، جناب سرفراز حُسین سے مُلاقات ہوئی جو اُس وقت پاک فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ باتوں باتوں میں سفر نامہ ابنِ بطوطہ اور لاہری بندر کا ذکر ہوا۔ وہ بھی یہ کھنڈرات اور اوندھی بستی دیکھنے کے لیے بہت پُرجوش ہوگئے۔ راقم نے اُن کو سفرنامہ ابنِ بطوطہ کے اردو ترجمے کی فوٹو کاپی دی جس سے اُس مقام تک رسائی میں مدد مِل سکتی تھی۔ خاکسار کی قِسمت اچھی تھی کہ وہ اُس وقت آرمی ایویشن سے بھی وابستہ تھے۔ یہ حضرت بھی راقم کی طرح آثارِ قدیمہ دیکھنے کے شوقین تھے۔ فرمانے لگے کہ جلد وہاں جانے کی کوشش کریں گے۔

کرنل صاحب نے اگلی ہی شام یہ خوش کُن خبر سُنائی کہ وہ ہیلی کاپٹر سے مطلوبہ مقام دیکھ آئے ہیں نیز یہ کہ جیسا ابن بطوطہ نے سفرنامے میں بیان کیا تھا، اُنہوں نے اُس بستی اور کھنڈرات کو ویسا ہی پایا۔ اِس اوندھی بستی اور کھنڈرات کے مقام اور وجود کی تحقیق صحیح سمت جاری تھی۔ اُس تاریخی مقام کا وجود ثابت ہوگیا، اب خود دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔

شوق کو مہمیز ملی اور راقم نے اپنے ذہن کو چاروں جانب دوڑانا شروع کیا۔ سوچ بچار کے بعد ایک صاحب کا خیال آیا جو پاکستان کسٹمز کے شعبہ اینٹی اسمگلنگ آرگنائزیشن میں تعینات تھے۔ یہ صاحب بھی دور دراز تاریخی کھنڈرات دریافت کرنے کے شوقین تھے۔ راقم نے اُن سے لاہری بندر/لہائی بندر کا ذکر کیا۔ اِنہوں نے مختلف افراد سے اُس مقام تک جانے کی صورت دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ مختصر راستہ تو زمینی ہے مگر اِس میں خطرات کچھ زیادہ ہیں؛ سب سے بڑا مسئلہ تو دلدلیں ہیں۔

دوسرا اور زیادہ بہتر ذریعہ سمندری سفر تھا، جو کِسی قریبی بستی سے بادبانی کشتی کے ذریعے بہ آسانی طے کیا جاسکتا تھا۔ اِن کھنڈرات کے تین اطراف میں دلدل اور سامنے کی جانب سمندر تھا۔ پانی کی گہرائی اکثر جگہوں پر کافی کم تھی لہٰذا بڑی یا چھوٹی لانچ کا وہاں لے جانا مُناسب نہیں تھا؛ اِسی لیے بادبانی کشتی کا مشورہ دیا گیا۔

یہ میرا بادبانی کشتی کا پہلا سفر تھا۔ جِن لوگوں نے کبھی بادبانی کشتی میں سمندری سفر نہیں کیا وہ ایک مرتبہ ضرور یہ تجربہ کر کے دیکھیں۔

لہائی یا لہری بندر کبھی بڑا تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا مگر زمانے کے سرد و گرم نے اسے گمنام کردیا۔ اب اِن کھنڈرات تک سمندری کھاڑی کے راستے جایا جاتا ہے۔ سمندر سے خشکی میں اندر تک جانے والے آبی راستے کو کھاڑی کہتے ہیں۔ کئی تنگ اور چھوٹی بڑی کھاڑیوں سے گزر کر اچانک نظروں کے سامنے یہ کھنڈرات آگئے۔ پہلی نظر میں ایسا لگا جیسے کسی تاریخی فِلم کا سیٹ لگایا گیا ہو کیوں کہ اُن کھنڈرات میں مٹی اور دھول کا نام و نشان نہیں تھا۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ تین اطراف میں دلدل اور کیچڑ ہے اور سامنے سمندر اور کھاڑیاں لہٰذا لاکھ ہوا چلے، مٹی تو دور دور تک ہے ہی نہیں۔ وہ بالکل صاف ستھرے کھنڈرات تھے، جب ہی تو فِلمی سیٹ کا گُمان ہوا۔ دوسرا سبب قریبی بستیوں میں نسل در نسل چلی آنے والی پُراسرار داستانیں اور لوگوں کی توہم پرستی بھی ہوسکتی ہے۔ دور نزدیک کی بستیوں والے اِدھر کا رُخ کرتے ہی نہیں۔ اِسی لیے اتنے قیمتی تاریخی خزائن اب تک قریباً اُسی حالت میں ہیں جیسے ابنِ بطوطہ نے دیکھے تھے۔

دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے گویا ایک چھوٹے سے مخصوص علاقے میں کوئی قُدرتی آفت آئی اور ویرانیاں پھیر گئی۔ ممکن ہے بستی کا ایک خاصا بڑا حصّہ اب بھی دلدلی زمین کے نیچے ہو۔ یا سمندر بُرد ہو گیا۔ ممکن ہے وہ کوئی ہلکا پھلکا زلزلہ ہو۔

حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ وہاں ہیبت ناک ماحول طاری تھا۔

کرنل (ر) سرفراز کا کہنا تھا کہ جب اُنہوں نے اپنے ساتھی کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے یہ کھنڈرات دیکھے تو وہ ششدر رہ گئے۔ اتنی اچھی حالت اور صاف ستھرے!! آپ پاکستان کے کسی بھی آثارِ قدیمہ میں چلے جائیے، وہ آثار سے زیادہ اشتہار گاہ لگتے ہیں۔ ہر طرف سیاسی اور پینٹروں کے لکھے اشتہارات، وال چاکنگ، جیتے اور ہارے اُمیدواروں کے نہ جانے کِن کِن انتخابات کے فلیکس جا بجا اُن کا اور اپنا نوحہ پڑھتے نظر آئیں گے۔

لہری بندر کے کھنڈرات ایک تو عوام کی دسترس سے باہر ہیں، دوسرے توہم پرستی کہ ’وہاں کوئی نہ جائے، جو وہاں جاتا ہے مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے‘ نے بہت حد تک اِس مقام کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ تیسرے وہاں پہنچنا قطعاً کوئی آسان کام نہیں۔

اِن آثار میں سب سے عمدہ اور دِلچسپ چیز پتھرایا ہوا غلہ ہے؛ جیسے گیہوں، چنا اور شاید کسی قِسم کی کوئی دال وغیرہ۔ یہ ایک چبوترے پر بکھرا ہوا ہے۔ چبوترے کے ساتھ ہی پتھر کا بنا ہوا اوندھا مکان واقع ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی زبردست قوت نے پکڑ کر اوندھا کر دیا ہو۔ یہ اوندھا پن بالکل صاف محسوس ہوتا ہے۔

قرب و جوار میں کچھ مورتیاں بھی سر کے بل موجود ہیں۔ تھوڑی سی محنت سے ایک سنگی کتبے پر قدیم سنسکرت کی تحریر بھی مِل گئی۔ شاید اِسی کو دیکھ کر ابنِ بطوطہ نے بستی کی قدامت کا اندازہ لگایا تھا۔ کم از کم اِس خاکسار کو ایسا لگا جیسے میں وہاں ۷۰۰ سال قبل کے ابنِ بطوطہ کی آنکھ سے ہی یہ سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔

ایک تو ویسے ہی کھاڑیوں میں سمندر کا پانی آتا جاتا رہتا ہے جس سے کبھی کبھی وہاں صرف کیچڑ ہی رہ جاتا ہے، دوسرے موسم کی اونچ نیچ سے دلدلی پانی اور خود دلدل بھی خشک ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں اور محققوں کو ایسی جگہوں سے گزری تہذیبوں کے روزمرہ استعمال کی اشیاء مِل جایا کرتی ہیں جو آج کے نوادِر ہوتے ہیں۔

پاکستان کسٹمز والے دوست کو پتا نہیں کیوں اِس بات کا یقین تھا کہ ہم لوگ اگر کچھ محنت کریں اور کچھ روز اِدھر ہی رہیں تو ہمیں بھی پرانے زمانے کی اشیاء مِل سکتی ہیں۔ اِن کے پاس صرف ایک ہی دلیل تھی کہ کھاڑی میں پانی اُترا ہوا ہے لہٰذا کسی نہ کسی تاریخی چیز کے ملنے کا روشن امکان ہے۔ ہمارے ایک اور ساتھی نے مشورہ دیا کہ تاریخی آثار دلدلی کیچڑ میں ضرور ہوں گے کیوں کہ وہاں کسی کا کچھ تلاش کرنے کی نیت سے آنا محال ہے۔

ہم لوگ تو تفریحاً آئے تھے کہ گھنٹے دو گھنٹے بعد واپسی کی راہ لیں گے۔ یہ جنگل تو تھا نہیں کہ شام ہوئی اور درندے آٹپکے لیکن یہ سطور لکھنے میں کوئی شرم نہیں کہ اِس جگہ ٹھہرنے سے خوف محسوس ہوتا تھا اور ابھی تو رات بھی آنی تھی۔ شاید ماحول کے اثر کے ساتھ ساتھ اِس بستی سے متعلق گردش میں رہنے والی داستانوں نے ہم پر دہشت طاری کردی تھی۔ بہرحال ہم سب کو وہاں سے پرانے زمانے کی شے ملنے کی زبردست آرزو تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معمولی بحث کے بعد ہم چاروں وہاں رات بسر کرنے پر تیار ہوگئے۔

ہم نے کھاڑی کے کنارے اچھی طرح دیکھے بھالے لیکن کوئی چونکا دینے والی چیز نظر نہیں آئی۔ پھر سوچا کہ ابھی سورج کی خاصی روشنی ہے، کیوں نا دلدلی زمین کو بھی دیکھ لیا جائے۔ یہ کہنا آسان تھا مگر کیچڑ میں اُترنا آسان کام ثابت نہ ہوا۔

کیچڑ اور دلدلی زمین کے آس پاس کافی باریک بینی سے چھان بین کی مگر نتیجہ صفر رہا۔ پھر خیال آیا کہ ابنِ بطوطہ نے انھی کھنڈرات کے قریب کہیں بدبودار پانی کھڑا ہونے کی بات لکھی تھی، اسے تلاش کیا جائے۔ ہم نے جو باتیں اُس کے سفرنامے میں پڑھی تھیں، مِن و عن ویسی ہی پائی تھیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِن آثار کی بالکل یکساں حالت میں رہنے کی کچھ تو وجوہ ہوں گی۔ ہمیں زیادہ اِس بات سے

دل چسپی تھی کہ اب تک نہ تو کسی چیز کو چھیڑا گیا نہ ہی عوام یا محکمۂ آثارِ قدیمہ والے کوئی شے یہاں سے اُٹھا لے گئے۔ چنانچہ اِن بدقسمت بستی والوں کی کوئی نئی چیز ہم بآسانی دریافت کر سکتے ہیں۔

اب تک تو ہم کھنڈرات کے آس پاس ہی تھے، کھاڑی کے کنارے اور کیچڑ زدہ زمین پر بھی نظر ڈالی تھی۔ اب بدبودار پانی کی تلاش میں تھے۔ ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ کھڑا پانی کھاڑی کے علاوہ کہیں اور تلاش کیا جائے۔ دلدلی زمین پر بھی 'بدبودار' پانی نہیں مِلا۔

باہم مشورے سے ہم کھنڈرات کے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ آگے گئے ہوں گے کہ وہی مخصوص بو آنے لگی جو کھڑے پانی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہم نے بو کی سمت چلنا شروع کیا۔ کچھ آگے ایک جوہڑ نظر آیا۔ جوں جوں آگے بڑھے تعفن کی بو بڑھتی گئی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ مقام وہی ہو سکتا ہے جس کو ابنِ بطوطہ نے بیان کیا۔ قریب جانے پر واضح ہوا کہ اِس مقام پر پہلے کبھی پانی کھڑا رہا ہوگا۔ اب جوہڑ بالکل خشک تھا اور بدبو ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ہمارے چاروں طرف کھنڈرات اور بت بکھرے پڑے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ مکانوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ہم سب کی نظر ایک ساتھ سورج کی طرف اُٹھی۔ وہ اُسی مکان کے پیچھے غروب ہو رہا تھا جو اوندھا تھا۔ اِس کی ہیبت نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم سب ایک ساتھ پلٹے اور تیزی کے ساتھ اپنی کشتی کی طرف بڑھے۔ دس منٹ میں ہم اپنی کشتی کے اندر تھے۔ اِس دوران ہم میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بول سکا۔ کشتی والوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اوسان بحال کیے تو ہم بات کرنے کے قابل ہوئے۔ قارئین کو دعوت ہے کہ وہ بھی سفر نامہ ابنِ بطوطہ کا مطالعہ کریں اور اگر ہو سکے تو خود بھی اوندھی بستی کی سیاحت کر آئیں۔ ●●●

ہمدردی

شہریار عامر ملک

صبح صبح بازار کی طرف روانہ ہوا۔ رستے میں ایک چڑیا کا بچہ تڑپتا ہوا ملا۔ اسے اٹھا کر گھر لے آیا اور پنجرے میں ڈال کر دانا دنکا ڈال دیا۔ میرا خیال تھا کہ اڑنے کے قابل نہیں نہ ہی طاقت ہے اس میں! پنجرے میں رہ کر اچھی دیکھ بھال ہو سکے گی۔ جب اڑنے کے قابل ہوا تو چھوڑ دوں گا۔

ابھی پانی اور دانہ رکھ کے پیچھے ہی ہٹا تھا کہ پانچ سات چڑیاں چیں چیں کرتی پنجرے کے پاس آ کر چلانے لگیں۔ کچھ دیر تو میں نے انتظار کیا کہ شاید اڑ جائیں لیکن ان کا شور دیکھ کر مجبوراً پنجرے کا دروازہ کھولنا پڑا۔ چڑیوں نے تقریباً آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس بچے کو اڑنا سکھایا اور اڑا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔

وہ مجھے سکھا گئیں کہ ہم انسانوں سے یہ بے زبان پرندے حیوان ہزار درجے بہتر ہیں جنہیں درد ہو تو احساس بیدار ہو جاتا ہے اور سبھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور ہم انسان اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز ہونے کے باوجود بھی نہ کسی کی مدد کرتے نہ کسی کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔

خود غرضی، نفس پسندی اور ظلم اب ہم لوگوں میں اتنا کوٹ کوٹ کر بھر چکا کہ ہم ایک دوسرے کو دکھ دینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دلوں سے کدورت، نفرتیں نکالیے! اور محبت بانٹیے.....!!!

کچرے والے!

ایک مغرور کو سرِ راہ آئی پتا معمولی انسانوں کی قدر و قیمت سے آشنا کرائی

سمیرا کلثوم

اس گاڑی کے آتے ہی سارے محلے میں کھلبلی سی مچ جاتی۔ راجو اور شرفو تیزی سے مختلف گھروں کی گھنٹیاں بجانے لگتے۔ گھر میں موجود لوگ' خاص کر خواتین' شاپر اور کچرے کی ٹوکریاں ان دونوں کو پکڑانے لگتیں۔ وہ تیزی سے کچرا گاڑی میں انڈیلتے اور پندرہ بیس منٹ کے بعد گاڑی گلی کے آخری سرے پر کھڑی کر دیتے۔

کچرے والی گاڑی پر کسی اور کو اعتراض تھا یا نہیں' تارے کی ماں کو وہ بہت کھلتی تھی۔ جتنے طمطراق سے اس کا سنگ مرمر کی ٹائیلوں والا مکان کھڑا تھا' کچرے کی گاڑی بھی اسی طمطراق سے اس کے گھر کے آگے کھڑی ہوتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا گھر گلی کے آخری سرے پر تھا جہاں سے دائیں بائیں دو گلیاں تھیں۔ پھر یہ گلی نسبتاً چوڑی تھی۔ بقیہ دونوں گلیاں آگے جا کر قدرے تنگ ہو جاتی تھیں۔ کچرے والی گاڑی کے دائیں بائیں سے گزرنے والوں کو پریشانی ہوتی لہٰذا گاڑی کو تارے کی ماں کے مکان کے آگے کھڑا کر کے تینوں گلیوں کا کچرا سمیٹا جاتا۔

راجو شرفو اور ڈرائیور کو اگرچہ حکومت کی طرف سے تنخواہ ملتی تھی مگر مہینا شروع ہوتے ہی وہ لوگوں سے بھی پیسے مانگنا شروع کر دیتے۔ ''باجی! کچھ چائے پانی کے لیے پیسے دے دو۔'' محلے والوں میں سے کوئی پچاس' کوئی ساٹھ اور کوئی سو روپیا اپنی خوشی سے دے دیتا۔ البتہ تارے کی ماں کبھی بیس روپے سے زیادہ نہ دیتی۔

''ارے ماں جی! بیس روپے میں تو پانی کی بوتل بھی نہیں آتی۔ اتنی گرمی ہے' دس بیس اور دے دو۔'' راجو کہتا۔

''ارے میری کون سی فیکٹریاں چلتی ہیں۔'' وہ کڑک دار آواز میں کہتی۔ راجو مسکرا کر بیس روپے ہاتھ میں پکڑتا اور سر ہلاتا ہوا دوسرے گھر سے کوڑا لینے چلا جاتا۔

''ارے یہ گاڑی ذرا آگے یا پیچھے کھڑی نہیں کر سکتے؟'' ہر دوسرے دن وہ اعتراض کرتی۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی۔ تارے کی ماں نے کچرے والوں کو کھری کھری سنا دیں۔ یہ بھی کہا ''میرا تو گھر بدبو سے بھر جاتا ہے۔ تمھیں کہیں اور جگہ نہیں ملتی گاڑی کھڑی کرنے کے لیے۔''

راجو اور شرفو جو تارے کی ماں کی جلی کٹی سن لیتے تھے اس دن برداشت نہ کر سکے۔ گرمی بھی انتہا کی تھی۔ اتنی گرمی میں کوڑے کے ڈھیر اٹھا اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ پروفیسر صاحب کے گھر سے انھوں نے پانی مانگا تو ان کی بیگم نے دو ٹھنڈی تھار پانی کی بوتلیں انھیں دے دیں۔ اس دن تو وہ کوڑا لے کر چلے گئے مگر اگلے روز ان کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

دو دن' تین دن..... چار دن گزرے تو لوگوں کو تشویش ہوئی۔ پہلے بھی کبھی کبھار وہ ایک یا دو دن کی چھٹی کر لیا کرتے تھے۔ لوگ گھر کے اندر ہی ڈیوڑھی یا صحن میں شاپر یا باسکٹ

رکھ لیتے مگر اب تو کچرے کی بدبو لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی۔

اب کیا کریں.....؟ ہمسائیاں ایک دوسرے سے دریافت کرتیں۔ بڑی مشکل سے کسی نے کوڑا اپنی کام والی سے پھینکوایا۔ کسی نے بیٹے کی منتیں کیں، کسی نے شوہر سے کہا۔ دن کے اجالے میں تو نہیں رات کے اندھیرے میں گلیاں پار کر کے سڑک کے کنارے رکھے ڈرم میں کچرا ڈال دیا گیا۔ مگر یہ تو روز کا مسئلہ ہوگیا کیونکہ ہفتہ بھر ہونے کو آیا تھا مگر کچرے والی گاڑی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔

سبھی اہل محلہ جانتے تھے کہ یہ سب تارے کی ماں کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ وہ ان کی بے عزتی کرتی نہ وہ ہڑتال کرتے۔ اب ان کو کوئی کیسے ڈھونڈتا؟ محلے میں بڑی دلچسپ صورت حال تھی۔ خواتین صفائی کر کے یا کام والی سے کروا کر کچرا صحن کے کونے میں یا دروازے کے پاس ہی رکھ دیتیں۔ شوہر صاحبان شام کو بیچارے کام کاج سے تھکے ہارے آتے، نہا دھو کر کپڑے بدلتے تو بیویاں فرمائش کرتیں:

''اجی! ذرا کچرا تو باہر پھینک آئیں۔''

کوئی اپنے بیٹے کو کہتی تو وہ آگے سے حیران رہ جاتا۔

''میں.....اور کچرا باہر پھینکوں، لوگ کیا کہیں گے؟''

کام والی کی منت سماجت کی جاتی تو وہ ہاتھ کمر پر رکھ کر بولتی ''ہائے بی بی جی! میں کچرا باہر.....سڑک پر رکھے ڈرم میں پھینک کر آؤں.....نہ جی نہ.....سارے مکانوں والے مجھے دیکھتے ہیں.....ہائے وہ کیا سوچیں گے؟''

اور ''بی بی جی'' بیچاری سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔

مسئلہ صرف کچرے کی بدبو کا ہی نہ تھا، بلیوں کا بھی تھا۔ سارے محلے میں بلیاں دندناتی پھرتی تھیں۔ ذرا کسی شاپر یا ٹوکری میں سے چکن یا مٹن کی ہڈی کی خوشبو آئی، سارا شاپر پھاڑ دیا.....ساری ٹوکری الٹ دی۔

''ہائے! کچرے والے گاڑی کب آئے گی؟'' ہر دل سے دکھی صدا بلند ہونے لگی۔

اہل محلہ دبے دبے لفظوں میں تارے کی ماں کو برا بھلا بھی کہتے مگر یہ تو مسئلے کا حل نہیں تھا۔ خود بیچاری تارے کی ماں کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ ہوا یوں کہ گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے اس کی چاروں بیٹیاں مع اپنے بچوں کے رہنے آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں ناشتے کے علاوہ دو وقت کا کھانا پکتا۔ کبھی مرغی، سبزی، پھل، گوشت آتا، کبھی آئس کریم آتی۔ ظاہر ہے چھلکے اور کچرا بھی زیادہ ہوتا۔

کچھ دن تو وہ کام والی کو پیسے دے دلا کر کچرا پھینکواتی رہی لیکن پھر اس نے بھی انکار کر دیا۔ رات کو سارا کچرا صحن کے کونے میں رکھا تو بلیوں نے روسٹ کی ہڈیوں سے اچھا خاصا ڈنر کر ڈالا۔ صبح جب اٹھے تو سارے صحن میں کچرے کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر سے کام والی کی چھٹی تھی۔ بہویں تو پہلے ہی نندوں کے آنے سے پریشان تھیں اور ناک بھوں چڑھائے پھرتی تھیں۔ بیٹیوں کو کہتی تو اچھا نہ لگتا۔

سو تارے کی ماں نے خود ہی سارا کچرا اکٹھا کر کے شاپر میں ڈالا اور اسے صحن کے کونے میں واقع غسل خانے میں رکھ کر کنڈی لگا دی۔ اگلے دن کا کوڑا بھی اسی میں رکھ کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اسی سہ پہر جب بچے صحن میں کرکٹ کھیل رہے تھے تو کوئی بچہ باتھ روم گیا اور پھر باہر سے کنڈی لگانا بھول گیا۔

اگلی صبح جب کام والی صفائی سے فارغ ہو کر باہر والا باتھ روم دھونے گئی تو سارے غسل خانے میں پھیلا کوڑا دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بلیوں نے بھی تو خوب پکنک منائی تھی۔ اس نے خاموشی سے کنڈی لگائی اور سلام کر کے گھر چلی گئی۔ جب دوپہر کو تارے کی ماں پالک کے ڈنٹھلوں والا شاپر اٹھائے باتھ روم میں آئی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

کام والی کو برا بھلا کہتے ہوئے کچرا اکٹھا کرنے لگی۔ اس نے آٹے والے دو خالی توڑے کچرے سے بھرے اور اندر آ کر بیٹیوں کے بچوں سے کہنے لگی کہ کوئی تو انھیں باہر سڑک پر کوڑے کے ڈرم میں پھینک آئے۔

''اماں! ہمارے بچے کیا یہ کام کریں گے؟'' پہلی بولی۔

''ہائے اماں! اس کے باپ کو پتا چل گیا تو..... آپ اپنے کسی پوتے سے کیوں نہیں کہتیں۔'' دوسری بولی۔

''میں پھوپھو! کالج میں پڑھتا ہوں..... کالج میں۔'' پوتے نے کالر کھڑا کر کے اکڑ کر کہا۔

کسی نے کچھ کہا..... کسی نے کچھ..... ''اچھا تو میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔'' تارے کی ماں روہانسی ہو کر غصے سے بولی۔

''ارے آپ کسی جمعدار کا پتا کیوں نہیں کرتیں؟'' جیٹھانی بولی۔

''ارے نہیں ملتا جمعدار کوئی۔ کیا کروں.....؟'' وہ چلائی لہٰذا کچرا جہاں تھا وہیں رہا۔ اس رات سب نے سچے دل سے دعا کی کہ کچرے والے آ جائیں۔ سب اہل محلہ کی طرح پروفیسر صاحب کی بیگم بھی پریشان تھیں۔ کام والی ان کا کچرا بھی نہیں پھینکتی۔ پروفیسر صاحب صبح صبح تیار ہونے سے پہلے خاموشی سے کچرے کا شاپر اٹھاتے، ان کی بیگم نے کسی اچھے سے شاپر میں رکھا ہوتا۔ لوگوں کو گمان بھی نہ ہوتا کہ اس میں کچرا ہوگا اور کوڑے کے ڈرم میں ڈال آتے۔

اس دن بھی وہ پریشان پریشان سے شاپر اٹھائے سڑک کی جانب رواں دواں تھے کہ انھیں کچرے والی گاڑی نظر آئی جو ان کی گلی کو پار کرتی بلکہ یکسر نظر انداز کر کے سڑک کے دوسری جانب کالونی کی طرف جا رہی تھی۔

''ارے راجو.....!'' وہ زور سے چلائے۔

راجو نے فوراً مڑ کر دیکھا اور ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا۔ پروفیسر صاحب کی بیگم نے انھیں ہمیشہ ٹھنڈا پانی پینے کے لیے دیا تھا اور مہینے کے ۱۰۰ روپے بھی تو دیتی تھیں۔ ''کیسے ہیں پروفیسر صاحب آپ؟'' وہ چھلانگ مار کر گاڑی سے اترا۔

''ارے یار! سب لوگوں کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔'' وہ نرمی سے بولے۔ ''تارے کی ماں کی غلطی کی سزا سب کو تو نہ دو۔ جمعدار کوئی ملتا نہیں اور کچرے کی بدبو اور بلیوں کے کچرا پھیلانے سے سب پریشان ہیں۔''

''ہاں یار! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ایک عورت کی غلطی کی سزا سارے محلے کو نہ دو، مگر تم نہیں مانے۔'' گاڑی کا ڈرائیور بولا۔

''چلو یار! اپنے محلے کی طرف، شاباش راجو! غصہ تھوک دو۔'' پروفیسر صاحب بولے۔

''ٹھیک ہے سر جی! آپ کی بہت عزت کرتے ہیں ہم۔ آپ تو علم پھیلانے والے ہیں۔ آپ کا کہا نہیں ٹال سکتے، مگر تارے کی ماں کا کچرا نہیں اٹھاؤں گا۔'' راجو نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے..... اب چلو.....'' پروفیسر صاحب مسکرائے۔

گاڑی جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی بچوں نے شور مچا دیا ''کچرے والے آ گئے، کچرے والے آ گئے۔''

''ہائیں.....! کچرے والے آ گئے.....؟'' عورتیں دروازوں پر آ کر گاڑی کو دیکھنے لگیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاڑی پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کریں اور کچرا اٹھانے والے راجو اور شرفو کو پھولوں کے ہار پہنائیں۔ سب خوشی خوشی کچرے کی ٹوکریاں اور شاپر اٹھا اٹھا کر انھیں دینے لگیں۔ ان کا بس چلتا تو ایک دوسرے کو مبارک باد دیتیں۔

آج تارے کی ماں کو احساس ہوا تھا کہ دوسروں کا کچرا اٹھانے والے بھی کوئی معمولی انسان نہیں ہوتے۔ دوسروں کے گھروں سے بدبو اور گند دور کرنے والے بھی عزت کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ کچھ دیر دروازے پر کھڑی شرمندہ ہوتی رہی پھر گھگھیائی:

''وے راجو پتر! مجھے معاف کر دے۔ دیکھ اگر میں تیری سگی ماں ہوتی تو کیا مجھے معاف نہ کرتا۔ ارے یہ لے پتر پورا دو سو روپیا، کھا پی لینا۔'' وہ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

راجو خاموش رہا۔ اتنے میں پروفیسر صاحب گلی میں داخل ہوئے۔ وہ سب کچھ سن چکے تھے۔

''راجو! غصہ تھوک دو۔ وہ تمھاری ماں کے برابر ہیں۔'' وہ حسب عادت نرم لہجے میں بولے۔

راجو پروفیسر صاحب کا کہا نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے لپک کر دو سو روپیا پکڑا اور بولا: ''اماں! کچرا لے آؤ۔''

دنیا کا پہلا مہم جو حکمران

جس نے دریافتوں کے بحری اسفار کی بنیاد رکھی تھی

طارق عزیز خان

کرہ ارض کو سب سے پہلے دریافت کرنے کی کوشش قدیم مصری فرعون نیچو سوئم کے عہد میں کی گئی جب اُس کے بیڑے نے ۶۰۰ ق م میں براعظم افریقا کے گرد پہلا کامیاب چکر لگایا۔ اس زمانے میں افریقی باشندے زمین کو چپٹا یا اسپاٹ مانتے تھے۔ اُن کی دلچسپی کا محور و مرکز افریقا تھا۔ ان کے خیال میں کرہ ارض پر واقع افریقا سب سے بڑا اور واحد براعظم ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بحیرہ روم کے شمال (یورپ) اور بحیرہ احمر کے مشرق (ایشیا) میں پوشیدہ دنیائیں بھی بہت وسیع و عریض ہیں۔

کرہ ارض پر رقبے کے لحاظ سے ایشیا کے بعد دوسرا بڑا براعظم افریقا ہے۔ ۳ کروڑ ۲ لاکھ ۴۳ ہزار ۹ سو ۱۰ مربع کلومیٹر پر پھیلے افریقا کے شمال میں بحیرہ روم، مشرق میں بحر ہند، مغرب میں بحر اوقیانوس اور جنوب میں بحر ہند اور اوقیانوس پر مشتمل سمندر واقع ہے۔ گھنے استوائی جنگلات، وسیع صحراؤں، گھاس کے میدانوں اور مٹیالے دریاؤں پر مشتمل دلکش نظاروں کی سرزمین افریقا میں ترپّن آزاد ممالک واقع ہیں۔

کروڑوں سال پہلے ایشیا اور یورپ کے الگ ہونے پر افریقا کا جنم ہوا۔ اسے بنی نوع انسان کا آبائی گھر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مورخین کے مطابق یہاں چالیس لاکھ سال پہلے دو پاؤں پر چلنے والے قدیم انسان کا جنم ہوا۔ اگلے ہزاروں برس کے دوران نامعلوم وجوہ اور قدرتی آفات کے نتیجے میں افریقا میں انسانی آبادیاں بنتی مٹتی رہیں یہاں تک کہ بارہ ہزار سال قبل آخری برفانی دور کے خاتمے کے بعد شمالی افریقا میں دریائے نیل کے کنارے موجودہ انسانی تہذیب کی شروعات ہوئی۔ مانا جاتا ہے کہ مصر میں تمدن بابل، نینوا اور اطراف کے تمام علاقوں سے پہلے ظاہر ہوا۔ اسی مناسبت سے مصر کی حکومت بھی سبھی حکومتوں سے پہلے قائم ہوئی۔

مصر کے مختلف علاقوں سے ملنے والی قدیم تحریروں کے مطابق وہاں حکمرانی کرنے والے فراعین کے تیس خاندانوں کی حکومت کا ہونا ثابت ہے۔ ان میں سے سب سے پہلے فرعون کی حکومت کا زمانہ پانچ ہزار قبل از مسیح میں جبکہ آخری فرعون کی حکومت ۳۷۸ سے ۳۴۰ ق م کے دوران قائم تھی۔ مصر پر ۶۶۶ ق م سے ۵۲۵ ق م کے دوران عراق کی اشوری قوم سے تعلق رکھنے والے ۲۶ ویں خاندان کی حکومت قائم تھی۔ یہ حکمران نیچو (Necho) کہلاتے تھے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ۶۱۰ ق م میں نیچو سوئم وہ پہلا مصری حکمران تھا۔ جس نے بحری راستے کے ذریعے افریقا کو دریافت کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس نے ایک مضبوط بیڑے کی تیاری کا حکم دیا۔ چھ سے سات برس کی تیاری کے بعد چپوؤں کی مدد سے چلنے والی چار درجن کے قریب کشتیاں تیار کی گئیں۔ یہ کشتیاں اوپر سے کھلی تھیں اور ان میں سے ہر ایک میں قریب ۱۵ سے ۱۸ ملاحوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ نیچو کے

بیڑے سے متعلق کوئی مستند تاریخی تصویر موجود نہیں، تاہم قدیم مصریوں کی جہاز رانی میں مہارت کا اندازہ ۱۹۵۴ء میں دریائے نیل کے مغربی کنارے پر واقع خوفو (Khufu) کے اہرام سے ملنے والے ایک قدیمی کشتی کے ڈھانچے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

چپوؤں کی مدد سے چلنے والی یہ کشتی لگ بھگ ۲۶۰۰ ق م میں تیار کی گئی۔ اس کشتی کی لمبائی ۱۲۵ فٹ اور چوڑائی تیس فٹ ہے۔ کشتی کی بناوٹ میں نرسل (Papyrus)، سرکنڈوں اور اونٹ کی کھال کا استعمال کیا گیا۔ مصر میں کشتی بنانے کا فن زمانہ قبل از تاریخ سے بھی پہلے موجود تھا۔ مصر میں درختوں کی کمی کی وجہ سے کشتی بنانے کے لیے لکڑی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ شام و فلسطین کے علاقے تھے۔ مصری اپنی کشتیاں شاندار اور بہت خوبصورت بناتے تھے۔

لگ بھگ پچاس کے قریب کشتیاں تیار ہو جانے کے دوران پر سوار پانچ سو افراد نے ۶۰۰ ق م میں خلیج سویز کے کنارے سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ مصری بیڑا، خلیج سویز اور بحیرہ احمر (Red Sea) پار کر کے خلیج عدن میں سے ہوتا ہوا بحر ہند میں داخل ہوا۔ افریقا کی مشرقی ساحلی لکیر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے ان کی کشتیاں راس امید (Cape Of Good Hope) کے گرد گھوم کر جنوبی بحر اوقیانوس میں داخل ہوئیں۔ مغربی افریقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف آگے بڑھتے ہوئے وہ لوگ خط استوا پار کر کے شمالی بحر اوقیانوس میں پہنچے۔

انہوں نے افریقا کی مغربی گولائی کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ مصری بیڑے نے آبنائے جبل الطارق (Strait of Gibraltar) کے راستے بحیرہ روم تک رسائی حاصل کر لی۔ بحیرہ روم میں شمالی افریقا کی ساحلی پٹی کے ساتھ مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے بلا آخر وہ لوگ ۵۹۸ ق م میں واپس مصر پہنچ گئے۔ تقریباً تین سال پر محیط اس داستانی سفر کے دوران مصری بیڑے نے افریقی براعظم کے گرد پہلا کامیاب چکر پورا کیا۔

انہوں نے سفر کے دوران لگ بھگ انتیس ہزار کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کیا۔ اس میں خلیج سویز میں ۳۰۰ کلومیٹر، بحیرہ احمر میں ۲ ہزار کلومیٹر، خلیج عدن میں ۱ ہزار، بحر ہند میں ۸ ہزار، جنوبی بحر اوقیانوس میں ۵ ہزار، شمالی بحر اوقیانوس میں ۷ ہزار، آبنائے جبل الطارق میں ۱۰۰ اور بحیرہ روم میں ۵ ہزار کلومیٹر کا سفر شامل ہے۔ مصریوں کا افریقا کے گرد سفر مسلسل نہیں تھا۔ وہ بحر ہند، بحر اوقیانوس اور بحیرہ روم کے کنارے قیام کر کے تازہ دم ہوئے اور انھوں نے مصر لے جانے کے لیے نایاب اشیاء جمع کیں۔

افریقا کی بحر پیمائی کے بعد مصری حکمرانوں کی اگلی منزل افریقا کے اندرونی علاقے تھے۔ آنے والے برسوں میں انھوں نے خشکی کے راستے دریائے نیل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف شروع کی گئی مہمات کے دوران جھیل وکٹوریا، جھیل ٹانگانیکا اور جھیل ملاوی تک کے علاقے دریافت کیے۔ اندازہ ہے کہ ۴۰۰ ق م تک مصریوں نے خشکی کے راستے سے زمبابوے، بوٹسوانا اور جنوبی افریقا پار کر کے بحر اوقیانوس اور بحر ہند کے ملنے کے مقام کا نظارہ کر لیا تھا۔ آج ہمارے پاس کوئی ایسا مستند ریکارڈ موجود نہیں جس سے یہ پتا چل سکے کہ مصریوں نے شمالی افریقا میں صحرائے اعظم پار کر کے مغربی افریقا کی ساحلی پٹی تک رسائی حاصل کی تھی یا نہیں؟ تاہم مصریوں کی مہم جویانہ فطرت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شمال مغربی افریقا میں چاڈ، نائیجر اور مالی کے علاقوں کی خاک ضرور چھانی ہوگی۔

یوں فرعون مصر نیچو کو دریافتوں کے سفر کی بنیاد رکھنے والا پہلا غیر متنازع مہم جو مانا جاتا ہے۔ اس کے تشکیل کردہ بحری بیڑے نے بحر ہند، بحر اوقیانوس اور بحیرہ روم میں سفر کرتے ہوئے براعظم افریقا کے گرد پہلا کامیاب چکر پورا کیا۔

یادِ ماضی

سعدیہ کنول

ایک بوڑھے کا سبق آموز قصہ' بڑھاپے نے اُسے زندگی کے عجب ذائقے سے آشنا کرادیا

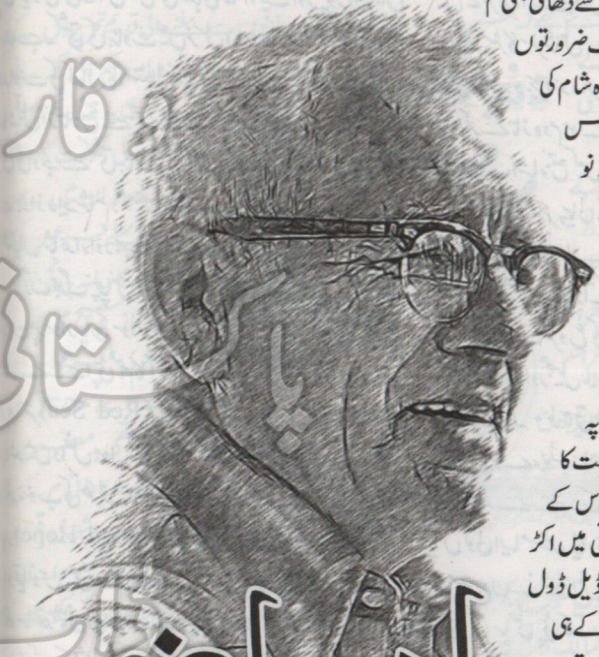

''او بابا جی!! نظر نہیں آتا تو کیوں نکل آتے ہو ہمارے متھے لگنے۔ ہونہہ' ایک تو ان بزرگوں کو گھر میں آرام کرنا پسند نہیں۔'' قمیص و پتلون پہنے کانوں میں ہیڈفون لگائے وہ نوجوان سفید ڈاڑھی والے بوڑھے پر ایک کڑی نگاہ ڈال کر بڑبڑاتا ہوا تیزی سے گزر گیا۔

غلام صادق ہلتے سر اور دھندلائی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس عمر میں اسے دکھائی بھی کم دیتا تھا لیکن تنہا رہنے کے سبب مختلف ضرورتوں کے لیے اسے خود ہی نکلنا پڑتا تھا۔ وہ شام کی چائے بنانے کی خاطر دودھ اور رس اٹھائے گھر جا رہا تھا کہ ایک راہ چلتے نوجوان سے ٹکرا گیا اور اس کی بے نقط سننا پڑ گئیں۔

جب سے بڑھاپے کے آسیب نے اس پہ سایہ کیا تھا' ایسی باتیں معمول کا حصہ بن رہی تھیں۔ شروع شروع میں تو لوگوں کے ایسے رویے پہ وہ الجھ جاتا لیکن اب اس نے اپنی شکست کا ل حد تک قبول کر لی تھی۔ نوجوانی میں اس کے مضبوط قویٰ تھے جن کے بل پر جوانی میں اکڑ اور آن بان قائم تھی۔ لوگ اس کے ڈیل ڈول اور اکھڑی طبیعت کے سبب کنی کترا کے ہی گزرتے۔ نیچی آواز میں بات کرتے لیکن جب سے وہ کمزور ہوا تھا' لوگوں کی آوازیں اونچی ہونے لگی تھیں۔ اب تو یادداشت بھی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

دکان پر کوئی چیز لینے جاتا تو پہنچ کر بھول جاتا کہ کیا لینا تھا۔ اب کل ہی کی بات ہے وہ صابن لینے محلے کی دکان پہ گیا۔

''بیٹا رمضان! وہ...... وو...... وہ ہے۔ وہ اپنا...... (ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے) دیکھو جی، کیا بھلا سا نام تھا۔''

''او بابا جی بول بھی چکیں اور بھی گاہک کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔''

دکان دار کی جھنجلاہٹ پہ ناچار کھسیانی ہنسی ہنس کے چپ ہو رہا کیونکہ بہت زور دینے پر بھی اسے کچھ یاد نہ آیا۔

دکان دار نے مشورہ دیا ''بابا جی' گھر سے لکھ کے لے آیا کریں جو بھی لینا ہو۔ اس طرح آپ کو بھی سہولت ہوگی اور ہمیں بھی۔''

''او پتر جی' اب آپ کو کیا بتاؤں' لکھ کر لانے کے لیے پہلے کاغذ قلم ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ ملے گا تو چشمہ کھو جائے گا۔ کتنے جوکھم کے بعد وہ ملا تو وہ شے ہی بھول جائے گی جو لکھنی تھی۔'' یہ تفصیل سن کر سب گاہک ہنسنے لگے۔

''اوئے چپ کرو بلونگڑیو۔ میں تو ایسے ہی آپ لوگوں کے ساتھ مخول کر رہا تھا۔ وہ صابن دے پتر' وہ کیا نام تھا اس کا؟'' اور سب ایک مرتبہ پھر ہنس پڑے۔

روپے پیسے کا حساب بھی اکثر غلط ہو جاتا کیونکہ سب نوٹ ایک جیسے دکھنے لگے تھے۔ دوسرا خود پر اعتبار نہیں تھا' اپنی ہر بات غلط لگتی جب تک کوئی دوسرا تصدیق نہ کر دے۔ اسے اپنی سمجھ پر یقین نہ آتا۔

اس نے گھر آ کر پتیلی میں دودھ اور چینی پتی ڈال کر چولہے پہ رکھی اور خود تھک کر قریب پڑی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ گزرتی عمر کے ساتھ حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ وہ دوسروں کے لیے کم اور خود اپنے لیے زیادہ مصیبت بنتا جا رہا تھا۔ غسل خانے جاتا تو پیسٹ ٹوتھ برش کے الٹی طرف لگا بیٹھتا اور سمجھ آنے پر خود ہی اپنے آپ پر ہنستا۔ کپڑے کتنی ہی مرتبہ اتارتا اور پہنتا کہ کہیں الٹے نہ پہن لوں۔ اسی دھینگا مشتی میں سیدھے کپڑے الٹ کر پہن لیتا۔ جب لوگ توجہ دلاتے تو دل ہی دل میں کڑھتا۔

اسے سمجھ نہ آتی کہ اس کے ساتھ کیسا جن چمٹ گیا ہے جس نے اس سے وجود اور عقل و ہوش چھین لیے ہیں۔ وہ اپنے وقت کا ہوشیار و سمجھدار شخص تھا۔ لوگ اپنے معاملات میں اس کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔

اسے یاد آیا' بچپن میں وہ اور اس کا دوست فیقا مل کر ڈھیروں شرارتیں کیا کرتے تھے۔ چاچا رحیمو گرمیوں کی دوپہر میں آم کے درخت تلے چارپائی ڈالے سو رہا ہوتا تو وہ دونوں دبے پاؤں جا کر اس کے پاؤں چارپائی سے باندھ دیتے۔ وہ اٹھ کر نامعلوم مجرموں کو برا بھلا کہتا تو چھپ کے ہنستے۔ مائی گلابو کے صحن میں پڑا حقہ گڑگڑاتے اگر وہ دیکھ لیتی تو دوڑ کر بیری کے درخت پہ چڑھ جاتے۔ بیر کھاتے کم اور ضائع زیادہ کرتے۔ اس وقت تک نہ اترتے جب تک نیچے کھڑی مائی جان بخشی کا پروانہ جاری نہیں کر دیتی۔

گرمیوں کی تپتی دوپہر میں آم کے درختوں پہ چڑھ کر پھل توڑتے۔ اگر باغ کا چوکیدار دیکھ لیتا تو پکڑائی ہی نہ دیتے۔ رات کے پچھلے پہر کھیتوں کو پانی دے کر واپس آتے ہوئے بشیرے نائی کے صحن میں دو ایک کنکر ضرور اچھال آتے۔ جب وہ صبح سویرے ساتھ والے گاؤں میں مقیم پیر جی کے پاس مع ثبوت جنات کی سرکوبی کے واسطے تعویز لینے جاتا تو خود بھی ساتھ ہو لیتے۔ بظاہر ہمدردی کرتے لیکن حقیقت میں جھوٹے سچے واقعات سنا کر اس کے خوف میں مزید اضافہ کر دیتے۔

ہہ...... ہا کیا وقت تھا جب زندگی زندہ دلی کی مثال تھی۔ اب تو زندگی کے زندان سے رہائی کے پروانے ملنے کا انتظار رہ گیا تھا۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے سوچا۔ اتنے میں کچھ جلنے کی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس نے جھٹ چولہے پہ نگاہ ڈالی۔ چائے کب کی ابل کر بہ چکی تھی۔ اب خالی پتیلی آگ میں بھن رہی تھی۔ اس نے چولہا بند کیا اور بے دلی سے خشک رس پانی کے ساتھ نگلنے لگا۔ ♦♦♦

اُردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

560 روپے
کی غیر معمولی بچت پائیے
اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

0300-4005579
urdudigest.pk
www.urdudigest.pk
subscription@urdudigest.pk

اُردو سے محبت کریں...... اُردو ڈائجسٹ پڑھیں

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے

معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام -- فون نمبر ----------------

پتا -- ای میل ----------------

میں ماہ ------ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم ---------- روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے ------- روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر IBAN#-Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0300-4005579 پر ایس۔ ایم۔ ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ---------------- دستخط ----------------

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ 325, G-III جوہر ٹاؤن لاہور، پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8, +92-42-35290707

میرے بچپن کے دن

اس دورِ یادگار کی سہانی باتیں جو خواب و خیال ہو چکا

رفیق سجاد

موسم گرما کی ان طویل شاموں کا ذکر میرے بچپن کی خوشگوار یادوں میں سے ایک ہے جب ننھیال اور ددھیال قریب قریب ہوا کرتے تھے اور ہم بچے (کسی مخصوص خاندان نہیں بلکہ محلے بھر کے ہم خیال بچے، لڑکے، لڑکیاں سبھی) گھر کے آنگن میں جمع ہو کر خوب اودھم مچاتے۔ آنکھ مچولی کھیلی جاتی، چار چار آنے ملا کر کوئی ایسی چیز دکان سے لائی جاتی جو ڈھیر ساری ہوتی اور کھاتے ہوئے وقت بھی لگتا۔ یعنی جلدی ختم نہ ہو، اس معاملے کا مرکزی خیال ہوتا اور فیصلہ عموماً "مرمرے" سادہ لفافوں میں پھیکی پھلیاں جو چاول بھون کر بنائی جاتی ہیں، کے حق میں ہوتا۔

ان دنوں موسم گرما کی شامیں گزارنا پورا ایک کلچر ہوتا تھا۔ قریب قریب ہر گھر میں سرشام صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا جس سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سارے ماحول کو معطر کر دیتی۔ گھر میں ایک جوان دوشیزہ کی ڈیوٹی ہوتی کہ وہ پانی لگے کچے صحن میں چارپائیاں بچھاتی۔ بعد ازاں عصر گھرانے کا سربراہ یا کوئی گبھرو جوان چارپائیوں کی حسب ضرورت نواڑ کستا۔ اس کام میں کبھی کبھی ہم بچوں کو بھی شامل کر لیا جاتا جو صرف کھولی گئی رسی پکڑے رکھنے کی حد تک ہی ہوتا تھا۔

بعد ازاں کمرے سے گول تہ کیے ہوئے بستر لا کر ان چارپائیوں پر رکھے جاتے۔ سورج چھپنے کے بعد اندر کمرے سے ایک میز کرسی لا کر اسکول جانے والے بچوں کی چارپائیوں کے قریب رکھ دیے جاتے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد بچے اپنے اپنے بستے سنبھال کر

اس میز کے گرد جمع ہو جاتے، دو تین بچے کھڑے رہ کر جبکہ ذرا بڑی عمر کا اور بڑے درجے میں پڑھنے والا بچہ کرسی پر بیٹھ کر گھر کا کام (ہوم ورک) شروع کر دیتے۔

اس دوران بڑے بھیا یا آپی سے بھرپور مدد لی جاتی بلکہ اکثر یہ افراد خود ہی آن دھمکتے اور نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ کبھی ریاضی کے سوال سمجھاتے تو کبھی اردو کے قواعد بیان کرتے، کبھی املاء کروائی جاتی تو کبھی اقبالؒ کی کسی نظم یا حالی کے اشعار کو آسان ترین پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی۔ ایسا اس لیے ہوتا تھا کہ ان دنوں ایک تو ٹیلی ویژن کی لعنت ابھی عام نہیں ہوتی تھی، محلے بھر میں کسی ایک خوشحال گھرانے میں ٹیلی ویژن ہوتا تھا اور وہ بھی زیادہ تر رات نو بجے خبر نامہ سننے کے بعد بند کر کے کونے میں کھسکا دیا جاتا۔ دوسرے یاری دوستیاں تو تھیں لیکن ایک معاملے پر سب گھرانوں میں اتفاق تھا کہ رات کو مغرب کے بعد کسی نے خصوصاً بچوں نے تو بالکل بھی گھر سے باہر نہیں رہنا۔ موبائل فون (سیل فون) جس کی کرم نوازیوں سے آج قوم کے سپوتوں کا خاصا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے، تک تو انسانی تصور کی پہنچ بھی نہیں تھی۔

لیمپ (لالٹین) کی روشنی میں اور بعد ازاں بجلی جیسی نعمت آنے کے بعد ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چھٹیوں کا کام کرتے ہوئے جب کوئی پروانہ کاپی پر آ بیٹھتا تو فوراً کاپی بند کر کے صفحوں پر اس کے پروں سے نقوش بناتے اور خوش ہوتے۔ جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں تو ساری کتابیں، کاپیاں سمیٹ کر کپڑے سے سلے بستے میں رکھ کر وہیں میز پر چھوڑ دیتے اور بستر پر لیٹے تاروں کو تکتے تکتے نیند کی آغوش میں پہنچ جاتے۔

ہفتے کا اختتام (ویک اینڈ) البتہ ہم پڑھنے والے بچوں کے لیے دوہری خوشیاں لاتا۔ چھوٹے بچے تو کم و بیش روزانہ دادی اماں سے کہانی سن کر سوتے لیکن ہفتے کے اختتام پر گھر کا کام (ہوم ورک) رات کو کہانی سننے کے چکر میں سرِ شام ہی ختم کر ڈالتے پھر رات کو دادی اماں کا بستر ہوتا اور ہم بچے ہوتے اور کسی شہزادی، شہزادے یا دیو پری کی کہانی ہوتی۔

آج کے ٹیلی ویژن ڈراموں اور فلموں سے کہیں زیادہ دلچسپی سے اس دور میں کہانیاں سنی اور سنائی جاتی تھی۔ رات کو دادی اماں سے کہانیاں سن سن کر جوان ہونے والی نسل نے معاشرتی ترقی میں آج کی ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور سیل فون کی رسیا جدید نسل سے کہیں زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

کالم کی یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ ایک بچے نے سوال کر دیا:

''انکل! یہ آپ اپنے ابو (بڑے ابا) کے بچپن کی باتیں لکھ رہے ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''ارے نہیں، یہ تو محض پچیس تیس سال پرانی ہمارے اپنے بچپن کی یادیں ہیں۔''

یہ سن کر بچے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ واقعی وقت نے کتنی تیزی سے فاصلہ طے کیا ہے، جدید کلچر نے آج کے بچوں سے شاموں کی خوشگواریت چھین لی ہے اب تو گھروں میں روز صبح شام پختہ فرش دھوئے جاتے ہیں لیکن کچی مٹی کی وہ سوندھی سوندھی خوشبو کہاں سے آئے؟ وہ چارپائیوں بھرا آنگن تو خواب و خیال ہی ہو گیا کہ اب قوم کمروں کی حبس زدہ زندگی کی عادی ہو گئی ہے۔ مل بیٹھ کر گھر کا کام (ہوم ورک) کرنے کا حسن ٹیوشن کلچر نے گہنا دیا ہے۔ مضامین کی بھرمار اور ترقی کی دوڑ نے ذہانت بھی چھین لی ہے۔ ◆◆◆

بدگمان

شک کے ہاتھوں اپنی بسی بسائی زندگی اُجاڑ دینے والے احمق کا قصۂ عجب

شاکر لطیف

جسٹن اپنے خاندانی وکیل، مسٹر رابرٹ کے دفتر میں موجود تھا۔ مسٹر رابرٹ نے آج اُسے اس کے مرحوم والد مسٹر جورڈی کی وصیت پڑھ کر سنانی تھی۔ جسٹن کو معلوم نہیں تھا کہ مرحوم والد نے اپنی وصیت میں اس کے نام کیا کچھ کیا ہے۔ تاہم اُسے یقین تھا کہ جائیداد کا ایک بڑا حصہ اسی کے نام پر ہوگا۔ اس کے والد مسٹر جورڈی پانچ دن پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ وہ خاصے طویل عرصے سے بیمار تھے اور اُن کی یہ طویل علالت آخرکار اُن کی موت کی وجہ بن گئی۔

انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ دونوں بیویاں اُن سے بھی پہلے جہانِ فانی سے کوچ کر چکی تھیں۔ اُن کی بیویوں سے بس ایک ایک ہی اولاد تھی: ایک جسٹن اور دوسرا اس کا سوتیلا بھائی مارٹی جس سے جسٹن کو شدید نفرت تھی۔ وہ شروع سے ہی یہ سمجھتا آ رہا تھا کہ مارٹی خواہ مخواہ اس کے باپ کی دولت میں حصے دار بن گیا ورنہ یہ ساری دولت اُسی کی تھی۔ ماؤں کے انتقال کے بعد اُن دونوں کی پرورش مسٹر جورڈی نے ہی کی تھی۔

انھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ جسٹن اور مارٹی آپس میں محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رہیں۔ وہ جب تک زندہ رہے جسٹن کو نصیحتیں بھی کرتے رہے مگر جسٹن ان کی بات ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اُڑا دیتا۔ اُس نے تو کبھی مارٹی کو سوتیلے بھائی کی بھی حیثیت نہ دی تھی۔ وہ اُسے بچپن سے ہی اپنا دشمن سمجھتا آ رہا تھا۔ اس کے بھائی مارٹی کی سوچ اور رویہ جسٹن کے بالکل برعکس تھا۔ وہ جسٹن کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا اور اُس سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ مودبانہ لہجہ اختیار کر لیتا۔

مارٹی جسمانی طور پر فٹ نہیں تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں میں پیدائشی نقص تھا جس کی وجہ سے اُسے چلنے کے لیے بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ وہ اپنی اس جسمانی خامی کے باوجود بڑے حوصلے اور ہمت سے زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے تھا مگر کبھی کبھی جسٹن کا نارواسلوک دیکھ کر اُس کا حوصلہ بھی جواب دینے لگتا۔ اُسے اپنے بھائی سے

سوتیلا ہونے کے باوجود بڑی محبت اور انسیت تھی اور وہ جسٹن سے بدلے میں ویسی ہی محبت کا طالب تھا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محض ماؤں کے فرق نے اُس کے بھائی کو اتنا بیگانہ کیوں بنا دیا ہے؟

آخر اُن دونوں کا باپ تو ایک ہی تھا۔ مسٹر جورڈی ایک جہاندیدہ آدمی تھے۔ انھیں اپنی زندگی میں ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ جسٹن کبھی بطور بھائی مارٹی کو قبول نہیں کرے گا۔ اس لیے انھوں نے یہ سوچ کر کہ زندگی کا کیا بھروسا اپنی وصیت تیار کروا دی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد کو لے کر دونوں بھائیوں کے درمیان کوئی تنازع کھڑا ہو۔ ویسے انھیں جسٹن کی سوچ پر ہمیشہ افسوس رہا۔ مارٹی اُس سے بہت مختلف تھا۔ دونوں بھائی بھی آپس میں پیار اور یگانگت سے رہیں..... مسٹر جورڈی یہ حسرت دل میں لیے اب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کی موت کو پانچ دن گزر چکے تھے۔ جسٹن اور مارٹی اُن کی تمام آخری رسومات بھی نمٹا چکے تھے۔

اسی لیے اُن کے خاندانی وکیل نے دونوں بھائیوں کو اپنے دفتر بلا لیا تا کہ مسٹر جورڈی کی وصیت پڑھ کر سنائی جا سکے۔ جسٹن کافی دیر سے دفتر میں موجود تھا تاہم مارٹی ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا جسٹن کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ اُسے مارٹی پر شدید غصہ آ رہا تھا جو ابھی تک نہیں پہنچا تھا حالانکہ اُسے بھی جسٹن کی طرح کار پر ہی اس جگہ آنا تھا۔

مارٹی ٹانگوں سے معذور تھا' اسی لیے اس نے ایک ڈرائیور بھی رکھا ہوا تھا۔ جسٹن کو محسوس ہو رہا تھا جیسے مارٹی جان بوجھ کر آنے میں تاخیر کر رہا تھا تا کہ اُسے انتظار کی کوفت اٹھانی پڑے۔ جسٹن بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ورنہ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر وہاں سے چلا جائے۔ تاہم معاملہ کیونکہ اس کے مرحوم والد کی وصیت کا تھا اس لیے وہ مجبوراً صبر و تحمل سے کام لیتا رہا۔

اسی لمحے مارٹی اپنی بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے دفتر میں داخل ہوا۔ ''ہیلو مسٹر رابرٹ! ہیلو جسٹن۔'' اس نے دفتر میں داخل ہوتے ہی کہا۔

''تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟'' وکیل مسٹر رابرٹ نے بھی جواباً ہیلو کہتے ہوئے اُس سے شکوہ کیا۔

''دراصل میرا ڈرائیور دیر سے میرے پاس پہنچا تھا۔ اسی لیے دیر ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں خود تو کار ڈرائیو نہیں کر سکتا۔'' مارٹی نے خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وضاحت پیش کی۔ جسٹن خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گفتگو میں مداخلت کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر بدستور ناگواری کے تاثرات موجود تھے۔

''ٹھیک ہے اب تم دونوں موجود ہو تو میں تمہیں تمہارے مرحوم والد کی وصیت پڑھ کر سناتا ہوں۔'' مسٹر رابرٹ نے ایک فائل کھولتے ہوئے کہا ''اس وصیت کے مطابق تم دونوں بھائی اپنے والد کی تمام جائیداد کے آدھے آدھے وارث ٹھہرائے گئے ہو لہٰذا آج سے آدھی جائیداد جسٹن کی ملکیت ہے اور آدھی مارٹی کی۔''

''یہ کیسی وصیت ہے۔'' جسٹن وصیت سن کر پھٹ پڑا۔ ''میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔''

''یہ وصیت تمہارے مرحوم والد نے متعدد گواہوں کی موجودگی میں تیار کروائی تھی۔ اس لیے تم اس کی قانونی حیثیت کو چیلنج نہیں کر سکتے۔'' مسٹر رابرٹ نے درشت لہجے میں جسٹن کو جواب دیا ''اور پھر مارٹی بھی مسٹر جورڈی کی سگی اولاد ہے۔ اس کے سوتیلے پن کا رشتہ تمہارے ساتھ ہے۔''

''لگتا ہے میرے مرحوم والد کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا جو انھوں نے ایک معذور اور اپاہج کو اپنی آدھی جائیداد کا وارث بنا دیا۔'' جسٹن کے الفاظ مارٹی کے دل پر کسی گھونسے کی طرح

لگے اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ تاہم اس نے جسٹن کو جواب دینے سے ہمیشہ کی طرح احتراز کیا۔ اُسے اپنے بڑے بھائی سے ہمیشہ یہ گلہ رہا تھا کہ وہ اُس کے پُرخلوص رویے کا جواب آخر نفرت کے ساتھ کیوں دیتا ہے۔ وہ کون سی وجوہ ہیں جن کی وجہ سے جسٹن اُس سے اتنا بدگمان ہو گیا ہے؟ کیا محض دولت کے لالچ نے اُس کے دل میں رشتوں کا تقدس ختم کر دیا ہے؟

''میری ڈیوٹی صرف اتنی ہی تھی کہ میں تمہیں مسٹر جورڈی کی وصیت پڑھ کر سنا دوں۔ تفصیل تم خود دیکھ سکتے ہو۔'' مسٹر رابرٹ نے وصیت نامے کی ایک ایک کاپی جسٹن اور مارٹی کے حوالے کرتے ہوئے کہا ''اگر کسی کو اس وصیت پر اعتراض ہے تو وہ عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔''

جسٹن نے وصیت نامے کی کاپی تھامی اور پھر خاموشی سے اُٹھ کر دفتر سے باہر نکل گیا۔

☆☆

جسٹن اور مارٹی اب رہتے تو ایک ہی گھر میں تھے مگر کانوں کی طرح اور یہ بیگانہ پن جسٹن کا ہی پیدا کردہ تھا۔ وہ مارٹی کی کوششوں کے باوجود اُس سے بہت کم بات کرتا۔ اُسے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتا۔ وہ مارٹی سے اس حد تک بدگمان ہو چکا تھا کہ اُسے اس کا پُرخلوص رویہ بھی بناوٹی لگنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مارٹی کے اس خلوص کے پیچھے بھی کوئی چال ہے۔ مارٹی اُس کی عدم توجہی اور نفرت پر دل ہی دل میں افسردہ رہنے لگا۔

زندگی اسی طرح گزر رہی تھی اور مارٹی کی مایوسیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جسٹن کی عدم توجہی کی وجہ سے وہ اب خود کو بہت اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔

☆☆

آج ویک اینڈ تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ جسٹن اپنے ایک دوست کے گھر موجود تھا۔ اُس کے دوست کا نام رچرڈ تھا اور وہ بھی جسٹن کی طرح خاصا دولت مند تھا۔ وہ دونوں تاش کی بازی لگائے بیٹھے تھے اور کھل کر پیسے لگا رہے تھے۔ تاہم آج جسٹن کا ستارہ گردش میں تھا اور وہ مسلسل پیسے ہار رہا تھا۔

''بس یار اب مزید نہیں۔'' آخر کار جسٹن نے کھیلنے سے ہاتھ روک لیا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔'' رچرڈ نے بھی کوئی تعرض نہ کرتے ہوئے تاش کی گڈی ایک جانب پھینک دی۔ ''آج کل تم کچھ پریشان رہنے لگے ہو۔'' رچرڈ نے اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں۔'' جسٹن نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں اپنے مرحوم والد کی وصیت سے خاصا غیر مطمئن ہوں۔ انھوں نے میرے سوتیلے معذور بھائی کو اپنی آدھی جائیداد کا وارث بنا دیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جائیداد کا زیادہ تر حصہ مجھے دیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ میرا سوتیلا بھائی مارٹی پوری جائیداد حاصل کرنے کی میری خواہش میں رکاوٹ بن گیا ہے۔''

''اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹایا بھی تو جا سکتا ہے۔'' رچرڈ نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' جسٹن نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ''تم میرے جگری دوست ہو۔ اس لیے کھل کر بات کرو۔''

''مطلب بالکل سیدھا اور صاف ہے۔'' رچرڈ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''تم اپنے والد کی ساری دولت کے اب بھی مالک بن سکتے ہو۔ بشرطیکہ تمہارا بھائی اس دنیا میں نہ رہے۔ میرے ایسے کئی جرائم پیشہ افراد سے تعلقات ہیں جو معقول معاوضے پر خاموشی سے تمہارے بھائی کو دوسری دنیا رخصت کر دیں گے۔ وہ تمہارے بھائی کو مارتے وقت اُس کے پاس موجود نقدی وغیرہ بھی لوٹ لیں گے تا کہ پولیس کو یہ

واردات کسی ڈکیتی کا شاخسانہ معلوم ہو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو رچرڈ!" جسٹن اس کی وضاحت سن کر برہمی سے بولا "یہ حقیقت ہے کہ مجھے مارٹی سے نفرت ہے اور یہ میرے رگ و پے میں سرایت کر چکی مگر میں اتنا گھٹیا بھی نہیں کہ محض دولت کی خاطر اپنے سوتیلے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" رچرڈ نے کندھے اُچکا کر کہا "میں نے تو یونہی بات کر دی تھی۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ جس طرح تم اپنے مرحوم والد کی تمام جائیداد حاصل کرنے کے خواہاں ہو ہوسکتا ہے یہ تمنا مارٹی کے دل میں بھی ہو اور وہ بھی تمہیں راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔"

"اپنے اندازے اور مفروضے اپنے پاس ہی رکھو۔" جسٹن نے ناگواری سے کہا "اور بالفرض مارٹی ایسا چاہے بھی تو وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ وہ ایک معذور انسان ہے۔"

"وہ جسمانی طور پر معذور ہے، ذہنی طور پر نہیں میرے دوست!" رچرڈ ناصحانہ لہجے میں بولا۔ "بہرحال میں نے تو صرف اپنی رائے دی تھی اگر تمہیں میرا مشورہ پسند نہیں آیا تو اس موضوع کو چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ جسٹن کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گیا۔

جسٹن رچرڈ کے گھر سے روانہ ہوا تو اُس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ رچرڈ کی باتیں سُن کر آج اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے اپنے گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کار ایک میڈیکل اسٹور کے پاس روک دی۔ وہ سر درد کی کچھ گولیاں لینا چاہتا تھا۔

میڈیکل اسٹور کے مالک مسٹر نکلسن جسٹن کے پرانے واقف تھے۔ جسٹن نے سر درد کی گولیاں حاصل کیں اور پھر کاؤنٹر پر بیٹھے مسٹر نکلسن کو پیسے ادا کر دیے۔

"جسٹن، یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تمہارے بھائی مارٹی کو اس عمر میں ہی دل کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔" جسٹن جیسے ہی جانے کے لیے مُڑا مسٹر نکلسن کی بات نے اُسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ مارٹی کو دل کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔" اس نے حیرت بھرے لہجے میں مسٹر نکلسن سے استفسار کیا۔

"ابھی آدھے گھنٹے پہلے ہی وہ یہاں آیا تھا۔ اُس نے خود مجھے یہ بات بتائی ہے۔" مسٹر نکلسن نے جواب دیتے ہوئے کہا "اور ہاں وہ مجھ سے دل کے مریضوں کے لیے حال ہی میں مارکیٹ میں آئی ایک مخصوص دوا بھی لے کر گیا ہے۔ ہم یہ دوائی بغیر ڈاکٹری نسخے کے ہرگز فروخت نہیں کرتے کیونکہ اگر یہ دوا تین گنا زائد مقدار میں استعمال کی جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بے ذائقہ اور بے رنگ دوا ہے کسی بھی مشروب میں آسانی سے گھل جاتی ہے۔ مارٹی کا کہنا تھا کہ وہ ڈاکٹر کا نسخہ گھر بھول آیا ہے۔ میں اُسے ذاتی طور پر جانتا تھا اس لیے میں نے اُسے یہ دوا دے دی۔ ویسے اُس کے ڈاکٹر نے تو اُسے بتایا ہی ہو گا کہ اس دوا کو زائد مقدار میں استعمال کرنے سے موت واقع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

"کیا اس دوائی سے لازماً انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔" جسٹن نے ایک خیال آنے پر پوچھا۔

"ہاں۔" مسٹر نکلسن نے جواب دیتے ہوئے کہا "اگر مطلوبہ مقدار سے تین گنا زائد مقدار میں استعمال کی جائے تو زندگی بچنے کے امکانات بالکل معدوم ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ مسٹر نکلسن۔" یہ کہتے ہوئے جسٹن میڈیکل اسٹور سے باہر نکل آیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور پھر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ تب اُس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ مارٹی کو کسی قسم کا عارضہ دل لاحق نہیں۔ تو پھر اُس نے

اس دوائی کو کیوں حاصل کیا تھا؟ جسٹن کے ذہن میں اس وقت اپنے دوست رچرڈ کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا، کہیں مارٹی بھی ساری دولت پر قبضہ جمانے کے لیے اسے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ نہ بنا رہا ہو۔ وہ جسمانی طور پر معذور ہے ذہنی طور پر نہیں۔ حالات و واقعات اسی جانب اشارہ کر رہے تھے کہ رچرڈ کی باتیں بے وزن نہیں تھیں۔

گھر کے مین گیٹ پر پہنچ کر اُس نے ہارن دیا تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا مارٹی کو اپنی بیساکھیوں کے سہارے کھڑے دیکھ بے اختیار چونک پڑا۔

"بھائی! کیسے ہیں آپ؟" مارٹی نے خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" جسٹن نے درشت لہجے میں اُسے جواب دیا۔ "مگر تم آج خلاف توقع جاگ کیوں رہے ہو؟ تمہیں تو جلد سونے کی عادت ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی لیکن آج میں نے آپ کے لیے چاکلیٹ ملک شیک بنایا تھا۔ اسی لیے میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"چاکلیٹ ملک شیک۔" جسٹن کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ شک اب یقین کی سطح تک جا پہنچا کہ مارٹی نے میڈیکل اسٹور سے وہ مخصوص دوا اُسے مارنے کے لیے ہی حاصل کی تھی۔ تو گویا رچرڈ کا گمان درست تھا۔ مارٹی بھی باپ کی ساری جائیداد حاصل کرنے کا خواہاں تھا اور اُسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ وہ سر درد کی گولیاں لینے مسٹر نکلسن کے میڈیکل اسٹور پر چلا گیا ورنہ اسے تو مارٹی کے منصوبے کی بھنک بھی نہ پڑتی۔

"بہت مزے کا ملک شیک ہے بھائی۔" مارٹی نے کہا "آئیں دونوں مل کر پیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ سامنے موجود صوفے کی طرف بڑھا اور پھر اپنی بیساکھیاں ایک طرف رکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز پر چاکلیٹ ملک شیک کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جسٹن خاموشی سے آگے بڑھا اور مارٹی کے بالکل سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

مارٹی نے ایک گلاس اُس کے سامنے کھسکایا جبکہ دوسرا اپنے سامنے کر لیا۔ "بھائی یہ چاکلیٹ ملک شیک بہت خاص ہے اور آپ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔" بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ بہت عجیب اور معنی خیز ہو گیا تھا۔

"کیا واقعی۔" جسٹن نے بغور مارٹی کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر شاید تمہیں علم نہیں کہ میں بغیر سٹرا کے کولڈ ڈرنک یا ملک شیک نہیں پیتا۔ ذرا باورچی خانے سے میرے لیے سٹرا تو لے کر آؤ۔"

"ابھی لایا بڑے بھائی۔" مارٹی نے فوراً ہی اپنی بیساکھیوں کے سہارے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر کچن کی جانب بڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا جسٹن نے پھرتی سے مارٹی کا گلاس اپنے گلاس سے تبدیل کر لیا۔ دونوں گلاس بالکل ایک جیسے تھے اُسے یقین تھا کہ مارٹی کو اندازہ نہیں ہو سکے گا کہ اس نے گلاس تبدیل کر لیے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں مارٹی واپس آ گیا۔ اس نے اپنی بیساکھیاں ایک طرف رکھیں اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بھائی باورچی خانے میں سٹرا نہیں مل سکا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" جسٹن نے تفہیمی لہجے میں کہا۔ "میں ویسے ہی اسے پی لیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گلاس اٹھا لیا۔ گلاس تبدیل کرنے کے بعد اب اُس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات موجود تھے۔ مارٹی نے بھی اپنا گلاس اٹھا لیا اور پھر وہ دونوں گھونٹ گھونٹ چاکلیٹ شیک پینے لگے۔

"جانتے ہو بھائی میں نے آپ سے کیوں کہا تھا کہ یہ

ملک شیک آپ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔'' مارٹی نے گلاس خالی کرتے ہی کہا۔

''نہیں تم خود ہی بتا دو۔'' جسٹن نے بھی ملک شیک ختم کرتے ہوئے استفسار کیا۔ تاہم ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ موجود تھی۔

''اس لیے بھائی کہ آپ نے مجھے کبھی اپنا بھائی نہیں سمجھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک معذور شخص ہوں' ہمیشہ مجھ سے نفرت کی۔ میرے خلوص اور محبت کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ میں برسوں سے آپ کی نفرت اور عدم توجہی برداشت کر رہا ہوں مگر اب میری ہمت جواب دے گئی تھی اور میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔'' مارٹی کے لہجے میں افسردگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''میں بخوبی آگاہ ہوں تم نے جو فیصلہ کیا ہے۔'' جسٹن نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''مجھے میڈیکل اسٹور کے مالک مسٹر نکلسن سے معلوم ہو چکا کہ تم نے اُن سے ایک ایسی دوائی حاصل کی ہے جس کی زائد مقدار کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ تم نے جائیداد حاصل کرنے کے لیے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے میرے گلاس میں اُس دوائی کی زائد مقدار شامل کر دی تھی تاکہ میں تمہارے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جاؤں مگر شاید تم بھول گئے تھے کہ میں بھی تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ جب تم باورچی خانے میں گئے تھے تو میں نے اپنا گلاس تمہارے گلاس سے تبدیل کر دیا۔''

''یہ آپ نے کیا کر دیا بھائی۔'' جسٹن کا جواب سُن کر مارٹی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر جسٹن کے حلق سے ایک زوردار قہقہہ برآمد ہوا اور وہ استہزائیہ لہجے میں بولا:

''میں نہیں مروں گا' مرو گے تم!''

''بھائی وہ دوائی میں نے آپ کے نہیں اپنے گلاس میں ملائی تھی۔ آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کو مارنے کی کوشش کروں گا۔'' بات کرتے ہوئے مارٹی کی آنکھوں سے یکلخت آنسو نکل آئے۔ ''میں نے تو آپ کو ہمیشہ عزت دی ہے۔ میں تو آپ کو اپنے سگے بھائی کی طرح چاہتا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود آپ کی نفرت اور حقارت کی وجہ سے مایوس ہو گیا تھا۔ ویسے بھی میں ایک معذور اور اپاہج انسان ہوں۔ اس لیے میری زندگی شاید ایک بوجھ تھی۔''

''میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں آپ کے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جاؤں گا۔ میں آپ کے نفرت انگیز رویے کی وجہ سے مایوس ہو چکا تھا۔ اسی مایوسی کے عالم میں' میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں آپ کے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جاؤں اور میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نے اُس دوا کی بہت زیادہ مقدار ملک شیک کے گلاس میں ڈالی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کے نہیں اپنے گلاس میں۔ میں نے آپ کو مارنے نہیں خود مرنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' مارٹی کا انکشاف سن کر جسٹن کے حلق سے بمشکل اتنا ہی نکل پایا تھا کہ وہ یکلخت زمین پر جا گرا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور سانسیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ دوائی کی زائد مقدار نے تیزی سے اثر دکھایا تھا۔

''بھائی بھائی! یہ آپ نے کیا کر دیا۔ آپ نے گلاس کیوں تبدیل کر دیے۔ جس موت کو میں گلے لگانا چاہتا تھا' وہ آپ کے سر پر کیوں منڈلانے لگی ہے۔'' مارٹی صوفے سے نیچے اُتر کر ہاتھوں کے بل رینگتے ہوئے اس کے پاس آیا اور پھر بُری طرح رونے لگا۔

مگر اب اُس کے رونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جسٹن کے چہرے سے زندگی کی رمق معدوم ہو چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ اس نے ملک شیک کے گلاس تبدیل کر کے اپنی طرف سے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا مگر وہ اپنی بدگمانی کی وجہ سے اپنے دام میں آپ ہی آ گیا۔ ●●●

جب جنرل ضیاء الحق کا طیارہ گرا

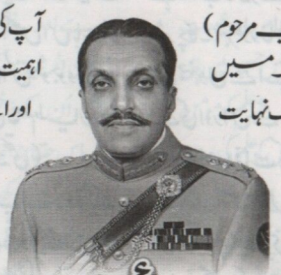

افتخار مجاز

پی ٹی وی میں گزرے شب و روز کی سبق آموز داستان

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کی سہ پہر کی بات ہے۔ غالباً اتوار کا دن تھا۔ یہ نیوز فال (News Fall) کے حساب سے ایک ٹھنڈا دن تھا۔ ہمارے ڈائریکٹر نیوز مرحوم مصلح الدین خلاف معمول کسی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ کنٹرولر نیوز حبیب اللہ فاروقی (بعد میں ڈائریکٹر نیوز بن کر ریٹائر ہوئے) اور چیف رپورٹر شمیم الرحمن پپو (اب مرحوم) نیوز روم میں انگریزی ڈیسک پر موجود تھے۔ میں خبرنامہ ڈیسک پر بیٹھا تھا' اچانک میرے ایک نہایت قریبی دوست' پولیس سروس کے اعجاز ملک (بعد میں ڈی آئی جی بنے' ایف آئی اے میں ڈائریکٹر کے عہدے پر رہے اور دوران سروس ہی ان کا انتقال ہو گیا) کا فون آیا جو ہب ایس پی خوشاب تھے۔

انھوں نے پوچھا کہ صدر ضیاء الحق کہاں گئے ہوئے ہیں؟ مجھے علم نہیں تھا۔ اعجاز ملک نے بتایا کہ وہ جہاں بھی گئے ہوئے تھے' اُن کا جہاز تباہ ہو گیا ہے اور غالباً وہ زندہ نہیں بچے۔ یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ بھی پریشان ہو گئے کہ پتا نہیں کیا بات ہوئی ہے۔ میں اٹھ کر انگلش نیوز ڈیسک پر گیا اور فاروقی صاحب سے پوچھا کہ صدر صاحب کہاں گئے ہوئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بہاولپور۔ میں نے انھیں بتایا کہ ان کا طیارہ کریش ہو گیا ہے۔

فاروقی صاحب بھی پریشان ہو گئے اور انھوں نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا کہ کیا بات کر رہے ہو؟ اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کی خبر کا منبع کیا ہے؟ خبروں میں منبع کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں نے بتایا تو وہ سنجیدہ ہو گئے اور اپنے دفتر کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے پی آئی اے' ایئرپورٹ' پی آئی ڈی وغیرہ کئی جگہوں پر فون ملایا لیکن کوئی آدمی فون پر اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد قائم مقام ایم ڈی پی ٹی وی' فضل کمال کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ صدر کا پروفائل تیار کر لیں۔ اس پر فاروقی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ کی خبر بالکل ٹھیک ہے۔ یوں یہ خبر ایک گھنٹا پہلے میں نے پی ٹی وی نیوز میں بریک کر دی تھی۔

اُس دن خبرنامہ کا دورانیہ صرف ۱۳ منٹ رہا۔ اتنے بڑے واقعہ پر کوئی تبصرہ وغیرہ شامل نہیں کیا گیا۔ اب اس

انتہائی سنجیدہ واقعہ سے متعلق ایک مزاحیہ بات بھی سن لیجیے۔ ہمارے پی ٹی وی ملتان بیورو کی ایک ٹیم کسی اور سلسلے میں اُسی علاقے بستی لال کمال کے قریب موجود تھی جہاں صدر کا جہاز گرا تھا لیکن ہماری نیوز کیمرا ٹیم نے اس کی کوریج نہیں کی۔ بعد میں ٹیم کے لیڈر اسلم غوری مرحوم کی جو ایک ملنگ طبیعت آدمی تھے' جواب طلبی کی گئی تو انھوں نے کہا انھیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ اُس طیارے میں صدر ضیاء الحق موجود تھے۔ بلکہ انھوں نے یہ سمجھا کہ پی آئی اے کا کوئی عام طیارہ گرا ہے۔ (گویا پی آئی اے کا طیارہ گرنا کوئی خبر نہ تھی)

غوری صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی ہو جائے۔ وہ یہ کہ یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو بیمار تھے۔ پی ٹی وی نیوز تیار تھا کہ ان کے مرنے پر خبروں کا خصوصی بلیٹن ہوگا لیکن جب ان کا انتقال ہوا تو پی ٹی وی پر کوئی خبر نہ تھی۔ ڈائریکٹر نیوز نے رات کی ڈیوٹی پر موجود اسلم غوری کو طلب کیا اور پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ انھوں نے جواباً کہا کہ جب ہمارے قائد اعظم کا انتقال ہوا تھا تو کیا یوگوسلاویہ کے ٹیلی ویژن نے کوئی خصوصی نیوز بلیٹن نشر کیا تھا؟

میں نے جو واقعات آپ کی نذر کیے' انھیں دیگ میں سے محض وہ چند دانے جانیے جن کا انتخاب میں نے پاکستان ٹیلی ویژن میں اپنے ایک سینئر رفیق کار' دوست اور بھائی عبدالخالق سرگانہ کی کتاب "پی ٹی وی میں ماہ و سال سے کیا۔" سرگانہ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے صحافت اور سیاسیات کرنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں بطور ٹرینی نیوز پروڈیوسر کیریئر کا آغاز کیا اور ۲۰۰۹ء میں ڈائریکٹر پی ٹی وی نیوز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت سرگانہ صاحب نے پی ٹی وی کی ہر گھاٹ کا پانی پیا۔ پی ٹی وی کے پانچوں بڑے مراکز اور اہم نیوز بیوروز میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دیں۔ صدر مملکت' وزیراعظم اور دیگر اہم شخصیات کے غیر ملکی دوروں کے دوران کوریج کی۔ ذاتی حیثیت سے بھی کئی ملکوں میں سیاحت کی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھیں دنیا بھر کو دیکھنے کا تجربہ ہوا۔

پاکستان ٹیلی ویژن اگرچہ ایک علمی' ادبی' فکری ادارہ ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ادارے کے وابستگان میں لکھنے پڑھنے والے افراد کی تعداد یا مقدار آٹے میں نمک سے بھی کم رہی ہے۔ اب تو خیر سے اس ادارے سے علم و ادب کا جنازہ ہی اٹھ چکا۔ بہرطور خالق سرگانہ اُن معدودے چند افراد میں سے ہیں جنھوں نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائی ہمیشہ جی جان سے کی اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے اور اپنی کتاب دوستی پر مصروفیات کی گرد نہیں پڑنے دی۔ جب وہ پی ٹی وی سے تقریباً ۳۳ برس کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے ہیں تو اس عرصہ پر محیط اپنی یادداشتیں رقم کر کے انھیں دستاویز کی صورت محفوظ کر دیا۔ وہ قارئین کے لیے دلچسپی کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا اور چشم کشا بھی ہیں۔

سابق وزیر اطلاعات جاوید جبار کے انٹرویو میں مذکور ہے کہ ۱۹۸۸ء میں اطلاعات کے وزیر مملکت کی حیثیت سے چارج سنبھالنے کے صرف ۷۲ گھنٹوں میں انھوں نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو اس بات پر قائل کر لیا کہ سرکاری میڈیا پر اپوزیشن کی سرگرمیوں کی کوریج کی اجازت دی جائے۔ جاوید جبار نے بتایا کہ اس وقت پی ٹی وی' ریڈیو اور اے پی پی کے سربراہوں نے مجھ سے گائیڈ لائن کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کوئی گائیڈ لائن نہیں آپ اپنی عقل کے مطابق خبریں دیجیے۔ اس پر وہ حیران رہ گئے اور شاید انھیں یقین نہیں آیا۔ تاہم جاوید جبار نے تسلیم کیا کہ اس پالیسی پر انھیں اپنے ساتھی وزرا اور وزیراعظم کی ناپسندیدگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ایک اور جگہ سرگانہ صاحب نے لکھا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے عہد میں چند ماہ کے لیے پی ٹی وی نیوز کو ایڈیٹوریل آزادی دی گئی تھی۔ یہ جرأت مندانہ مظاہرہ اس وقت کے وزیر اطلاعات جاوید جبار نے کیا تھا لیکن انھیں اس کی قیمت

علم کے موتی

ہمارے پیارے نبی ﷺ پر جب جبرائیلؑ پہلی دفعہ غارِ حرا میں اللہ کا پیغام اِقراء کے الفاظ کی صورت لے کر آئے۔ پھر پیارے رسول ﷺ نے فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ آپ ﷺ نے علم کو مومن کی گم شدہ میراث قرار دیا۔ مسلمانوں کو علم کی سب سے بڑی کتاب قرآن مجید کا تحفہ دیا جس میں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کا علم ہے۔ کتاب اور علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مشہور فلسفی ابن عربی کہتے ہیں "کتاب پھلوں کا ایسا باغ ہے کہ آپ اس میں ہر طرح کا پھل کھا سکتے ہیں۔" "جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔ کتابوں کے بغیر درسگاہ ایسے ہی ہے جیسی طالب علموں کے بغیر اور ایک شہر کتب خانے کے بغیر ویران ہے۔ سقراط کہتا ہے "جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ زندہ مردوں کا قبرستان ہے۔"

افسوس کہ آج کا معاشرہ کتابوں سے کوسوں دور ہے اور یہ فاصلہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید کے دور میں وزرا و امرا کی حیثیت کا اندازہ اُن کے ذخیرہ کتب سے لگایا جاتا تھا۔ جس کے پاس جتنا بڑا ذخیرہ کتب ہوتا اُس کو زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ جبکہ ملک عزیز کے سابق صدر پرویز مشرف نے ایک غیر ملکی دورے کے دوران ایک پاکستانی سفارت کار کے پاس وافر مقدار میں کتابیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور تعجب سے پوچھا "آپ اتنی زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں؟" یعنی وہ کتب بینی کو وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔

(مرسلہ: احسان اللہ گھرتل)

پڑا۔ ہوا یوں کہ وزرا اور پارٹی قیادت نے اتنا دباؤ ڈالا کہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اپنا وزن اُنھی کے پلڑے میں ڈال دیا اور جاوید جبار کو سائنس اور ٹیکنالوجی کا وزیر مملکت بنا دیا گیا۔

کسی زمانے میں صرف ایک ہی سرکاری ٹی وی چینل پی ٹی وی خبروں کے لیے میسر تھا۔ اب مقابلے کی فضا ہے۔ درجنوں نیوز چینل ملک میں موجود ہیں' مگر سرکاری پالیسی کے تحت اب بھی ماضی ہی کی طرح پی ٹی وی کے خبرنامے کا آغاز وزیراعظم اور صدر کی خبروں سے ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ پی ٹی وی کے خبرنامہ کو صدر نامہ یا وزیراعظم نامہ بھی کہتے رہے ہیں۔

کتاب میں عہد ضیاء الحق کا ایک واقعہ مرقوم ہے۔ ایک مرتبہ ایوان صدر سے کہہ دیا گیا کہ صدر مملکت کی ہر سرگرمی کی فلم خبروں میں شامل کرنا ضروری نہیں۔ صدر نے انہی دنوں لاہور میں شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے مزار پر حاضری دی تو اس کی فلم خبرنامہ میں ٹیلی کاسٹ نہ ہوئی چنانچہ متعلقہ حکام کی جواب طلبی کی گئی۔ اس پر وزارت کے اعلیٰ حکام کو وہ ہدایت یاد دلائی گئی کہ صدر مملکت کی ہر سرگرمی کی خبر دکھانا ضروری نہیں۔ اس جواب پر سیکرٹری اطلاعات و نشریات چیئرمین پی ٹی وی نے دلچسپ موقف اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ خبر نہ دینے سے صدر نہیں بلکہ علامہ اقبالؒ کی توہین ہوئی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متاثر اسرائیلی حکمران

ایک یہودی عورت نے تو سیرت نبویؐ سے راستہ پا لیا
مگر مسلمانانِ عالم راہِ حق تلاش نہ کر سکے

جاوید چودھری

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے، عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑنے کو تھی۔ ایسے میں ایک امریکی سینیٹر اہم کام کے سلسلے میں اسرائیل آیا۔ وہ اسلحہ کمیٹی کا سربراہ تھا۔ اسے فوراً اسرائیل کی وزیراعظم، گولڈہ مائیر کے پاس لے جایا گیا۔ گولڈہ مائیر نے ایک گھریلو عورت کی مانند سینیٹر کا استقبال کیا اور اسے اپنے باورچی خانے میں لے گئی۔ یہاں اس نے امریکی سینیٹر کو چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کے پاس کرسی پر بٹھا چولہے پہ چائے کا پانی رکھ دیا اور خود بھی وہیں آ بیٹھی۔

ساتھ اس نے طیاروں، میزائلوں اور توپوں کا سودا شروع کر دیا۔ ابھی بھاؤ تاؤ جاری تھا کہ اسے چائے پکنے کی خوشبو آئی۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور چائے دو پیالیوں میں انڈیلی۔ ایک پیالی سینیٹر کے سامنے رکھ دی اور دوسری گیٹ پر کھڑے امریکی گارڈ کو تھما دی۔ پھر دوبارہ میز پر آ بیٹھی اور امریکی سینیٹر سے محو کلام ہو گئی۔ چند لمحوں کی گفت و شنید اور بھاؤ تاؤ کے بعد شرائط طے پا گئیں۔

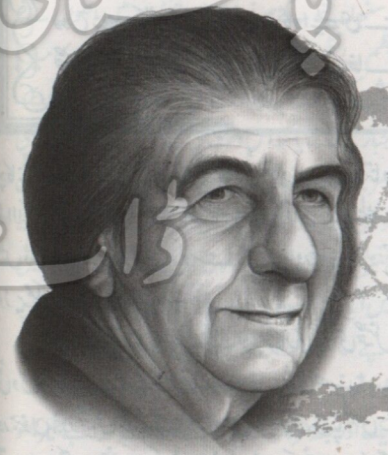

اس دوران گولڈہ مائیر اٹھی، پیالیاں سمیٹیں، انہیں دھو کر واپس سینیٹر کی طرف پلٹی اور بولی ”مجھے یہ سودا منظور ہے۔ آپ تحریری معاہدے کے لیے اپنا سیکرٹری میرے سیکرٹری کے پاس بھجوا دیجیے۔“ یاد رہے کہ اسرائیل اس وقت اقتصادی بحران کا شکار تھا، مگر گولڈہ مائیر نے بڑی ”سادگی“ سے اسرائیل کی تاریخ میں اسلحے کی خریداری کا اتنا بڑا سودا کر ڈالا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود اسرائیلی کابینہ نے اس بھاری سودے کو رد کر دیا۔ اس کا موقف تھا، اس خریداری کے بعد اسرائیلی قوم کو برسوں تک دن میں ایک وقت کھانے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ اسرائیلی حکمران نے ارکان کابینہ کا موقف سنا اور کہا: ”آپ کا خدشہ درست ہے، لیکن اگر ہم یہ جنگ جیت گئے اور ہم نے عربوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا تو تاریخ ہمیں فاتح قرار دے گی اور جب تاریخ کسی قوم کو فاتح قرار دیتی ہے، تو وہ بھول جاتی ہے کہ جنگ کے دوران فاتح قوم نے کتنے انڈے کھائے تھے اور روزانہ کتنی بار کھانا کھایا تھا۔ اس کے دستر خوان پر شہد، مکھن، جیم تھا یا نہیں اور ان کے جوتوں میں کتنے سوراخ تھے یا ان کی تلواروں کے نیام پھٹے پرانے تھے۔ فاتح صرف فاتح ہوتا ہے۔“

”وزیراعظم کی دلیل میں وزن تھا، لہٰذا اسرائیلی کابینہ کو اس سودے کی منظوری دینا پڑی۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ گولڈہ مائیر کا اقدام درست تھا اور پھر دنیا نے دیکھا، اسی اسلحے اور جہازوں سے یہود نے عربوں سے جنگ جیت لی۔

جنگ کے طویل عرصے بعد امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے نے گولڈہ مائیر کا انٹرویو لیا اور سوال کیا: ”امریکی اسلحہ خریدنے کے لیے آپ کے ذہن میں جو دلیل تھی، وہ فوراً آپ کے ذہن میں آئی تھی، یا پہلے سے حکمت عملی تیار کر رکھی تھی؟

گولڈہ مائیر نے جو جواب دیا وہ چونکا دینے والا تھا۔ وہ بولی: میں نے یہ استدلال اپنے دشمنوں (مسلمانوں) کے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیا تھا۔ میں جب طالبہ تھی تو مذاہب کا موازنہ میرا پسندیدہ موضوع تھا۔ انہی دنوں میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات پڑھی۔ اس کتاب میں مصنف نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو ان کے گھر میں اتنی رقم نہیں تھی کہ چراغ جلانے کے لیے تیل خریدا جا سکے، لہٰذا ان کی اہلیہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) نے ان کی زرہ بکتر رہن رکھ کر تیل لیا، لیکن اس وقت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کی دیواروں پر نو تلواریں لٹک رہی تھیں۔

”میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو میں نے سوچا کہ دنیا میں کتنے لوگ ہوں گے جو مسلمانوں کی پہلی ریاست کی کمزور اقتصادی حالت کے بارے میں جانتے ہوں گے؟ لیکن مسلمان آدھی دنیا کے فاتح ہیں، یہ بات پوری دنیا جانتی ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اگر مجھے اور میری قوم کو برسوں بھوکا رہنا پڑے، پختہ مکانوں کی بجائے خیموں میں زندگی بسر کرنا پڑے، تو بھی اسلحہ خریدیں گے، خود کو مضبوط ثابت کریں گے اور فاتح کا اعزاز پائیں گے۔

اسرائیلی حکمران نے اس حقیقت سے تو پردہ اٹھایا، مگر ساتھ ہی انٹرویو نگار سے درخواست کی کہ اسے ”آف دی ریکارڈ“ رکھا جائے اور شائع نہ کیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے نبیؐ کا نام لینے سے جہاں اس کی قوم اس کے خلاف ہو سکتی ہے، وہاں دنیا میں مسلمانوں کے موقف کو تقویت ملے گی۔ چنانچہ واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے نے انٹرویو چھاپتے وقت یہ واقعہ حذف کر دیا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا، یہاں تک کہ گولڈہ مائیر چل بسی اور وہ انٹرویو نگار بھی عملی صحافت سے الگ ہو گیا۔

اس دوران ایک اور نامہ نگار امریکا کے بیس بڑے نامہ نگاروں کے انٹرویو لینے میں مصروف تھا۔ اس سلسلے میں وہ اسی نامہ نگار کا انٹرویو لینے گیا جس نے واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے کی حیثیت سے گولڈہ مائیر کا انٹرویو لیا تھا۔ اسی انٹرویو میں اس نے گولڈہ مائیر کا واقعہ بیان کر دیا، جو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھا۔ اس نے کہا کہ اب یہ واقعہ بیان کرنے میں اسے کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔

گولڈہ مائیر کا انٹرویو کرنے والے نے مزید کہا: میں نے اس واقعے کے بعد جب تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا، تو میں عرب بدوؤں کی جنگی حکمت عملیاں دیکھ کر حیران رہ گیا، کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ طارق بن زیاد جس نے جبرالٹر (جبل الطارق) کے راستے اسپین فتح کیا تھا، اس کی فوج کے آدھے سے زیادہ مجاہدوں کے پاس پورا لباس نہیں تھا۔ وہ بہتر بہتر گھنٹے ایک چھاگل پانی اور سوکھی روٹی کے چند ٹکڑوں پر گزارا کرتے تھے۔“ یہ وہ موقع تھا، جب گولڈہ مائیر کا انٹرویو نگار قائل ہو گیا تاریخ فتوحات گنتی ہے، دستر خوان پر پڑے انڈے، جیم اور مکھن نہیں۔

گولڈہ مائیر کے انٹرویو نگار کا اپنا انٹرویو جب کتابی شکل

میں شائع ہوا تو دنیا اس ساری داستان سے آگاہ ہوئی۔ یہ حیرت انگیز واقعہ تاریخ کے دریچوں سے جھانک جھانک کر مسلمانانِ عالم کو جھنجھوڑ رہا ہے، بیداری کا درس دے رہا ہے، ہمیں سمجھا رہا ہے کہ ادھڑی عباؤں اور پھٹے جوتوں والے گلہ بان چودہ سو برس قبل کس طرح جہاں بان بن گئے؟ ان کی ننگی تلوار نے کس طرح چار براعظم فتح کر لیے؟ اگر پُرشکوہ محلات، عالی شان باغات، زرق برق لباس، ریشم و کمخواب سے آراستہ و پیراستہ آرام گاہیں، سونے، چاندی، ہیرے اور جواہرات سے بھری تجوریاں، خوش ذائقہ کھانوں کے انبار اور کھنکھناتے سکوں کی جھنکار ہمیں بچا سکتی تو تاتاریوں کی ٹڈی دل افواج بغداد کو روندتی ہوئی معتصم باللہ کے محل تک نہ پہنچتی۔

آہ! وہ تاریخِ اسلام کا کتنا عبرت ناک منظر تھا جب معتصم باللہ آہنی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کے سامنے کھڑا تھا۔ کھانے کا وقت آیا تو ہلاکو خان نے خود سادہ برتن میں کھانا کھایا اور خلیفہ کے سامنے سونے کی طشتریوں میں ہیرے اور جواہرات رکھ دیے۔ پھر معتصم سے کہا: جو سونا چاندی تم جمع کرتے تھے اُسے کھاؤ!

بغداد کا تاج دار بے چارگی و بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا، بولا: ''میں سونا کیسے کھاؤں؟''

ہلاکو نے فوراً کہا ''پھر تم نے یہ سونا چاندی جمع کیوں کیا تھا؟'' وہ مسلمان جسے اُس کا دین ہتھیار بنانے اور گھوڑے پالنے کی ترغیب دیتا تھا، کچھ جواب نہ دے سکا۔ ہلاکو خان نے نظریں گھما کر محل کی جالیاں اور مضبوط دروازے دیکھے اور سوال کیا: ''تم نے اِن جالیوں کو پگھلا کر آہنی تیر کیوں نہ بنائے؟ تم نے یہ جواہرات جمع کرنے کی بجائے اپنے سپاہیوں کو رقم کیوں نہ دی، تاکہ وہ جانبازی اور دلیری سے میری افواج کا مقابلہ کرتے؟''

خلیفہ نے تاسف سے جواب دیا۔ ''اللہ کی یہی مرضی تھی۔'' ہلاکو نے کڑک دار لہجے میں کہا: ''پھر جو تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، وہ بھی خدا کی مرضی ہوگی۔'' پھر ہلاکو خان نے معتصم باللہ کو مخصوص لبادے میں لپیٹ کر گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند ڈالا اور بغداد کو قبرستان بنا دیا۔ ہلاکو نے کہا ''آج میں نے بغداد کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ اَب دنیا کی کوئی طاقت اسے پہلے والا بغداد نہیں بنا سکتی۔''

تاریخ تو فتوحات گنتی ہے محل، لباس، ہیرے، جواہرات لذیذ کھانے نہیں۔ اگر ہم ذرا سی بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا۔ اندازہ کرو جب یورپ کے چپے چپے پر تجربہ گاہیں اور تحقیقی مراکز قائم ہو رہے تھے، تب یہاں ایک شہنشاہ دولت کا سہارا لے کر اپنی محبت کی یاد میں تاج محل تعمیر کروا رہا تھا۔ جب مغرب میں علوم و فنون کے بم پھٹ رہے تھے، تب یہاں تان سین جیسے گویے نئے نئے راگ ایجاد کر رہے تھے۔ جب انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کے بحری بیڑے برصغیر کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے، ہمارے اَرباب اختیار شراب و کباب اور چنگ و رباب سے مدہوش پڑے تھے۔

تن آسانی، عیش کوشی اور عیش پسندی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ہمارا بوسیدہ اور دیمک زدہ نظام بکھر گیا، کیونکہ تاریخ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ حکمرانوں کی تجوریاں بھری ہیں یا خالی؟ شہنشاہوں کے تاج میں ہیرے جڑے ہیں یا نہیں؟ درباروں میں خوشامدیوں، مراثیوں، طبلہ نوازوں اور وظیفہ خوار شاعروں کا جھرمٹ ہے یا نہیں؟ یاد رکھیے! تاریخ کو صرف کامیابیوں سے غرض ہوتی ہے اور وہ عُذر قبول نہیں کرتی۔

افسوس صد افسوس! سیرت نبوی ﷺ سے ایک یہودی عورت نے تو سبق حاصل کر لیا مگر مسلمان اُس سے نا آشنا رہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی، علوم و فنون پر دسترس رکھنے کے بجائے لاحاصل بحثوں اور غیر ضروری کام میں مگن رہے۔ چنانچہ زوال ہمارا مقدر ٹھہر گیا۔ تاریخ بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ ◆◆◆

وزیرِ اعظم

قاضی شارق محمود

آمنہ نے رات کا کھانا تینوں بچوں کے ساتھ مل کر کھایا۔ کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد تینوں بچے حسبِ معمول گہری نیند سو گئے تو ثمینہ پڑوس کی جھگی میں پہنچی اور پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھی نانی حمیدن سے بولی ''نانی میں تھوڑی دیر کے لیے باہر تخت پر بیٹھنے جا رہی ہوں۔ میرے تینوں بچے سو گئے ہیں۔ تم ذرا ان کا خیال کرنا۔''

نانی حمیدن نے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی پھر طویل ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی ''ٹھیک ہے تو باہر تخت پر بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کھا میں بچوں کا خیال رکھوں گی۔ تو تو بالکل پسینا پسینا ہو رہی ہے۔ تجھے گرمی کچھ زیادہ ہی لگتی ہے۔ اس وقت تجھے تازہ ہوا کی واقعی بہت ضرورت ہے۔''

''ہاں نانی بس کیا کروں، سارا سارا دن اس چھوٹی سی جھگی میں بیٹھ کر لفافے بناتی رہتی ہوں۔ بری طرح تھک جاتی ہوں۔ بس یہی تھوڑا سا وقت فرصت کا ملتا ہے تو باہر تخت پر جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ وہاں سعیدہ آپا اور حاجرہ خالہ بھی میرے پاس آ بیٹھی ہیں تو ان کے ساتھ گپ شپ میں کچھ دل بہل جاتا ہے۔ وہ دونوں بے چاریاں بھی میری طرح اپنے نکھٹو شوہروں کی ستائی ہوئی ہیں۔ محنت مشقت کر کے بڑی مشکلوں سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہیں۔''

''ارے ہاں واقعی وہ بے چاریاں بھی کچھ تیرے ہی جیسی قسمت لے کر دنیا میں اُتری ہیں۔ اللہ تمھارے آدمیوں کو عقل دے۔ اپنے نشے کی لت چھوڑ کر تمھارا اور بچوں کا کچھ خیال کریں۔ نشے کی لعنت نے تو ان مردوں کی

یا اللہ! ہمارے ملک کی باگ ڈور ایسے حکمران کے حوالے کر دے جو انصاف پسند اور ایثار کا دھنی ہو

مت مار کر رکھ دی ہے۔"

"ہاں نانی بس دعا کرو۔ اب دعا کے علاوہ اور کچھ کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔" یہ کہہ کر آمنہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی جھگیوں سے باہر سڑک کنارے پڑے ٹوٹے پھوٹے تخت پر آبیٹھی۔

اُسے یہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ حسب توقع سعیدہ آپا اور خالہ حاجرہ بھی اُس کے پاس آبیٹھیں۔

حاجرہ خالہ آتے ہی بولیں "اری آمنہ میں نے سنا ہے وہ اپنا وزیر اعظم تھا نا...... کیا نام...... ہاں یاد آیا' نواز شریف اُسے نکال دیا گیا ہے۔"

"ارے خالہ تم اب سُن رہی ہو۔ اس بات کو تو کافی دن گزر چکے۔"

"اچھا...... بھئی مجھے تو آج پتا چلا ہے۔ اچھا تو اب کون وزیر اعظم ہے؟"

"ہے ایک...... نام تو مجھے یاد نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہے یہ بھی نواز شریف کی پارٹی والا۔"

"اچھا اُسی کی پارٹی کا ہے تو پھر نکالنے کا کیا فائدہ ہوا؟ ویسے میں نے سنا ہے عمران خان بھی وزیر اعظم بننے والا ہے۔"

"ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔ ویسے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب اپنی بے نظیر کا بیٹا بلال......"

"ارے بلال نہیں بلاول۔"

"بلاول وہ وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھے گا۔"

"ارے خالہ چھوڑو بھی' ہم کیا فضول باتیں لے بیٹھے۔ ان میں سے کوئی وزیر اعظم بنے نہ بنے' ہمیں کیا' یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ غضب اللہ کا اتنے اتنے بڑے محلوں اور زمینوں کے مالک ہیں کہ ہمیں تو سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے جبکہ جانا انھوں نے بھی دو گز کی قبر میں ہی ہے"۔

"ہاں یہ تو ہے...... لیکن ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا وزیر اعظم آجائے جو ہم غریبوں کا بھی کچھ بھلا کر سکے۔" خالہ بولی۔

"ہاں واقعی دعا تو یقیناً ضرور کرنی چاہیے۔ اچھا خالہ تمھیں کچھ یاد بھی ہے۔ کل عید کا دن ہے' بکرا عید کا دن۔"

"ارے ہاں واقعی ہمیں تو کل کے دن کے بارے میں باتیں کرنی چاہییں۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں' کیسی باتیں لے بیٹھی۔ ہاں کل بکرا عید کا دن ہے' گوشت کا دن۔ آمنہ اللہ تجھے خوش رکھے۔ پچھلے سال تو نے واقعی بڑی اچھی تجویز دی تھی کہ ہمیں قربانی والے گھروں میں جا کر قربانی کا گوشت مانگنا چاہیے۔ ان جھگیوں میں تو کوئی ہمیں گوشت لا کر دینے سے رہا۔ ہر شریف آدمی جھگیوں کی طرف آنے سے گھبراتا اور شرماتا بھی ہے۔ گھروں میں قربانی کا گوشت مانگنے جائیں گے تو گوشت مل ہی جائے گا۔ اس طرح ہمارے بچے بھی قربانی کا بابرکت گوشت کچھ دن کھالیں گے۔"

"ہاں خالہ تم صحیح کہتی ہو۔ پچھلے سال گوشت کھا کر میرے بچوں کی کچھ جان بن گئی تھی۔ اسی لیے آج میرے بچے سارا دن مجھے یاد دلاتے رہے ہیں کہ اماں کل بکرا عید کا دن ہے۔ کل ڈھیر سارا گوشت لے کر آنا۔"

"ہاں بھئی بچوں نے تو یاد دلانا ہی ہے۔ وہ بے چارے بھی کیا کریں۔ دال' روٹی اور چائے روٹی کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں اور ہم لوگوں کی دال اور چائے بھی کیا خاک دال اور چائے ہوتی ہے۔ دال کے نام پر نمک مرچ کا لمبا پانی اور دو چمچ دودھ اور چٹکی بھر پتی سے بنی ہوئی بدمزہ اور بد ذائقہ چائے! بے چاروں کو گوشت تو یاد آنا ہی ہے۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے بکرا عید آ گئی اب کل مل کر نکلیں گے اور خوب ڈھیر سارا گوشت جمع کر کے لائیں گے۔"

"ہاں ہاں خالہ بالکل ٹھیک ہے۔" آمنہ لہک کر بولی "اور ہاں خالہ پچھلے سال ہم چار مل کر نکلے تھے نا۔ اس سال بھی ہماری تعداد چار ہی ہوگی۔"

"وہ کیسے...... یہ چوتھی کون؟"

"ارے خالہ یہ اپنی زرینہ جس نے دو ماہ قبل ہی یہاں ...سویں جھگی ڈالی ہے۔"

"اچھا اچھا وہ زرینہ جس کے میاں کا نام صفدر ہے۔ بے چارہ بہت کمزور اور لاغر ہو رہا ہے۔ اکبر علی کی بیوی بتا رہی تھی کہ اسے اکبر علی یہاں لے کر آیا ہے۔ یہ پہلے اکبر علی کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ بے چارہ بیمار پڑ گیا۔ بیماری کی وجہ سے چھٹیاں کرنی پڑیں تو فیکٹری والوں نے نکال دیا۔ اچھا ایک کمرے کا مکان لے کر کرایے پر رہ رہا تھا۔ ملازمت ختم ہوئی تو مکان کا کرایہ دینے کو پیسا کہاں سے آتا؟ لہٰذا اور اکبر علی اُسے یہاں لے آیا۔ اب اس کی بیوی بالٹی بھر کے لے اُبال کر اسے دے دیتی ہے۔ یہ مٹکے والی پلیا پر بیٹھ کر ...یں بیچ آتا ہے۔"

"ہاں خالہ بالکل ایسا ہی ہے۔ زرینہ بتا رہی تھی کہ اس کا میاں جب ملازم تھا تو اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ہر اچھی سے اچھی چیز اُسے لا کر کھلاتا۔ اب اس پر مصیبت کے دن ہیں تو اس کا بھی دل چاہتا ہے کہ اسے اچھی سے اچھی خوراک پکا کر کھلاؤں لیکن اچھی خوراک آئے کہاں سے' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس پر میں نے کہا کہ عید کے دن ہم گھروں میں جا کر قربانی کا گوشت جمع کرتے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلنا۔ پہلے تو وہ نہیں مانی۔ بڑی خوددار طبیعت کی مالک ہے لیکن جب میں نے اُسے سمجھایا کہ قربانی کا گوشت بڑی رحمت والا اور برکت والا ہوتا ہے۔ تیرے میاں کے بدن میں اسے کھا کر بہت جلد طاقت آجائے گی۔ صحت مند ہو کر وہ پھر کسی کمپنی میں ملازمت کر لے گا اور تیرا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھے گا تو وہ تیار ہو گئی۔ کیوں سعیدہ تیرا کیا خیال ہے۔ ایک دن جب زرینہ میری جھگی میں آئی بیٹھی تھی تو تیری بھی تو اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ تجھے وہ لڑکی کیسی لگی۔"

"ہاں اچھی ہے۔ ابھی صرف انیس بیس سال کی ہے لیکن باتیں سمجھداری کی کرتی ہے۔ میں نے اس کے میاں کو بھی دیکھا ہے بے چارہ سوکھ کر چھڑا ہو رہا ہے۔ اسے واقعی اچھی خوراک کی بے حد ضرورت ہے۔ چلو اچھا ہے وہ ہمارے ساتھ ہوگی تو ہماری تعداد پچھلے سال کی طرح چار ہو جائے گی۔ کہتے ہیں کہ چار کا ہندسہ اچھا ہوتا ہے۔"

"ارے ہندسے سبھی اچھے ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی نیت اچھی ہونی چاہیے۔ اچھا خیر اب کل کا پروگرام طے کر لو۔ میرا خیال ہے ہمیں سب سے پہلے گلشن حالی کی طرف جانا چاہیے۔ وہاں اس مرتبہ تقریباً ہر گھر میں قربانی ہونی ہے۔ پھر پھول چوک کے پیچھے کوٹھیوں والے حصے میں چلیں گے۔ اس کے بعد فلیٹوں کے علاقے میں جائیں گے۔ پھر واپسی پر پیلی حویلیوں سے ہوتے ہوئے گھر واپس آجائیں گے۔ کیوں؟ کیسا؟"

"بالکل ٹھیک۔ میں نے بھی کچھ ایسا ہی سوچا تھا۔" سعیدہ نے آمنہ کی تائید کی۔ پروگرام طے ہو جانے کے بعد تینوں عورتیں وہاں سے اُٹھ کر اپنی اپنی جھگیوں میں چلی گئیں۔

☆☆

زرینہ نے سوا بارہ بجے اپنا برقع اٹھا کر پہنا اور چہرے پر خوب اچھی طرح نقاب لگائی۔ اب صرف اس کی آنکھیں اور ماتھے کا کچھ حصہ کھلا رہ گیا۔ باقی سارے کا سارا جسم برقعے میں پوشیدہ تھا۔ زرینہ نے چھوٹا سا شیشہ اٹھا کر اپنے سراپے کا بھرپور جائزہ لیا۔ اچھی طرح مطمئن ہو کر بڑا سا کپڑے کا تھیلا اٹھایا۔ پھر اپنے قدم آمنہ باجی کی جھگی کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے آمنہ باجی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ساڑھے بارہ بجے تک اُن کے پاس پہنچ جائے گی۔ زرینہ نے ابھی صرف تین چار قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ سامنے سے آمنہ باجی' سعیدہ آپا اور حاجرہ خالہ آتی دکھائی دیں۔

ان تینوں نے بھی برقعے اوڑھ رکھے تھے لیکن یہ برقعے اس کے برقعے کی طرح صاف ستھرے اور چمکیلے نہیں خاصے

خستہ حال تھے۔ کالا رنگ جگہ جگہ سے مٹیالہ سا ہو رہا تھا۔ تینوں عورتوں نے زرینہ کے نزدیک آ کر اُسے گلے سے لگایا اور عید کی مبارک باد دی۔ پھر کل کے طے شدہ پروگرام کے مطابق قدم گلشن حالی کی طرف بڑھا دیے۔ گلشن حالی میں اس سال قربانی کافی زیادہ ہوئی تھی لیکن اردگرد کے علاقوں میں رہنے والے غریب غربا میں بھی بہت اضافہ ہوا تھا۔

گوشت مانگنے والوں کی تعداد بے تحاشا تھی لہٰذا انھیں یہاں سے گوشت تو کافی ملا لیکن اتنا نہیں جتنا تینوں عورتوں کو توقع تھی۔ وہ تینوں کافی غم زدہ سی ہو کر کوٹھیوں والے علاقے کی طرف بڑھیں۔ آمنہ اور زرینہ سعیدہ آپا اور حاجرہ خالہ سے کافی آگے تھیں۔

حاجرہ خالہ نے ایک بہت گہری نظر ان دونوں پر ڈالی پھر سعیدہ سے بولیں "اری سعیدہ ذرا دیکھ تو ہمیں تو گلشن حالی سے پچھلے سال کے مقابلے میں بہت کم گوشت ملا۔ ہمارے تھیلوں کا تو ایک کونہ بھی نہیں بھر سکا لیکن ذرا اس زرینہ کے تھیلے کو دیکھ ابھی سے تقریباً آدھا بھر چکا اور اس کا تھیلا اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے تھیلوں سے تین گنا نہیں تو کم از کم دو گنا بڑا ضرور ہے۔"

"ہاں خالہ میں بھی ابھی یہی سوچ رہی تھی۔ ویسے مجھے تو دو چار گھروں میں جانے کے بعد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہماری نسبت اس کو گوشت کافی زیادہ ملے گا۔ کم بخت بلا کی پھرتیلی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی تھیں کہ ابھی ہم لوگ ایک مکان سے ہی فارغ ہوتے تھے کہ یہ دس گھروں کا چکر لگا آتی۔"

"میں تو اور بھی بہت کچھ دیکھ رہی تھی۔ لاکھ پردے میں ہو مگر ہے تو ہمارے مقابلے میں جوان اور پھرتیلی۔ ہم بڈھیوں کا اُس سے کیا مقابلہ۔ جب تک ہم دروازے تک پہنچتی ہیں یہ اگلے گھر پہنچ جاتی ہے۔

قسمت کی دھنی نکلی یہ تو۔ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے اور اپنا نصیب بھی کھوٹا کیا۔"

"اچھا بس اب ان باتوں کو چھوڑو۔ ذرا تیز تیز قدم اٹھاؤ۔ ہمیں بھی ذرا پھرتی دکھانی ہوگی ورنہ کوٹھیوں والے علاقے میں بھی ہمارے حصے میں گوشت کم آئے گا۔ ہم دو کوٹھیوں میں پھریں گے تو یہ دس کوٹھیوں کا چکر لگائے گی۔" اس گفتگو کے بعد دونوں عورتوں کے قدموں کی رفتار کافی تیز ہو گئی۔

کوٹھیوں والے علاقے میں پورے دو گھنٹے لگے۔ آخری کوٹھی سے گوشت لے ہی رہی تھیں کہ اچانک زرینہ کی نگاہ کوٹھی کے بڑے سے دروازے کے ساتھ بنے چبوترے پر پڑی چادر پر پڑی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب سے کچھ دیر پہلے اس پر گوشت رکھا گیا ہو۔ زرینہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ادھیڑ عمر شخص سے بولی "انکل جی! اگر یہ آپ کے کام کی نہ ہو تو میں لے لوں؟"

"ہاں ہاں لے لو لے لو۔" ادھیڑ عمر شخص نے جلدی سے اپنا سر ہلایا پھر اُسے خود ہی تہ کر کے زرینہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہاں سے نکل کر چاروں عورتیں فلیٹوں والے علاقے کی طرف بڑھیں۔ اب سعیدہ سب سے آگے تھی۔ وہ فلیٹوں والے علاقے میں سب سے پہلے پہنچنا چاہتی تھی۔ سبب یہ تھا کہ اس کا تھیلا ابھی گوشت سے آدھا بھی نہیں بھرا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی، افسردگی اور غصے کی لہریں بالکل صاف نظر آ رہی تھیں۔ خالہ حاجرہ کے چہرے کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس سے باری کا تھیلا تو ابھی گوشت سے چوتھائی بھی نہ بھر سکا تھا۔ اس کا دل جل کر خاک ہوا جا رہا تھا اور قدم بڑی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اب سب سے پیچھے تھی۔

آگے جاتی ہوئی آمنہ نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ پھر اپنے قدم روک کر بولی "کیا بات ہے خالہ حاجرہ، کیا بہت زیادہ تھک گئی ہو۔"

"ہاں تھکنا تو ہے..... جب دل جل کر خاک ہوا جا رہا ہو تو تھکن تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"کیوں؟ کیوں خالہ تمھارا دل جل کر کیوں خاک ہو رہا

ہے۔ ایسی کیا بات ہوئی؟"

"اری اب تو اتنی بھولی بھی مت بن۔ دیکھ نہیں رہی اپنی اس نئی سہیلی کا ندیدہ پن۔ گوشت تو گوشت یہ تو لوگوں سے چادر تک مانگ بیٹھی۔ اس کمینی کی وجہ سے اس سال ہم لوگوں کو گوشت کم مل رہا ہے۔ تو دیکھ نہیں رہی لوگ ہمارے تھیلوں میں دو بوٹیاں ڈالتے ہیں اور اس کے تھیلے کو دو کلو گوشت سے بھر دیتے ہیں۔ ذرا اس کا یہ کنویں جیسا تھیلا تو دیکھ کیا ٹھنسا ہوا ہے۔ پھر بھی کم بخت کی ہوس کم نہیں ہو رہی۔ مزید گوشت اس ٹیں ٹھونسے چلی جا رہی ہے۔ جب تک اس کا تھیلا پھٹے گا نہیں اس کم بخت کو چین تو نہیں آئے گا۔"

"ارے خالہ چھوڑو اپنی اپنی قسمت، اپنا اپنا نصیب ہے تم کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلا رہی ہو۔"

"ارے کہاں کی قسمت، کہاں کا نصیب۔ تو اب میرا اور دل نہ جلا۔ یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ نہ تو اسے اپنے ساتھ لاتی نہ ہمارے حصے کا گوشت اس کے تھیلے میں جاتا۔ غضب اللہ کا ہمارے چھوٹے چھوٹے تھیلے گوشت سے آدھے بھی نہ بھریں اور اس کا دو من کا تھیلا منہ تک بھر جائے۔ میں تو اب سمجھی اس کا شوہر اتنا کمزور اور لاغر کیوں ہے۔ یہ ہوس کی ماری اسے کھانے کو خاک دیتی ہوگی۔ خود ہی سب کا سب ہڑپ کر جاتی ہوگی۔ تب ہی تو کم بخت اتنی ہٹی کٹی ہے۔"

"ارے خالہ اب بس بھی کرو۔ ہم دونوں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ وہ دیکھو سعیدہ آپا اور زرینہ ہم سے کتنا آگے ہیں۔ چلو ہمت کر کے تیز تیز قدم اٹھاؤ۔ مایوس مت ہو۔ دیکھنا فلیٹوں والے علاقے میں ہمارے تھیلے بھی گوشت سے بھر جائیں گے۔"

آمنہ کے کہنے پر حاجرہ خالہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ پھر قدموں کی رفتار تیز کر ہی دی۔ فلیٹوں والے علاقے میں انھیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو آمنہ اور سعیدہ کے تھیلے آدھے سے کچھ زیادہ جبکہ حاجرہ خالہ کا تھیلا آدھے سے کچھ کم تھا جبکہ زرینہ کا تھیلا گوشت سے پوری طرح بھر چکا تھا۔

حویلیوں سے ذرا دور ہی تھیں کہ حاجرہ خالہ نے اپنے قدموں کی رفتار بہت کم کر دی۔ اشارے سے سعیدہ اور آمنہ کو اپنے پاس بلایا اور ان کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے بولیں "دیکھو ہم حویلیوں کی طرف ابھی نہیں جاتے بلکہ سیدھے گھر جائیں گے۔ اس ہوس کی ماری کو اس کے گھر چھوڑ کر پھر حویلیوں کی طرف جائیں گے ورنہ وہاں کا گوشت بھی اس کمبخت کے تھیلے میں جائے گا۔"

"ہاں خالہ تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ایسا ہی کریں گے۔" سعیدہ نے فوراً ہی حاجرہ خالہ کی بات تسلیم کر لی۔ آمنہ نے بھی سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ پھر تینوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

زرینہ کے قریب پہنچ کر حاجرہ خالہ اونچی آواز میں بولیں "بس بھئی اب کافی شام ہو گئی۔ سیدھے گھر جائیں گے۔"

"ہاں خالہ تم صحیح کہتی ہو۔" سعیدہ فوراً بولی۔ "اب سیدھے گھر ہی جائیں گے۔ ہانڈی روٹی بھی تو کرنی ہے۔"

زرینہ نے نظر گھما کر خالہ حاجرہ اور سعیدہ آپا کو دیکھا پھر آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہاں زلیخا خالہ اور سعیدہ آپا تم دونوں واقعی بہت تھک گئی ہو گی۔ تم لوگ ایسا کرنا آہستہ آہستہ قدموں سے گھر کی طرف چلتی جانا۔ میں اور آمنہ باجی فٹافٹ دونوں پہلی حویلیوں کا ایک چکر لگا آئیں گی۔ میں نے حویلیوں میں آٹھ دس بڑے بڑے جانور کھڑے دیکھے تھے۔ وہاں سے کافی گوشت ملنے کی توقع ہے۔ کیوں آمنہ باجی؟"

زرینہ کی بات سُن کر آمنہ نے ایک نظر اُس پر ڈالی۔ پھر دھیرے سے بولی "ٹھیک ہے۔ زرینہ ایسا ہی کر لیتے ہیں۔" پھر ایسا ہی ہوا۔ حویلیوں کا علاقہ آیا تو زرینہ اور آمنہ تیز تیز قدم اٹھاتیں حویلیوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اِدھر سعیدہ آپا اور حاجرہ خالہ اپنے سر پکڑ کر رہ گئیں۔ دونوں عورتوں کے دل و

دماغ میں زرینہ کے لیے نفرت کی تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ کم گوشت ملنے کی وجہ سے دل تو بجھے بجھے سے تھے ہی اب قدم بھی بالکل بجھ کر رہ گئے۔ ایک ایک قدم آگے بڑھانا محال ہو رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد سعیدہ آپا نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حاجرہ خالہ سے بولیں:

''ارے حاجرہ خالہ وہ دیکھو آمنہ اور زرینہ گوشت لے کر آ بھی گئیں۔ اُف ذرا دیکھو تو زرینہ کا تھیلا تو گوشت سے پہلے ہی بھر چکا تھا۔ اس میں گنجائش ہی کہاں تھی۔ اسی لیے حویلی والوں نے ایک بڑے سے شاپر میں گوشت ڈال کر اسے دے دیا۔ کم از کم پانچ کلو تو ہوگا۔''

حاجرہ خالہ نے قدم روک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر بڑے تلخ لہجے میں بولیں ''ارے باولی' یہ تجھے پانچ کلو نظر آ رہا ہے۔ یہ دس کلو سے کسی طرح کم نہیں اور ذرا یہ دیکھ اتنا وزن اٹھا کر بھی کتنا آرام سے چلی آ رہی ہے۔ پوری جنتی ہے جنتی۔''

''جنتی نہیں خالہ چڑیل ہے چڑیل۔ اس چڑیل کو ہم نے اپنے ساتھ شامل کر کے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری ہے۔''

حاجرہ خالہ نے مزید تبصرے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ زرینہ اور آمنہ بالکل نزدیک آ گئیں لہٰذا خالہ کو اپنا منہ بند کرنا پڑا۔ زرینہ آتے ہی بولی ''ارے حاجرہ خالہ اور سعیدہ آپا' حویلی والوں نے دل کھول کر گوشت دیا ہے۔ بڑے دل والے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ ہمارے یہاں کل بھی قربانی ہوگی۔ کل بھی گوشت آ کر لے جانا۔'' زرینہ کی بات سُن کر حاجرہ خالہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

سیکٹر گیارہ کا چھوٹا سا پارک آیا تو زرینہ بولی ''آؤ حاجرہ خالہ یہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔''

''نہیں بھئی۔'' حاجرہ خالہ نے بہت بُرا سا منہ بنایا۔ ''اب گھر جا کر ہی آرام کریں گے۔ اب گھر کا فاصلہ رہ ہی کتنا گیا ہے۔ بس پانچ منٹ ہی کی تو بات ہے۔''

''ہاں ہاں خالہ یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ گھر تو ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔ اب فکر کس بات کی۔ بس پانچ دس منٹ یہاں بیٹھ کر آرام کرتے اور حساب کتاب کر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر زرینہ نے اپنے قدم پارک کی طرف بڑھا دیے۔

حاجرہ خالہ نے سعیدہ اور آمنہ کی طرف دیکھا پھر اُلجھی ہوئی آواز میں بولیں ''یہ کس حساب کتاب کی بات کر رہی ہے۔''

''خالہ جانے کیا بک رہی تھی۔ بہرحال آؤ تھوڑی دیر آرام کر ہی لیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے سعیدہ نے بھی اپنے قدم پارک کی طرف بڑھا دیے۔

پارک کی گھاس پر بیٹھ کر زرینہ اپنے پاؤں پھیلاتے ہوئے بولی ''واہ آمنہ باجی کتنی پیاری ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ یہاں تو روز آنہ آ کر بیٹھنا چاہیے۔'' وہ پھر چادر گھاس پر بچھا کر بولی ''یہ میں نے اس لیے لی تھی کہ حساب کتاب کرنے میں آسانی رہے گی۔'' پھر اس نے اپنے تھیلے کا گوشت اس پر الٹ دیا۔ شاپر والا گوشت بھی اس میں شامل کیا۔ پھر باری باری حاجرہ خالہ' سعیدہ آپا اور آمنہ باجی کے تھیلوں کا گوشت بھی چادر پر اُلٹ دیا۔ اس کے بعد سارے گوشت کو چار برابر حصوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔

چار حصے برابر برابر تقسیم ہو گئے تو وہ حاجرہ خالہ سے بولی ''خالہ تم ہم سب سے بڑی ہو۔ پہلا حق تمہارا ہے۔ اپنی پسند والا حصہ اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لو۔'' زرینہ کی بات سُن کر حاجرہ خالہ کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امڈ آئے۔ انھوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ایک حصہ اٹھا کر اپنے تھیلے میں بھر لیا۔

''سعیدہ آپا اب دوسرا نمبر تمہارا ہے۔ تم اپنی پسند سے ایک حصہ اٹھا لو۔'' سعیدہ آپا نے بھی ایک حصہ اٹھا کر اپنے تھیلے میں بھر لیا۔ اس کے بعد آمنہ کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر بعد چاروں عورتیں پارک سے نکل کر اپنی جھگیوں کی طرف بڑھیں تو حاجرہ خالہ' سعیدہ آپا اور آمنہ باجی کے دل و دماغ کی بڑی عجیب

حالت تھی۔ آنکھوں میں خود بخود آنسو امنڈتے چلے آ رہے تھے۔ سارا راستہ بڑی خاموشی سے کٹا۔ جذبات کی شدت کی وجہ سے کسی کے منہ سے کوئی بات نکل ہی نہیں رہی تھی۔

رات کو حسبِ معمول حاجرہ خالہ' سعیدہ آپا اور آمنہ اپنی جھگیوں سے نکل کر سڑک کنارے لگے تخت پر آ کر بیٹھیں تب حاجرہ خالہ آنسو بھری آنکھوں سے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولیں ''بھئی اپنی اس زرینہ نے تو آج کمال ہی کر دیا۔ یہ اتنی انصاف پسند نکلے گی یہ تو کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ سچی بات ہے اتنا کھرا انصاف تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی دیکھا نہ سنا۔ اس لڑکی نے تو مجھے بالکل حیران ہی کر کے رکھ دیا۔''

''ہاں خالہ واقعی' یہ اتنی اچھی طبیعت کی نکلے گی اس کا تو ہمیں وہم و گمان تک نہ تھا۔ اس کے انصاف اور ایثار نے تو ہماری آنکھیں کھول کر رکھ دیں۔''

حاجرہ خالہ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور بڑی رقت آمیز آواز میں بولیں۔ ''یا اللہ تو زرینہ کو ہمارے ملک کا وزیر اعظم بنا دے اور اگر یہ وزیر اعظم نہیں بن سکتی تو ہمارے ملک کا وزیر اعظم کسی ایسے بندے کو بنا دے جو اس زرینہ جیسا انصاف پسند اور ایثار پسند طبیعت کا مالک ہو۔''

حاجرہ خالہ کی دعا کے جواب میں سعیدہ اور آمنہ نے اتنی زور سے آمین کہا کہ اس آمین کی گونج اکتالیس کی اکتالیس جھگیوں میں بڑی واضح طور پر سنی گئی۔ ◆◆◆

بات سے بات

بات یہ ہے کہ کوئی بات نئی بات نہیں..... نئی بات کیسے ہو.....؟ آسمان وہی، زمین وہی، پانی وہی، ہوا وہی، سورج چاند وہی، ستارے وہی، بلبل..... گل وہی، آب و گل و جسم و دل وہی، شمع محفل وہی۔

آپ نے اپنی طرف سے ایک نئی بات کہی..... پھر پتا چلا یہ کوئی کہہ چکا ہے..... حقیقت ایک ہی ہے..... جو بھی حقیقت بتائے گا..... ظاہر ہے..... ملتی جلتی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

سوچنے کی بات ہے.....!

تم کہتے ہو:۔

''تازہ اخبار دو!'' کبھی اخبار بھی تازہ ہوا ہے؟ خبریں گزرے ہوئے دنوں کی ہوتی ہیں اور اخبار رات کا چھپا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ذِلّت

ہر چیز کی ایک جگہ ہے..... جُوتے کی جگہ پاؤں، وہ سر پر آئے تو ذِلّت..... ٹوپی کی جگہ سَر، وہ پاؤں پر آئے تو ذِلّت۔ اَن پڑھ کی جگہ نیچے، وہ افسر بنے تو ذِلّت۔ ایم اے پاس کی جگہ افسری، وہ کلرک بنے تو ذلت

ہمارے حکمران ذِلّت کو بُہت پسند کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

آدمی آتا ہے جانے کے لیے..... پیدا ہوتا ہے مَرنے کے لیے..... اور مَرنے کے بعد ہمیشہ کی زندگی.....

آپ بتائیں..... زندگی جینے میں ہے، یا صرف مرنے میں؟؟

کاروبار کی دنیا

ایک کیا آپ آن لائن ہیں؟

عافیہ مقبول جہانگیر

مشہور ویب سائٹ پر خوبصورت برتنوں کی بہت زبردست پیشکش کچھ دن سے آ رہی تھی اور قیمت بھی انتہائی

مناسب۔ میں نے سوچا سارا دن تو دفتر میں گزر جاتا ہے اور گھر جانے پر دوسرے ڈھیروں کام اور ذمہ داریاں سر اُٹھائے منتظر ہوتی ہیں۔ ایسے میں بازار جانے کا وقت ملتا ہے نہ ہی اس قیمت میں کراکری یا کچن آئٹمز ملتی ہیں جو قیمت ویب سائٹ بتا رہی تھی لہٰذا میں نے وقت اور پیسا دونوں ہی بچانے کی خاطر آن لائن خریداری سے مستفید ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنا آرڈر بک کروا دیا تھا۔ آن لائن خریداری کا طریقہ انتہائی آسان تھا۔ بس ایک فارم پُر کر کے اپنا فون نمبر اور پتا لکھنا ہوتا ہے۔ اُس کے بعد آپ کو فون پر تصدیق کے لیے ایک پیغام موصول ہوتا ہے اور آپ کے جوابی پیغام سے آرڈر کنفرم ہو جاتا ہے۔

دل ڈرا ابھی ہوا تھا کہ طرح طرح کے واقعات کا مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ حلقۂ احباب میں سے جس نے بھی آن لائن کوئی چیز خریدی اُن میں سے اکثر کا تجربہ خوشگوار نہیں رہا تھا۔ میری ایک سہیلی نے گزشتہ سردیوں میں ایک جیکٹ آرڈر کی جو اُسے سردیاں تقریباً گزر جانے کے بعد موصول ہوئی۔ انتہائی گھٹیا کپڑے کی بنی ہوئی تھی جبکہ ویب سائٹ پر انتہائی اعلیٰ کوالٹی کا مواد دکھایا گیا تھا۔ میں کسی کے تجربے کی بنا پر یہ مہر ثبت نہیں کر سکتی تھی کہ آن لائن خریداری سے ہمیشہ ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس

ہوا کی لہروں پہ چلنے والا کاروبار عنقریب خریداری کا بنیادی مرکز بننے کو پر تول رہا ہے

لیے میں نے خود یہ تجربہ کرنے کی ٹھانی۔ بہرحال فارم بھیجنے کے پانچ منٹ بعد ہی مجھے اُس کمپنی کی طرف سے پیغام موصول ہوا اور میں نے آرڈر کنفرم کر دیا۔ مجھے تین دن کے اندر اندر پارسل پہنچا دینے کی نوید سنائی گئی۔ میں کمپنی کی اتنی پُرفتار جوابی کارروائی سے ازحد متاثر ہوئی اور دل میں جو ڈر تھا وہ اُڑنچھو ہو گیا۔ اب مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ کسی قسم کا دھوکا دہی کا امکان نہیں اور ضروری تو نہیں کہ میرا تجربہ بھی ناخوشگوار ثابت ہو۔

آج کے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز بہ روز بڑھتی ترقی نے ابنِ آدم کو بہت سہولیات اور ہر طرح کی آسانیاں فراہم کی ہیں۔ ہم گھر بیٹھے ہی دور دراز دیس میں رہنے والوں سے نہ صرف بات کر سکتے ہیں بلکہ انہیں دیکھ سکتے ہیں، سیکنڈوں میں ایک دوسرے کے ساتھ معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے پھیلاؤ نے اب یہ بھی ممکن کر دکھایا کہ ہم دنیا میں کسی بھی جگہ سے کوئی بھی سامان گھر بیٹھے منگوا سکتے اور دوستوں کو تحفتاً بھجوا سکتے ہیں۔ میں آج سے پندرہ سال پیچھے مڑ کر دیکھ رہی ہوں جب آن لائن عید کارڈ اور مبارک باد کے پیغامات ویب سائٹ کے ذریعے دوستوں کو بھجوانے کا سلسلہ نیا نیا شروع ہوا تھا۔ طرح طرح کے رنگ برنگے چمکتے دمکتے کارڈ

ہم سائٹ پر پسند کرتے اور پھر جس دوست کو مبارکباد دینا ہوتی اُس کا ای میل لکھتے اور ساتھ وہ تاریخ اور دن جس پر ہم کارڈ بھیجنا چاہتے تھے۔

ویب سائٹ ہماری فراہم کردہ معلومات کو محفوظ کر لیتی اور ہمارے بتائے ہوئے وقت اور تاریخ پر اُس شخص کو ای میل موصول ہوتی۔ ای میل کھولنے پر اُسے ہمارا پسند کردہ کارڈ اور ساتھ مبارکباد کے وہ جملے ملتے جو ہم نے سائٹ پر لکھے تھے۔ یوں کارڈ وصول کرنے والا خوشی اور حیرانی سے پھولے نہ سماتا۔ یہ انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک زبردست کارنامہ تھا جو اُس وقت نوزائیدہ تھا۔ تب کمپیوٹر کے یہ چھوٹے چھوٹے پروگرام محدود پیمانے پر ہی تھے اور ہر شخص ان سے واقف نہ تھا۔ محض شوقیہ لوگ ہی اس کے بارے میں جانتے اور استعمال کیا کرتے۔ یہ زندگیوں کی اہم ضرورت نہیں بنا تھا، مگر اب کمپیوٹر ہماری زندگیوں میں اس طرح شامل ہو چکا کہ اس کے بغیر کاروباری اور گھریلو زندگی نامکمل سی ہو چکی۔

گھریلو سطح پر جہاں سوشل میڈیا، گیمز اور معلومات وغیرہ کی فراہمی کا سب سے تیز رفتار اور زود اثر ذریعہ انٹرنیٹ بن چکا وہیں دفاتر اور کاروباری مراکز میں اس کے بغیر کام کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر کاروباری حضرات کی کامیابی و ناکامی میں بیشتر حصہ اب انٹرنیٹ اور ویب سائٹس کے استعمال پر ہی انحصار کرنے لگا ہے۔ کسی بھی کمپنی کے لیے

جہاں محنت کے ذریعے کامیاب ہونا ناگزیر ہے ٹھیک اسی طرح انٹرنیٹ کی دنیا میں اس کے قدم کتنے مضبوط ہیں اور وہ دنیا سے ہم آہنگ ہو کر چلنا جانتی ہے یا نہیں، یہ بات بھی بے حد اہم ہے۔

آن لائن خریداری اور لوگوں کا رجحان

مغربی ممالک میں آن لائن شاپنگ کا رجحان کافی پرانا ہے اور یہ بتدریج پھیلتے پھیلتے مشرق کو بھی اپنا گرویدہ بنا چکا۔ پاکستان میں گزشتہ چند برس سے آن لائن خریداری کے رجحان میں جتنی تیزی آئی ہے وہ حیران کن ہے۔ آن لائن کاروبار کرنے والوں میں ہر طرح کے شعبہ جات شامل ہیں خواہ وہ کپڑوں کا کاروبار ہو یا بھاری الیکٹرانک آئٹمز، موبائل، کمپیوٹر، گھڑیاں، کتب، داخلے، تدریسی شعبے، الغرض ہر چیز آن لائن دستیاب ہے۔ یہاں تک کہ مختلف تدریسی کورسز بھی آن لائن کروائے جاتے ہیں، یعنی ہماری زندگیاں مکمل طور پر نہ سہی تو اسی فیصد آن لائن یعنی ڈیجیٹل تو ہو ہی چکیں۔

ای شاپنگ یا آن لائن خریداری نے بھی حضرت انسان کا بہت سا قیمتی وقت بچا کر گھنٹوں میں ہونے والا کام منٹوں سیکنڈوں پر محدود کر کے بنی نوع انسان پر احسان کیا ہے۔ آئی ٹی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آن لائن شاپنگ کی وجہ سے وہ لوگ جو کسی مجبوری یا معذوری کے، بازاروں کی خاک نہیں چھان سکتے اُن کے لیے آن لائن خریداری نعمت ہے۔ یوں تو آن لائن سسٹم پوری دنیا میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے مگر پاکستان میں پچھلے دس سالوں سے اس نے کافی زور پکڑا ہے اور نہایت کامیابی سے یہ اپنے صارفین کو ان کی مطلوبہ ہر چیز فراہم کر رہا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آن لائن خریداری مہنگی پڑتی ہے، تو یہ محض غلط فہمی ہے کیونکہ اکثر مصنوعات عام طور پر مارکیٹ کے نرخ سے کم پر دستیاب ہوتی ہیں اور چونکہ زیادہ تر مصنوعات برانڈڈ ہوتی ہیں لوگوں کو ان اشیاء کے بارے میں مشکوک نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو پاکستان میں آن لائن خریداری کا رجحان تیزی پکڑنے کے بجائے دم توڑ رہا ہوتا۔

۲۰۱۷ء کی جدید تحقیق اور ایشیائی ممالک

نیلسن نامی ایک جدید تحقیقی ادارے کے تازہ ترین سروے کے مطابق بشمول پاکستان ایشیا پیسیفک ممالک کے صارفین پوری دنیا میں آن لائن خریداری میں سب سے آگے ہیں اور اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ انٹرنیٹ پر خریداری میں صرف کرتے ہیں۔ سروے کے مطابق اس خطے کے ۳۵ فیصد صارفین اپنی آمدنی کا ۱۱ فیصد سے زائد آن لائن خریداری پر خرچ کرتے ہیں جبکہ باقی دنیا میں آن لائن خریداری کی اوسط شرح ۲۷ فیصد ہے۔ نیلسن کی رپورٹ کے مطابق ایشیا میں جنوبی کوریا وہ واحد ملک ہے جس میں آن لائن خریداری سب سے زیادہ ہوتی ہے، وہاں مجموعی آبادی کا تقریباً ۵۹ فیصد آن لائن شاپنگ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے بعد چین ۴۱ فیصد کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ بھی کہا گیا کہ ایشیا پیسیفک کے ممالک میں صارفین میں آئندہ چھ ماہ میں آن لائن خریداری کے رجحان میں باقی انٹرنیٹ صارفین کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔

پاکستان میں بھی ای کامرس یعنی آن لائن خریداری تجارت کی بات کی جائے تو یہاں بھی اس کا رجحان نہ صرف تیزی اور کامیابی سے بڑھ رہا بلکہ اس کی وجہ سے پاکستان کے ریٹیل سیکٹر میں بھی بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب پاکستان مستقبل قریب میں آن لائن خریداری کا سب سے بڑا مرکز بن جائے گا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں انٹرنیٹ صارفین کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ تک پہنچ چکی۔

پاکستان ٹیلی کام اتھارٹی کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں اس وقت موبائل کے ذریعے انٹرنیٹ صارفین کی تعداد ۲ کروڑ ۱۶ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ جبکہ ڈی ایس ایل استعمال کرنے والے صارفین ۱۵ لاکھ اور ایوو کے ذریعے انٹرنیٹ استعمال کرنے والے صارفین ۱۳ لاکھ ہیں۔ موبائل فونز پر تھری جی اور فور جی ٹیکنالوجی کی بآسانی فراہمی کے باعث فطری طور پر انٹرنیٹ کا استعمال تیزی سے بڑھا اور اسی قدر تیزی آن لائن کاروبار میں بھی آئی۔ چاہے وہ کاروبار کرنے والے صارفین ہوں یا خریدار۔ ای کامرس ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستان میں آن لائن خریداری کا موجودہ حجم تقریباً ۱۳ ارب روپے سالانہ ہے اور اس میں اضافے کے بہت امکانات ہیں۔

ای۔بزنس کی شروعات

اس لفظ کا سیدھا سا تعارف یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے کی جانے والی تجارت کو ای بزنس کہا جاتا ہے۔ دنیا کی پہلی ویب سائٹ ۱۹۸۹ء میں متعارف کروائی گئی تو ای بزنس کا آغاز اس کے فقط تین سال بعد ہی ۱۹۹۲ میں ہو گیا۔ ٹیکنالوجی کی تاریخ یہ ہے کہ عام طور پر اسے سب سے پہلے بزنس سیکٹر ہی اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ چناں چہ نیٹ کی سہولت سے استفادے کا بڑا حصہ کاروباری اور تاجر طبقے سے وابستہ ہے۔

ای بزنس بنیادی طور پر ایک آسان، کم خرچ اور کم وقت والی تجارت ہے۔ ایسی تجارت جس میں دفاتر، لمبے چوڑے عملے اور دیگر لوازمات کے جھنجھٹوں سے جان بچی رہتی ہے اور اب تو ای بزنس کے لیے یہ بھی لازمی نہیں کہ آپ کی اپنی کوئی ذاتی ویب سائٹ ہی ہو۔ بہت سی ویب سائٹس آپ کو خرید و فروخت کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ انٹرنیٹ پر آپ فل ٹائم اور پارٹ ٹائم دونوں طرح سے تجارت کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں ای۔بزنس کی چند مشہور ویب سائٹس

پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پاکستانی ۲۰۱۲ء سے ۲۰۱۵ء کے درمیان آن لائن رہے جو پاکستان میں نیٹ صارفین کی آدھی تعداد ہے نیز ڈان نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق اقوام متحدہ کے ترقی اور تجارت کے ایک ادارے کی جانب سے ''انفارمیشن اکانومی رپورٹ ۲۰۱۷ء'' کے عنوان سے شائع کی گئی رپورٹ میں بتایا گیا کہ پاکستان ان ۱۰ سرفہرست معیشتوں میں سے ایک ہے جن کے صارفین آن لائن رہتے ہیں۔ اس فہرست کے مطابق پاکستان نویں نمبر پر ہے۔

تجارت، ترقی اور ڈیجیٹلائزیشن پر مبنی اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایشیا کے کچھ ممالک اب بھی ڈیجیٹل اکانومی کے لیے تیار نہیں تاہم دنیا میں موجود ۴ میں سے ۳ بڑی ای کامرس کی منڈیاں جاپان، چین اور جنوبی کوریا بھی اسی خطے کی ہیں۔ مستقبل میں جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے پیداواری سرگرمیاں زیادہ بہتر ہو سکتی ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس کے منفی اثرات اُن ترقی پزیر ممالک پر بھی پڑ سکتے ہیں جو ڈیجیٹل اکانومی کے لیے تیار نہیں۔ اس وجہ سے ایسے خطوں میں لوگوں کی شرح آمدن عدم مساوات کا شکار ہو سکتی ہے۔ اس سے بچاؤ اسی صورت ممکن ہے جب کمیونیکیشن ٹیکنالوجی، انفرااسٹرکچر، تعلیم، سائنس وغیرہ پر پالیسی مرتب کی جائے۔

جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو وطنِ عزیز میں آن لائن خریداری کو بے شمار بڑی چھوٹی کمپنیاں فروغ دینے میں دن رات کوشاں ہیں۔ پاکستان کے بڑے شہروں کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے بعد اب یہ رجحان دوسرے شہروں میں بھی تیزی سے پھیل رہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عنقریب آن لائن شاپنگ ہی عوام کا مرکز بن جائے گی۔ مختلف مصنوعات کے لیے پاکستان میں مختلف

کامیاب ویب سائٹس موجود ہیں جہاں سے صارفین ہر طرح کی خریداری کر سکتے ہیں۔ مستقل قریب میں ۲۵ فیصد بزنس ای کامرس پر منتقل ہونے کی توقع ہے۔ جس کی بدولت ای کامرس سیکٹر کا نیٹ ورک ایک ارب ڈالر سے تجاوز کر جائے گا۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ۲ ہزار سے زیادہ آن لائن پورٹل دستیاب ہیں جس کے ذریعے لوگ آن لائن خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔

اس بزنس کے لیے استعمال ہونے والی ویب سائٹس میں ''ای بے''، ''امیزون''، ''دراز''، ''زمین''، ''olx'' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ olx پاکستان کی ۲۳ ویں سب سے زیادہ سرچ کرنے والی ویب سائٹ بن چکی۔ مختلف شعبہ جات کے لیے مختلف سائٹس نہایت کامیابی سے اپنے صارفین کے لیے موجود ہیں۔

آن لائن کھانا پینا

اس بزنس کے اس شعبے میں ویب سائٹس مختلف ریستورانوں کی انتظامیہ کے ساتھ ڈیل کرتی ہیں اور ان کے پیکجز اپنی ویب سائٹ پر ڈال دیتی ہیں۔ جن صارفین کو آن لائن کھانا آرڈر کرنا ہوتا ہے تو ویب سائٹ کی جانب سے ان کے مطلوبہ پتے پر واؤچر ڈیلیور کر دیا جاتا ہے یا ریستوران اپنی ذاتی ویب سائٹ کے ذریعے براہ راست کھانے کا آرڈر بک کرتے اور ڈیلیور کر دیتے ہیں لیکن جہاں ہر چیز کا فائدہ ہوتا ہے وہیں کچھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ کچھ ڈیلز وقت کی پابندی کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگر کمپنی وقت پر آرڈر ڈیلیور نہ کر پائے تو ڈیل کینسل یا ڈبل ہو جاتی ہے۔ کھانے پینے کے حوالے سے پاکستان کی مقبول ترین سائٹ eatoye.pk ہے اور دوسرے نمبر پر foodpanda.pk ہے۔ یہ دونوں کمپنیاں آپس میں اشتراک بھی رکھتی ہیں اور انفرادی طور پر بھی کاروبار کرتی ہیں۔

راشن کی آن لائن خریداری

باورچی خانے کے لیے راشن ہر گھر کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی اشیاء کی طرح گھریلو روز مرہ کا سامان بھی آن لائن فروخت ہوتا ہے۔ ان میں دالیں، چاول، گھی، پتی، واشنگ پاؤڈر، شیمپو، وغیرہ جیسی ہر شے بذریعہ آرڈر منگوائی جا سکتی ہے۔ ویب سائٹ پر جا کر سامان کی فہرست منتخب کریں اور معمولی سا فارم بھر کر آرڈر کر دیں۔ گھر بیٹھے راشن آپ کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس خریداری کے لیے rashanlelo.pk، doorstep.pk، gomart.pk اور pakistangrocery.pk وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان ویب سائٹس کا دعویٰ ہے کہ یہ معیار، مقدار اور وقت پر ترسیل کی ضمانت دیتی ہیں۔

جائیداد کی آن لائن خرید و فروخت

پلاٹ چاہیے، ہو یا دکان فروخت کرنی ہو۔ نیا گھر لینے کا کوئی منصوبہ ہو یا کرایہ پر لینا یا دینا ہو۔ اسٹیٹ ایجنٹس کے روایتی ہتھکنڈوں کے بغیر بھی اب یہ کام آن لائن ہونے لگا ہے۔ اس کام کے لیے zameen.com، lamudi.pk اور bastee.pk پاکستان کی صف اوّل کی ویب سائٹس ہیں۔ ان ویب سائٹس کی موبائل فون ایپلیکیشنز بھی ہیں اور ساتھ ہی بنگلوں، گھروں، فلیٹس، دکانوں اور پلاٹس کی تصاویر بھی۔ جن کو دیکھ کر صارف اپنی خریداری کے بارے میں آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ آپ کو ویب سائٹ پر نہ تو کوئی فیس بھرنی پڑتی ہے نہ ہی کوئی ادائیگی فارم کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اس لیے کسی قسم کی دھوکا دہی کا کوئی امکان نہیں۔

آن لائن اشتہارات کا کاروبار

کلاسیفائیڈ اشتہارات کسی بھی کمپنی کی آمدن کا بہت بڑا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن olx نے پاکستان میں انتہائی کامیابی سے کلاسیفائیڈ مارکیٹ میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ عام طور پر یہ

سائٹ پرانی چیزوں کی خرید و فروخت کے لیے مشہور ہے۔ اس میں صارف اپنے سامان کی تصویر کے ساتھ مطلوبہ قیمت اور تفصیلات پوسٹ کرتا ہے اور خریدار متعلقہ دیے گئے نمبر پر براہِ راست مالک سے رابطہ کرتے اور سودا طے کر لیتے ہیں۔ olx پر موبائل، الیکٹرانکس، گھریلو اشیاء سے لے کر فرنیچر، آٹو موبائل، کتابیں، فیشن نیز ہر طرح کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ فری کلاسیفائیڈ کی اور بھی ویب سائٹس ہیں مثلاً pkdekho.com، adpost.pk، bolee.com وغیرہ لیکن جو مقبولیت olx کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو نہیں ملی۔

آن لائن نوکری کی تلاش

پاکستان میں انٹرنیٹ صارفین کے لیے rozee.pk کوئی نیا نام نہیں۔ اس ویب سائٹ کا دعویٰ ہے کہ یہ باصلاحیت افراد کو روزگار کے اچھے، مواقع فراہم کرتی ہے اور اب تک تقریباً ۱۰ لاکھ افراد کی نوکری کے حصول کا ذریعہ بن چکی۔ یہ ویب سائٹ اب تک پاکستان کی نوکری دلانے والی سب سے بڑی ویب سائٹ ہے جو ۶۴ ہزار آجروں کو خدمات فراہم کرتی ہے۔ اس سائٹ پر ہزاروں کی تعداد میں cv موجود ہیں جنھیں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس ویب سائٹ پر صف اول کی کمپنیوں میں موجود ملازمت کے مواقع، کام کرنے کی بہترین جگہ، شاندار نوکریاں، پاکستان کی حالیہ ملازمتیں اور دیگر تفصیلات اسے مزید دلچسپ بناتی ہیں۔

آن لائن ہوٹل بکنگ

جوا گو ڈاٹ کام (jovago.com) ہوٹل بکنگ کی ایک آن لائن سروس ہے۔ جس کا مرکزی دفتر نائیجیریا میں ہے۔ جوا گو نے پاکستان میں مئی ۲۰۱۴ء سے کام کا آغاز کیا جس کا مقصد پاکستان میں سیاحتی صنعت میں وسعت لاتے ہوئے اس میں موجود خلا کو پُر کرنا ہے۔ یہ فی الوقت صارفین کے لیے اپنی نوعیت کا واحد پلیٹ فارم ہے اور اس پر موجود ہوٹلز اور ریسٹ ہاؤس بآسانی بک کروائے جا سکتے ہیں۔

متفرق آن لائن خریداری کے فوائد

آن لائن خریداری کا سب سے بڑا فائدہ وقت کی بچت ہے جبکہ آن لائن کاروبار کرنے والے کو اپنا ریٹیل اسٹور کھولنے کی ضرورت نہیں ہوتی نہ ہی بھرپور سیلز ٹیم درکار ہوتی ہے۔ جس کا فائدہ صارف کو کم قیمت کی صورت ملتا ہے۔ ایک آن لائن اسٹور میں اتنا کچھ ہوتا ہے جو کسی دکان پر رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ مختلف ویب سائٹس اسی حوالے سے نیٹ پر مسلسل جگہ بناتی جا رہی ہیں۔ یہ ویب سائٹس ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے انتہائی پرکشش قیمتوں کی پیشکش کرتی ہیں تاکہ صارفین خریداری کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

نقد ادائیگی کا طریقہ

پاکستان میں آن لائن شاپنگ کے لیے کیش آن ڈیلیوری (COD) ہی کا زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے کیونکہ پاکستانی عموماً آن لائن ادائیگی کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ایسی ادائیگی میں فراڈ کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اب بینکوں نے بھی کریڈٹ کارڈ کے ذریعے کسی بھی آن لائن انٹری یا خریداری پر پابندی لگا دی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان میں کریڈٹ کارڈ کے حامل افراد کی تعداد کم ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ آہستہ آہستہ عوام کا آن لائن خریداری پر اعتماد بڑھے گا اور خریداروں کے حجم میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ بھارت اور دبئی میں بھی کریڈٹ کارڈ کی بجائے کیش آن ڈیلیوری کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ اشیاء کی ترسیل کے بعد ہی رقم وصول کی جاتی ہے۔

آن لائن خریداری کے نقصانات

انٹرنیٹ پر خریداری کے جہاں بے شمار فوائد ہیں وہیں کچھ نقصانات کا بھی احتمال موجود ہے۔ بعض اوقات کوئی

سہولت مناسب طریقے سے استعمال میں نہ لائی جائے تو وہ زحمت بھی بن جایا کرتی ہے۔ آن لائن شاپنگ میں بھی کچھ نقصانات ہوسکتے ہیں۔

یہ کاروبار چونکہ ہوا کی لہروں پر کیا جاتا ہے لہٰذا اس میں خدشات و خطرات کا امکان بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ای بزنس میں ایک بڑا خطرہ ''ہیکرز'' کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ آئی ٹی ماہرین کے مطابق یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ وائٹ ہیک ہیکرز اور بلیک ہیک ہیکرز۔ دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں کیونکہ انٹرنیٹ سیکورٹی کو ہیک کر کے کافی بڑی رقم ہتھیائی جاسکتی ہے۔ تاہم آرڈرز کو ہیک کرنا ممکن تو ہے مگر مشکل بھی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اگر صارفین کی طرف سے آن لائن شاپنگ کی شرح میں اضافہ ہوتا رہا تو روایتی اسٹورز اور ہاؤس ہولڈ سیکٹر کے زوال پزیر ہونے کا اندیشہ ہے۔ جوں جوں پاکستان میں انٹرنیٹ کے استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے، لوگوں کی اکثریت مارکیٹ اور مال کے لیے خریداری کے پرانے طریقے اور ثقافتی روایات بھول رہی ہے۔

اس کے علاوہ غیر مستند ویب سائٹس پر خریداری کرنا بھی آپ کو مشکلات سے دوچار کرسکتا ہے۔ ہلکی کوالٹی کی اشیاء بھی خریدار کا نصیب بن سکتی ہیں نیز وقت پر ڈیلیوری نہ ہونے سے انسان وقتی ڈیپریشن کا بھی شکار ہوسکتا ہے۔ آن لائن خریداری کے حوالے سے ماہرین طب کے انکشافات آپ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے۔

پروڈکٹ کا دماغ پر حاوی ہوجانا، ڈیپریشن کا شکار ہونا، سردرد میں مبتلا رہنا، منفی سوچوں کا بار بار ذہن میں آنا، دھوکا دہی کا خدشہ لاحق رہنا، من پسند چیز نہ ملنے پر کئی دن تک غم و غصے کی کیفیت میں گھرے رہنا آپ کو مختلف ذہنی و جسمانی مسائل سے بھی دوچار کرسکتا ہے لہٰذا ماہرین کی رائے میں وہ افراد جو کمزور دل یا قوت ارادی کے مالک ہوں انہیں آن لائن خریداری سے بچنا چاہیے۔ کوئی بھی خریداری آپ کی صحت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی۔

انٹرکام کی گھنٹی نے میری سوچ کا محور توڑ دیا اور میں چونک کر انٹرنیٹ کے جادوئی فسوں سے باہر نکل آئی۔ اس سحر انگیز نئی دنیا میں گھومتے مجھے نجانے کتنے گھنٹے گزر چکے تھے۔ کوریئر کمپنی کا نمائندہ میرا پارسل ڈیلیور کرنے آیا تھا۔

میں نے اُسے کہا کہ پہلے میں اپنا پارسل کھول کر تسلی کرلوں تب ہی رقم ادا کروں گی۔ جس پر نمائندے نے ڈبا میرے ہاتھ سے تقریباً چھینتے ہوئے سخت لہجے میں کہا ''پہلے آپ ادائیگی کریں پھر ڈبا کھولیں۔ ویسے بھی دستخط کرتے ہی یہ آپ کا ہو چکا۔ اب یہ آپ کو لینا ہی پڑے گا۔ ڈیلوری واپس نہیں جاتی''۔ ''ارے! مگر میں نے پانچ سٹیل کی پتیلیوں کا سیٹ آرڈر کیا تھا۔ یہ تو آپ مجھے ایک چھوٹا سا ڈبا پکڑا رہے ہیں۔ نہیں یہ میرا آرڈر نہیں ہوسکتا۔ یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے''۔

''غلطی کا امکان ہی نہیں میڈم''۔ اُس نے مجھے وہ فارم دکھایا جو میں نے ویب سائٹ پر بھرا تھا۔ مجبوراً رقم ادا کر کے میں نے بے یقینی کی کیفیت میں وہ ڈبا پکڑ لیا جو کسی طور بھی پانچ پتیلیاں اپنے اندر سمونے کی ''جرأت'' نہیں کرسکتا تھا۔ میری ساتھی ارم نے تجسس سے سامان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ڈبا اُسے دکھایا۔ پانی پی کر حواس بحال کیے اور ڈبے کی پیکنگ کھولنی شروع کی۔ اندر سے ہو بہو وہی پتیلیاں نکلیں جو میں نے ویب سائٹ پر دیکھی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُن کا سائز ویب سائٹ پر اچھا خاصا بڑا تھا جبکہ حقیقت میں وہ بچوں کے کسی کھلونے سے زیادہ بڑی نہیں تھیں۔ رقم جو گئی سو الگ، اُس پر احساسِ ندامت مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ آخر میں بھی اس دھوکے کا شکار ہو ہی گئی جس کے بارے میں اب سے پہلے صرف سنتی آئی تھی۔

میں نے غلط ویب سائٹ کا انتخاب جو کرلیا تھا۔ ●●●

علامہ اقبالؒ مسجد قرطبہ میں

ڈاکٹر جاوید اقبال

نامور مشرق کے ایک سہانے سفر کی ایمان افروز داستان جو تا عمر اُن کے دل و دماغ میں رچ بس گیا

اقبال کی پیرس سے میڈرڈ (اسپین) روانگی کی تاریخ کا حتمی طور پر تعین کرنا مشکل ہے لیکن عین ممکن ہے۔ کہ وہ ۵ یا ۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو پیرس سے میڈرڈ پہنچے اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس آ گئے۔ پس اسپین میں ان کا قیام تقریباً تین ہفتوں کا تھا۔ میڈرڈ میں ان کے ہمراہ ایک دبلی پتلی انگریز لڑکی بھی تھی۔ وہ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری یا شاید مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی اور جسے میڈرڈ کے اخباری نمائندوں نے غلطی سے اقبال کی بیٹی سمجھا۔ اس لڑکی کا ذکر میڈرڈ کی اخباری رپورٹ میں یا عطیہ فیضی کے نام اقبال کے خط محررہ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء

میں آتا ہے۔ عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

''اسپین میں میری پرائیویٹ سیکرٹری کا رویہ' جو کہ ایک انگریز لڑکی تھی مجھ سے اچانک بدل گیا اور وہ پرائیویٹ سیکرٹری کی بجائے ایک مرید کی طرح میری خدمت کرنے لگی۔ میں نے اس کے رویہ میں اس اچانک تبدیلی کی وجہ پوچھی۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس پر منکشف ہوا ہے کہ میں کوئی آسمانی مخلوق ہوں۔ اب میرے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ میں اپنے تاثر کی تشریح مثبت طور پر کرسکوں۔ البتہ منفی طور پر ضرور کرسکتا ہوں اور وہ ہے کہ میں احمق نہیں ہوں۔''

راقم کی رائے میں اس انگریز لڑکی کا تعلق برٹش انٹیلی جنس سے تھا۔ ہوسکتا ہے وہ لندن ہی سے اقبال کے ہمراہ آئی ہو لیکن سید امجد علی اس کا ذکر نہیں کرتے، اگرچہ وہ اقبال کے ساتھ لندن سے پیرس پہنچے تھے۔ عین ممکن ہے کہ پیرس یا میڈرڈ میں وہ ان سے اتفاقیہ ملی ہو اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ وہ اسپین جارہے ہیں یا ہسپانوی زبان سے ناواقف ہیں' اس نے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری یا مترجم کے فرائض انجام دینے کی حامی بھر لی ہو۔

ان ایام میں سفر یورپ کے دوران ایک سیاح کو ہر قسم کے لوگ مل سکتے تھے اور اقبال آخر سیاح ہی تو تھے۔ ایک واقعہ جو انہوں نے کئی احباب کو سنایا یہ تھا کہ جس ٹرین کے ذریعے وہ پیرس سے لندن جارہے تھے اس میں ان کے کمپارٹمنٹ میں دو قمار باز بھی سوار تھے۔ جنہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے چند سادہ لوح مسافروں سے بیس پاؤنڈ کی رقم ہتھیا لی۔ اقبال ان کی چالوں کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ جب قمار بازوں نے انہیں بھی تاش کھیلنے کے لیے کہا تو اقبال نے دعوت قبول کرلی اور لندن پہنچنے تک ان سے بیس پاؤنڈ جیت لیے۔

جب وہ گاڑی سے نیچے اترے تو دونوں قمار باز ان سے ہارے ہوئے بیس پاؤنڈ واپس لینے کی غرض سے ان کی خوشامد کرنے لگے اور ہندوستانیوں کی سخاوت اور فیاضی کی خوب خوب تعریفیں کیں۔ مگر اقبال نے انہیں ڈرایا کہ وہ کھیل میں دھوکے بازی سے کام لیتے رہے ہیں اور ان کی رپورٹ ابھی پولیس کو کی جائے گی۔ یہ سن کر وہ فوراً وہاں سے کھسک گئے۔

برٹش انٹیلی جنس کو اقبال کے سفر ہسپانیہ میں دلچسپی ہوسکتی تھی۔ وہ گزشتہ سال اٹلی جاکر مسولینی سے مل چکے تھے۔ اس مرتبہ ان کا ارادہ صرف اسپین جانے کا نہ تھا بلکہ جرمنی اور آسٹریا بھی جانا چاہتے تھے۔ جس طرح مسولینی اٹلی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا، اسی طرح ہٹلر بھی جنوری ۱۹۳۳ء میں جرمنی کا چانسلر بن گیا تھا۔ اسپین کا اٹلی کے فاشسٹوں اور جرمنی کے نازیوں سے رابطہ تھا۔

اسپین میں اقبال کی صدر جمہوریہ سے ملاقات کا امکان تھا۔ اس کے بعد اگر وہ جرمنی جاتے تو عین ممکن ہے کہ ہٹلر سے بھی ملتے۔ ہندوستان کی ایک اہم مسلم سیاسی شخصیت کی یورپ میں ایسے لوگوں سے ملاقاتوں کی روداد برٹش انٹیلی جنس کے ریکارڈ کے لیے اشد ضروری تھی۔ بہرحال میڈرڈ میں انگریز لڑکی کے رویے میں اچانک تبدیلی سے اقبال کو پہلی بار یہ شبہ ہوا کہ اس کا تعلق کسی خفیہ برٹش ایجنسی سے ہے۔

اقبال نے اس مرتبہ سفر یورپ کے دوران فرانس اور اسپین دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور اپنی منشا کے مطابق جرمنی اور آسٹریا نہ گئے۔ خصوصاً جرمنی میں تو جنوری ۱۹۳۳ء میں اقتدار میں آجانے کے سبب بڑی گہما گہمی تھی۔ ممکن ہے اس خیال کے پیش نظر کہ برٹش انٹیلی جنس یورپ میں ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے، انہوں نے جرمنی یا آسٹریا جانے کا ارادہ ترک کردیا ہو۔

میڈرڈ میں اقبال کے میزبان پروفیسر آسین پیلا کیوس تھے۔ انھوں نے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور اسلام پر ایک کتاب تحریر کی تھی اور اقبال کو قیام لندن کے دوران میڈرڈ

کر یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ میڈرڈ پہنچتے ہی اقبال کی ملاقات اسپین کے وزیر تعلیم سے ہوئی۔ چند روز میڈرڈ ٹھہرنے کے بعد وہ اندلس (جنوبی اسپین) تشریف لے گئے۔ واپسی پر پھر کچھ دن میڈرڈ میں قیام کیا اور وہاں ان پروفیسروں اور دانشوروں سے ملاقات کی جو عربی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے یا جن کا موضوع تحقیق اسلامی تمدن تھا۔

میڈرڈ ہی میں وہ عرب محقق محمود خضیری سے ملے جو اس زمانے میں وہاں فقہ اسلام پر تحقیق کررہے تھے۔ چند سال بعد جب انہیں عبداللہ چغتائی سے معلوم ہوا کہ محمود خضیری نصیرالدین طوسی پر ایک مقالہ تحریر کررہے ہیں تو اقبال نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ طوسی کی اقلیدس اور ان کے معاصرین کی تحریروں کا بغور مطالعہ کریں۔ کیونکہ اس تحقیق سے انہیں معلوم ہوگا کہ مسلم ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہوں۔

۲۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے ''اسپین اور فلسفہ اسلام'' کے موضوع پر میڈرڈ یونیورسٹی کی نئی عمارت میں لیکچر دیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر آسین پیلا کیوس نے کی اور انہوں نے ہی اقبال کا تعارف حاضرین جلسہ سے کروایا۔ اجلاس کی روداد میڈرڈ کے اخبار الدیبیت میں شائع ہوئی۔

اقبال نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی سیر کی اور حدیقۃ الزہرہ (وہ محل جو عبدالرحمٰن اول نے اپنی چہیتی بیوی زہرہ کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کروایا تھا) کے کھنڈرات بھی دیکھے لیکن جو عمارت آنکھوں سے ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی، وہ مسجد قرطبہ تھی۔

جس طرح مسولینی سے اقبال کی ملاقات کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح مسجد قرطبہ میں اقبال کے تحیۃ المسجد کے نفل ادا کرنے کے بارے میں بھی مختلف روایتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرطبہ میں اس مسجد کی زیارت نے اقبال کو جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو انہیں پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس تجربے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے غلام رسول مہر کو تحریر کیا: ''مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو۔'' پھر راقم کو بھی ایک تصویری کارڈ قرطبہ سے ارسال کیا اور لکھا: ''میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس مسجد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ اللہ کرے کہ تم جوان ہوکر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔''

اقبال کی یہ دعا بیالیس سال کے بعد پوری ہوئی جب راقم اگست ۱۹۷۵ء میں سیاحت ہسپانیہ کے دوران قرطبہ پہنچا اور نہ صرف مسجد قرطبہ کی زیارت کی بلکہ محراب کے سامنے اس مقام کو بھی تعظیماً چھوا جہاں شاید کھڑے ہوکر اقبال نے نماز ادا کی تھی۔

اقبال غالباً پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مسجد قرطبہ کے کلیسا میں منتقل ہونے کے کئی صدیوں بعد جنوری ۱۹۳۳ء میں وہاں پہلی بار دو رکعت نماز ادا کی۔ بہرحال ان کے نماز ادا کرنے کے متعلق جو مختلف روایتیں مشہور ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں کہ اقبال مسجد کی شان و شوکت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا دل بے اختیار نماز پڑھنے کو چاہا چنانچہ انہوں نے گائیڈ سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں۔ ادھر وہ پوچھنے گیا' ادھر اقبال نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پیشتر ادائے نماز سے فارغ ہوگئے۔

سید امجد علی دعویٰ کرتے ہیں کہ اقبال نے انہیں ایک خط میں تحریر کیا تھا کہ انہوں نے ادائیگی نماز سے قبل وہاں اذان بھی دی تھی۔ غالباً اسی دعوے کو ذہن میں رکھتے ہوئے فقیر سید وحیدالدین لکھتے ہیں کہ اقبال نے تقریباً سات سو سال بعد مسجد قرطبہ میں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی۔ سر مالکم ڈارلنگ بیان کرتے ہیں:

''اقبال نے مجھے اپنے قیام اسپین کی بڑی خوشگوار کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قرطبہ کی شاندار مسجد دیکھنے گئے تھے جو اب کلیسا میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ انہوں نے گائیڈ سے اس جگہ نماز ادا کرنے کی اجازت طلب کی، کیونکہ یہ کسی زمانے میں مسجد رہ چکی تھی۔ گائیڈ نے کہا کہ کلیسا کے راہب اس پر خوش نہ ہوں گے لیکن انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور مصلیٰ بچھا دیا۔ اتنے میں ایک پادری احتجاج کے لیے وہاں آ نکلا۔ اقبال نے گائیڈ سے کہا' پادری سے کہہ دو کہ ایک بار مدینہ میں عیسائیوں کا ایک وفد کچھ مطالبات لے کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انہیں ٹھہرایا۔ جب عبادت کا وقت آیا تو عیسائی متردد تھے کہ آیا وہ مسجد میں اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر سکیں گے۔ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے انہیں بخوشی عبادت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسائیوں کو اپنی مسجد میں عبادت کی اجازت دے دی تھی تو میں اس جگہ جو کسی وقت مسجد تھی، کیا نماز ادا نہیں کر سکتا؟ پادری سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور اقبال نے نماز شروع کر دی۔ جب اقبال نے نماز ختم کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کلیسا کے تمام پادری اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہو چکے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ایک نے تو اس منظر کی تصویر بھی لے لی۔ اس کے بعد اقبال نے کہا: غالباً میں واحد مسلمان تھا جس نے گزشتہ چار سو سال میں یہاں پہلی بار نماز ادا کی۔''

اسی سلسلے میں ایک مضمون روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۲۱/اپریل ۱۹۷۴ء میں محمود الرحمٰن نے امتیاز محمد خان کے حوالے سے شائع کیا جس میں ارشاد کرتے ہیں کہ قیام لندن ہی سے اقبال کا ارادہ مسجد قرطبہ کی زیارت اور کسی نہ کسی طرح وہاں نماز ادا کرنے کا تھا مگر مسجد گرجا بنائی جا چکی تھی اور وہاں اذان و نماز دونوں کی ممانعت تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی طرف رجوع کیا۔ (واضح رہے کہ آرنلڈ دو سال قبل یعنی ۱۹۳۰ء میں فوت ہو چکے تھے۔) آرنلڈ کی کوشش سے انہیں مسجد قرطبہ میں نماز ادا کرنے کی اجازت اس شرط پر ملی کہ جب وہ مسجد کے اندر داخل ہو جائیں تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے یوں چلتی ہے:

''اقبال حسب قرارداد مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے آواز کی پوری شدت سے اذان دی۔ اقبال کہتے ہیں: میں اس جذبے، سرور اور کیفیت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری تھا۔ سالہا سال کے بعد مسجد کے اندر پہلی مرتبہ اللہ اکبر کی آواز محراب و منبر سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اذان سے فارغ ہونے کے بعد اقبال نے مصلیٰ بچھایا اور نماز ادا کرنے لگے۔ دوران نماز ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ سجدے میں گرتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران عالم رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں' اقبال تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ اور جب اقبال ہوش میں آئے تو دل کا سکون اور اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔''

ان روایتوں میں حقیقت کتنی اور افسانہ کتنا ہے، اس کا

اندازہ اقبال کے دو بیانات سے کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ لاہور واپس پہنچے اور اسٹیشن سے نکل کر گھر تشریف لائے تو بعض احباب ان کے ساتھ تھے اور موضوع گفتگو سیاحت ہسپانیہ تھی۔ قرطبہ کی عدیم المثال مسجد کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

''میری رائے میں اس سے زیادہ خوبصورت اور شاندار مسجد روئے زمین پر تعمیر نہیں ہوئی۔ عیسائیوں نے بعد فتح قرطبہ اس مسجد میں جا بجا چھوٹے چھوٹے گرجے بنا دیے تھے۔ جنہیں اب صاف کر کے مسجد کو اصل حالت میں لانے کی تجویزیں کی جا رہی ہیں۔ میں نے ناظم آثار قدیمہ کی معیت میں جا کر بہ اجازت خاص اس مسجد میں نماز ادا کی۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے تسلط کے بعد جسے کم و بیش ساڑھے چار سو برس گزر چکے ہیں' اس اسلامی عبادت گاہ میں یہ پہلی نماز تھی۔''

پھر عبدالرشید طارق سے گفتگو کے دوران انہوں نے اسپین میں مسلمانوں کی تاریخی عمارات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد کیا:

''میں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے تاریخی مقامات کا معائنہ کیا۔ مسجد قرطبہ میں، جس کی فضا صدیوں سے بے اذان پڑی ہے' حکام کی اجازت لے کر نماز ادا کی۔ سجدے میں گر کر اللہ کے حضور گڑگڑایا کہ اللہ اللہ! یہ وہ سرزمین ہے جہاں مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی' یونیورسٹیاں قائم کیں اور یورپ کو علم و فضل سکھایا۔ جن کے دبدبے سے شیروں کے دل دہلتے تھے اور جن کے احسان کے نیچے آج تمام فرنگستان دبا ہوا ہے۔ آج میں اسی قوم کا ایک فرد انہی کی تعمیر کردہ مسجد میں اغیار کی اجازت لے کر نماز پڑھ رہا ہوں۔''

سو ظاہر ہے' اقبال حکومت ہسپانیہ کی اجازت خاص کے تحت ناظم آثار قدیمہ کی معیت میں مسجد میں نماز ادا کرنے کی خاطر گئے تھے۔ اس لیے مصلیٰ ساتھ لے کر گئے اور عین ممکن ہے کہ یہ انتظام انہوں نے قیام میڈرڈ کے دوران پروفیسر آسین پیلا کیوس یا وزیر تعلیم حکومت ہسپانیہ کے ذریعہ کروایا۔ ان کے ہمراہ فوٹو گرافر بھی تھے جنہوں نے نماز کی ادائیگی کے دوران اور بعد میں ان کی کئی تصویریں مسجد کے اندر کھینچیں، جو کئی بار اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں اور خاصی مقبول ہیں۔

حکومت ہسپانیہ نے شاید اپنے ملک کے پروپیگنڈے کی خاطر انہیں یہ اجازت خاص دی تھی لیکن جس کسی نے بھی مسجد قرطبہ کی زیارت کی ہے، اس نے دیکھا ہو گا کہ مسجد کے اندر اس کے لاتعداد ستونوں کے درمیان جگہ جگہ گھیر گھیر کر بیسیوں چھوٹے چھوٹے گرجے بنائے گئے ہیں جو ابھی تک صاف نہیں کیے گئے۔ البتہ مسجد کا خوبصورت ترین حصہ محراب والا حصہ ہے جو ستونوں سمیت تمام کا تمام سنہری ہے کیونکہ اس پر سونے کا جڑاؤ کام کیا گیا ہے اور وہ اب تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔

مسجد سے باہر، اس کے عالی شان مینار واحد پر جو اذان کے لیے مخصوص تھا' اب گھنٹا آویزاں ہے اور رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق دن میں خاص خاص وقتوں پر اسے بجایا جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ اپنے عہد میں دیگر مساجد یا مسلمانوں کی عام عبادت گاہوں کی طرح خوب روشن اور تابندہ عبادت گاہ تھی (چراغ جلانے کے لیے تیل کا خرچ ۳۱۴ من اور موم بتیاں جلانے کے لیے ۳ء۵ من موم اور ۳۴ سیر سوت سال بھر میں صرف ہوتا تھا لیکن اب عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی طرح اس کی فضا تیرہ و تار ہے اور اس کے اندر موجود بھاری آرگن کی کرخت موسیقی کے پس منظر میں اس کی ویرانی

اور کسمپرسی سے خوف آتا ہے۔

رات کو مسجد کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ راقم نے رات کو مسجد قرطبہ کے گرد طواف کیا اور مخصوص وقفوں کے بعد انتہائی تاریکی میں مینار سے آویزاں گھنٹے کو بجتے سنا تو یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک آسیب زدہ عمارت ہے۔ مسجد کی شان و شوکت اور حسن و جمال اور اس کے ساتھ اس کی ویرانی، کسمپرسی اور تیرہ و تار فضا کا منظر ایک بار دیکھ کر کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ راقم سفر ہسپانیہ سے واپسی پر عمرہ کی غرض سے مکہ معظّمہ گیا اور مدینہ منورہ کی بھی زیارت کی لیکن مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ کی روشنیوں، رونقوں اور اذانوں میں مسجد قرطبہ کا تیرہ و تار منظر نگاہوں کے سامنے سے نہ ہٹتا تھا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے مسجد میں نماز ادا کرنے پر کسی پادری نے اعتراض کیا ہو اور اقبال نے اسے مدینہ میں عیسائیوں کے وفد کی آمد والی بات سنائی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب وہ وہاں نماز ادا کر رہے ہوں یا ان کی تصویریں اتر رہی ہوں تو پادریوں کا ایک غول اس منظر کو دیکھنے کے لیے آ کھڑا ہوا ہو، البتہ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اپنی دعائیہ نظم ؎

ہے یہی مری نماز ہے یہی مرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔

اقبال نے اندلس میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے جو عظیم شاہکار دیکھے، ان کے متعلق مختلف شخصیتوں سے اپنے تاثرات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً شیخ محمد اکرام کے نام اپنے محررہ ۲۷/مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھا:

”میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہو گی۔ الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔“

پروفیسر حمید احمد خان تحریر کرتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی فن تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے مسجد قرطبہ کے حوالے سے فرمایا:

”اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوا شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیوؤں کا۔ مگر الحمراء محض انسانوں کا...... میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر ”ہوالغالب“ لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے، کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو۔“

اقبال کی حسِ لطافت

اکبرؔ الہ آبادی اردو کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ اُنھوں نے علّامہ اقبالؔ کے لیے الہ آباد سے لنگڑے آموں کا پارسل بھیجا۔ علّامہ اقبالؔ نے پارسل کی رسید پر دستخط کرتے ہوئے یہ شعر بھی لکھ دیا:

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک آیا

’اعجازِ مسیحائی‘ کے معنی علاج کرنے کی خوبی ہیں۔ لطف یہ تھا کہ آپ ایسے اچھے معالج ہیں کہ لنگڑے کو الہ آباد سے لاہور تک سفر کروا لیا۔

جیسے کہ ذکر کیا جا چکا اقبال ۲۶/جنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس پہنچے۔ ان کے خط بنام غلام رسول مہر محررہ یکم فروری ۱۹۳۳ء سے ظاہر ہے کہ اقبال شیدائی سے انہیں روزنامہ انقلاب کے بہت سے پچھلے پرچے پیرس میں پڑھنے کے لیے مل گئے اور یوں وہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے باخبر ہوئے۔ بالآخر وہ اپنے پروگرام کے مطابق ۱۰/فروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بحری جہاز ”کونٹے وردی“ پر سوار ہوئے اور ۲۲/فروری ۱۹۳۳ء کو بمبئی پہنچے۔ کسٹمز سے نکلتے وقت ڈیوٹی ادا کرنے کی خاطر سردار بیگم کے زیورات کا ڈبہ سوٹ کیس سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ کسی ساتھی نے مشورہ دیا کہ کم از کم انگشتریاں تو انگلیوں میں پہن لیجیے تاکہ کچھ ادا نہ کرنا پڑے گا مگر آپ نہ مانے اور تمام زیورات پر جو بھی ٹیکس لگا، ادا کر کے باہر آئے۔

بمبئی میں خلافت کے نامہ نگار کو سیاحت ہسپانیہ کے متعلق ایک انٹرویو بھی دیا جس کے دوران فرمایا:

”میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح یہودیوں کے لیے ارض موعودہ فلسطین ہے، اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ ہے۔ اس قدر خوبصورت‘ اس درجہ پرفضا اور ایسا آرام دہ ملک۔“

ایک اور موقع پر سفر اندلس کے متعلق فرمایا:

”میں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمراء کے علاوہ میں نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ مشہور عالم قصر عبدالرحمٰن اوّل نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کروایا تھا۔ آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے سب سے پہلے اس جگہ پر ہوائی جہاز اُڑانے کا مظاہرہ کیا تھا۔“

۲۵/فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال فرنٹیئر میل سے لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر راقم سمیت لاتعداد لوگ ان کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر جمعیۃ الاسلام کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر نے سپاسنامہ پیش کیا اور تیسری گول میز کانفرنس میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا۔ مزید واضح کیا کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام ابھی تک اس بات کا متقاضی ہے کہ اقبال اس کی تکمیل کے لیے قائدانہ امداد فرماتے رہیں۔ جواب میں اقبال نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارشاد کیا:

”آپ میری سابقہ زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اوّل سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں‘ وہ دور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو...... اللہ کے لیے آپ اپنے تمام اختلافات کو خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔“

اسٹیشن سے نکل کر اقبال احباب کے ہمراہ گھر آئے۔ لیکن گفتگو زیادہ تر سیاحت ہسپانیہ کے متعلق ہی ہوئی۔ بار بار مسجد قرطبہ کا ذکر فرماتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا مسجد قرطبہ ہمیشہ کے لیے ان کے دل میں بس گئی ہے۔

(ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ”زندہ رود“ سے طویل اقتباس)

ماں کے آٹھ جھوٹ

پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ

ایک بیٹے کی زبانی مادرانہ محبت و عقیدت میں ڈوبی سبق آموز کہانی

میرے ایک دوست ندیم جاوید آج کل فرانس میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ وہ مجھے کمپیوٹر پر ای میل کے ذریعے اکثر دلچسپ معلومات بھیجتے رہتے ہیں۔ نئی کتابوں کی اطلاع، فکر انگیز کالم، عالمی میڈیا کی چالیں، دنیا بھر میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع، سکالرشپ، مسلمانوں کی حالت زار سے متعلق اخباری تراشے اور سعودی عرب، دبئی، امریکا و برطانیہ میں ملازمتوں کے مواقع سے متعلق معلومات بھیجنا ان کا معمول ہے۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے ایک دلچسپ مضمون بھیجا جس کا عنوان ہے: ''میری ماں کے آٹھ جھوٹ۔'' یہ ایک امریکی نوجوان کی کہانی ہے۔ مجھے اس عنوان پر حیرت ہوئی چنانچہ میں نے فوراً اسے پڑھا اور ترجمہ کیا۔ آپ بھی اس انگریزی کہانی کا ترجمہ ملاحظہ کریں۔

امریکی نوجوان اپنی سچی داستان میں لکھتا ہے کہ میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرا باپ کوئی کام نہ کرتا، ساری بھاگ دوڑ میری ماں ہی کو کرنا پڑتی۔ ایک دن چاول پکائے گئے۔ چاول کم تھے۔ میری والدہ نے اپنے چاول بھی میری پلیٹ میں ڈال دیے اور کہا' بیٹا پیٹ بھر کر کھانا۔ میں نے پوچھا' تم نے چاول کھائے ہیں؟ میری ماں نے کہا'' مجھے بھوک نہیں ہے۔'' یہ میری ماں کا پہلا جھوٹ تھا۔

ہم لوگ دریا کے کنارے رہتے تھے۔ ایک اتوار کو میری ماں مجھے دریا پر لے گئی تا کہ میں مچھلی کھاؤں اور میری بہتر نشوونما ہو سکے۔ اُس روز بمشکل ہم نے صرف ایک مچھلی پکڑی۔ میری ماں نے اس کی یخنی بنائی اور مچھلی بھون کر مجھے دے دی۔ اُس نے خود تھوڑی سی یخنی پی اور مجھے بھنی ہوئی مچھلی کھانے کو کہا۔ میں نے پوچھا' تم نہیں کھاؤ گی؟ اس نے کہا ''مجھے مچھلی ناپسند ہے۔'' یہ دوسرا جھوٹ تھا کیونکہ بعد میں' میں نے دیکھا کہ وہ میری بچائی ہوئی مچھلی کے کانٹوں سے گوشت اتار کر کھا رہی تھی۔

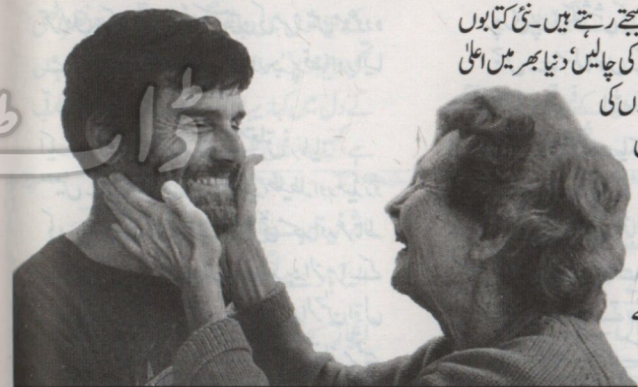

میں جونیئر اسکول میں تھا۔ سخت سردی کے دنوں میں وہ میرے لیے آگ جلاتی اور جاگتی رہتی۔ دن بھر اُسے سبزی فروخت کرنا پڑتی۔ میں اُسے کہتا' ماں سو جاؤ' تو وہ کہتی'' بیٹا! تم سو جاؤ' مجھے تھکان نہیں ہے۔'' یہ میری ماں کا تیسرا جھوٹ تھا کیونکہ اس کی آنکھیں تھکن سے سُرخ ہو چکی تھیں۔

ایک دن سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میرا امتحان بھی شروع تھا۔ یہ وہ دن تھے جب ٹھنڈا پانی بڑی مشکل سے ملتا۔ جب میں پرچہ دے کر باہر نکلا تو پسینے سے شرابور تھا۔ میری ماں ٹھنڈے پانی کی بوتل تھامے میری منتظر تھی۔ اُس نے مجھے ٹھنڈا پانی پینے کو دیا۔

میں نے کہا' تم بھی تو پیئو۔ اس نے کہا'' مجھے بالکل پیاس نہیں ہے۔'' یہ میری ماں کا چوتھا جھوٹ تھا۔

اب میں ہائی اسکول میں تھا۔ میرا باپ بیمار رہنے لگا تھا۔ میری ماں محنت مزدوری کرتی' باپ کی دوائیاں لاتی' کھانا پکاتی' میرے تعلیمی اخراجات پورے کرتی۔ ہم بڑی تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن ایک پڑوسی نے مدد کی پیش کش کی تو میری ماں نے اُسے کہا'' ہمیں کسی مدد کی ضرورت نہیں۔'' یہ میری ماں کا پانچواں جھوٹ تھا۔

بی اے کرنے کے بعد مجھے ملازمت مل گئی اور میں دوسرے شہر چلا گیا۔ میں نے ماں کو آرام کرنے کا مشورہ دیا اور ہر ماہ باقاعدہ اُسے کچھ رقم بھجواتا رہا۔ وہ یہ رقم سنبھال کر رکھتی۔ جب میں چھٹی پر گھر آتا تو مجھے رقم واپس کر دیتی اور کہتی ''بیٹا تجھے پردیس میں اس کی زیادہ ضرورت ہے' میرا گزارا چل رہا ہے۔'' یہ میری ماں کا چھٹا جھوٹ تھا۔

میں ایم اے کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے لیے دن رات دعائیں کرتی۔ اس کی دعاؤں کی بدولت مجھے سکالرشپ مل گیا اور میں نے ایم اے کر لیا۔ میں نے اُسے کہا' اب میں تجھے اپنے ساتھ بڑے شہر لے جاؤں گا۔ تو وہاں آرام سے رہے گی۔ اُس نے کہا'' بیٹا تو خوش رہ' مجھے آسائشوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' یہ میری ماں کا ساتواں جھوٹ تھا۔

میں نے پھر شادی کر لی۔ میں بیوی بچوں سمیت خوش و خرم رہ رہا تھا۔ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ میری بوڑھی ماں کو کینسر ہو چکا اور وہ ہسپتال میں داخل ہے۔ میں بڑی بے تابی سے ہسپتال پہنچا۔ دیکھا تو میری کمزور اور بیمار ماں بستر مرگ پر دراز ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر بمشکل مسکرائی۔ میں اپنی پیاری ماں کو اس تکلیف میں دیکھ کر رونے لگا۔ میرے آنسو دیکھ کر وہ بے تاب ہو گئی اور کہنے لگی'' بیٹا تو مت رو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔'' یہ میری ماں کا آٹھواں جھوٹ تھا۔ یہ کہہ کر میری ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گئی۔

اس سچی داستان میں حسرت ہے اور ایک درد بھی۔ یہ کہانی پڑھ کر میں سوچ رہا تھا' باپ مختلف ہو سکتے ہیں مگر دنیا بھر میں ماں ایک جیسی ہوتی ہے' نہایت فکر مند اور دعائیں دینے والی۔ یہ کہانی اُن نافرمان بیٹوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو زندہ ماں کی قدر نہیں کرتے اور ماں کے مرنے کے بعد طالبوں سے قرآن پاک پڑھواتے اور زردے پلاؤ کی دیگیں پکا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے ماں کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔

بھئی جنگل میں مور ناچا' کس نے دیکھا؟ سوتے بچے کو پیار کیا' کسے خوش کیا؟ جب زندہ ماں کو خون کے آنسو رلائے تو اس کے مرنے پر کروڑوں روپے کی خیرات بھی کی تو ماں کو کوئی فائدہ نہیں ملا۔ اُس کا دل تو تب ٹھنڈا ہوتا جب اس کی اولاد اُس کی فرمانبردار ہوتی اور اُس سے دعائیں لیتی۔

کیوں مقبروں پہ زر کی چڑھاتا ہے چادریں
دے زندگی کے ننگے بدن پر لباس تُو

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اولاد اتنی نافرمان کیوں ہو جاتی ہے کہ ماں جیسی ہستی کو بھی فراموش کر دیتی ہے؟ مولانا احمد

علی لاہوری کے پاس ایک بوڑھی عورت آئی اور کہا اللہ کے لیے میری مدد کریں۔ میرے بیٹوں کو سمجھائیں۔ دونوں نافرمان ہو گئے ہیں۔ بوڑھی عورت نے بتایا کہ میرا خاوند شادی کے پانچ سال بعد فوت ہو گیا تھا۔ میں نے محنت مزدوری کر کے دونوں بیٹوں کو پڑھایا لکھایا۔ میں لوگوں کے گھر برتن مانجھتی، کپڑے سیتی اور تنگی کے دن گزارتی مگر میں نے دونوں بیٹوں کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ آنے دی۔

میں نے ایک کو ڈاکٹر اور دوسرے کو انجینئر بنایا۔ پھر بڑی دھوم سے دونوں کی شادی کی۔ اب یہ دونوں بچوں والے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹے مجھے گھر سے نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مکان کا بٹوارہ چاہتے ہیں جو اُن کے باپ نے بنایا تھا۔ دونوں مجھے گھر سے نکال کر مکان فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ میں دربدر ہو جاؤں گی۔ آپ اُن کو سمجھائیں۔

مولانا صاحب نے فرمایا، تیرے دونوں بیٹے ٹھیک کر رہے ہیں۔ اماں تو نے آج تک بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم تو دلا دی لیکن مسجد کا راستہ نہیں دکھایا۔ مسجد میں اللہ کے حضور جھکنے والی پیشانیاں ہی ماؤں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ دنیادار تو اسی دنیا کے پُرفریب جالوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ وہ دولت، جائیداد اور آسائشیں اکٹھی کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ اگر تو نے اپنے بیٹوں کو قرآن کی تعلیم دی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

صرف یہ ماں ہی نہیں سبھی مائیں اپنے بچوں کو لاڈ پیار سے پالتی ہیں۔ ان کے ناز نخرے برداشت کرتی ہیں۔ کبھی شکوہ شکایت زبان پر نہیں لاتیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر ماں گھرانے پر آنے والے مشکل حالات میں دنیا کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ گھرانے کو مشکلات و آزمائش سے نکال لاتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اُس کی تعریف و تحسین نہیں کی جاتی، کوئی بیٹا ماں کے لیے پھولوں کے گجرے نہیں لاتا، جوتے اور کپڑوں کا تحفہ نہیں دیتا، حتیٰ کہ ۲۴ گھنٹے میں سے صرف پانچ منٹ بھی ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ یقین مانیے ماں وہ ہستی ہے جو اپنے بچوں کے لیے پلاؤ، زردے، قورمے، چکن اور لذیذ کھانے پکاتی ہے مگر سب کچھ اپنی اولاد کو کھلا کر خود بچا کھچا کھانا کھاتی یا ہانڈی میں ''پوچا'' مارتی نظر آتی ہے۔ یا چٹنی سے کھانا کھا کر صبر شکر کرتی ہے۔

ماں فکرمندی، انتظار اور دعاؤں کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ اس دنیا میں ماں سے زیادہ بے لوث ہستی کوئی نہیں۔ جس جنت کی تلاش میں آج ہر انسان سرگرداں ہے وہ تو ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اس لیے ماں کو ہمیشہ ساتھ رکھو، اس سے بات چیت کرو، اس کی دلجوئی کرو، دن رات اس کا خیال رکھو، اُسے اعلیٰ معیار کا کھانا، دودھ، پھل لا کر دو، روزانہ اس کی ٹانگیں دباؤ، سر کی مالش کرو، اس کے فرماں بردار بن کر اس کی دعائیں لو کیونکہ اگر آپ پوری دنیا کو خوش نہیں رکھ سکتے تو نہ رکھیں صرف اپنی ماں کو خوش رکھیں، وہی پوری دنیا ہے!

انسانی نفسیات پر تحقیق کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ماں کی آواز ذہنی دباؤ سے نجات دیتی ہے، چاہے وہ فون پر ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس آواز میں نرمی، چاہت اور شیرینی ہوتی ہے۔ اس آواز میں لالچ اور خود غرضی شامل نہیں ہوتی چنانچہ یہ سننے والے کے لیے محبت و راحت اور سکون کا باعث بنتی ہے۔

ماں کے بارے میں یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ ماں اگر بڑھاپے میں ذہنی توازن کھو دے یا اس کی یادداشت پر بُرا اثر پڑے تو وہ پھر بھی اپنی اولاد کو پہچانتی اور یاد رکھتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی ماں کی طرف سے کبھی بھی غفلت و سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اپنا پیسا اور آرام ماں پر نچھاور کر دیں کیونکہ یہ روٹھ جاتی ہے تو دعائیں بند ہو جاتی ہیں پھر نرم ملائم تکیے اور ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بھی نیند نہیں آتی۔ ◆◆◆

دلدل

سعدیہ بتول

دورِ جدید کی مصنوعی زندگی سے عاجز آئی لڑکی کا منفرد فسانہ

سیاہ رنگ کی نئی ٹویوٹا کرولا صاف شفاف سڑک پر مناسب رفتار سے چلتی جا رہی تھی۔ سورج غروب [ہو]نے میں کچھ ہی دیر باقی تھی اور وہ اپنی مدہم روشنی کے ساتھ [گا]ڑی کے ہمراہ دوڑ رہا تھا۔ زرد رنگ کے فٹ بال کی مانند [اُچ]ھلتا ہوا کبھی درختوں میں چھپ جاتا اور جہاں درختوں کے [جھ]نڈ کم ہوتے نکل آتا۔ دوسری سمت چاند ایک دھبے کی مانند [نظر] آ رہا تھا بجھا ہوا اور بے نور۔ شاید وہ اپنی باری کا منتظر تھا کہ [کب] سورج پہ زوال آئے اور اس کی روشنی کا دور شروع ہو۔ [...] کے نیچے کسی نہ کسی کی شکست کی راکھ ضرور پنہاں ہوتی [...] کسی ایک کا ہارنا ہی دوسرے کی کامیابی کا مژدہ سناتا [...] یہی قانونِ فطرت ہے اور حقیقت سے کسی کو مفر نہیں۔

مناہل اسی آنکھ مچولی میں کھوئی ہوئی تھی اور کچھ وقت کے لیے اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہو گئی۔ یکدم گاڑی نے بریک لگائی۔ جھٹکا لگنے کے سبب اس کا سر سامنے والی سیٹ سے جا ٹکرایا۔ ''کیا کرتے ہو نور بابا''؟ وہ بے اختیار چلائی۔

''کیا کروں بیٹا گاڑی کے سامنے اچانک کتا آ گیا تھا۔ میں نہ رکتا تو اس سے ٹکرا جاتا''۔ ''اچھا اب آگے دھیان دیں''۔

وہ جانتی تھی کہ اب اگلا لیکچر جانوروں سے ہمدردی پر ہو گا اور بہت طویل بھی لہٰذا جلدی سے بات ختم کر دی۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ آسمان کے کناروں پر پھیلی

سرخی شام کی نیلی چادر اوڑھ رہی تھی۔ اسے قدرتی مناظر بہت اچھے لگتے تھے۔ جب کبھی کہیں سیر و تفریح کے لیے جانے کی بات ہوتی تو باقی سب جدید دور کی جگہوں کے نام لیتے۔ کسی شاپنگ مال یا فاسٹ فوڈ کورٹ جانے کی بات ہوتی کبھی کسی سینما یا میوزک کنسرٹ کے نام قرعہ فال نکلتا۔ وہ ایسے موقعوں پر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر الگ ہو جاتی۔ اسے مصنوعی دنیا میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی تھی۔ وہ تو فطری حسن کی شائق تھی۔

سب اس کا مذاق اڑاتے، کوئی کہتا اسے کسی حبس زدہ لائبریری میں چھوڑ آؤ تو کوئی کہتا، منابل میری مانو تو کوئی گیروا چولا پہنے کسی دربار کے ملنگوں میں شامل ہو جاؤ۔ وہ یہ سب باتیں سن کر ہولے سے مسکرا دیتی۔ کسی سے ناراض بھی نہ ہوتی کیونکہ وہ سب اس کے اپنے تھے، اس کے بہن بھائی تھے۔ اس کی سوچیں پسند ناپسند اور عادات شروع سے کچھ مختلف سی تھیں۔ اس کی بہنیں سامعہ اور رمشا جدید دور کے تقاضوں سے مطابقت رکھتی تھیں۔ چھوٹے بھائی شمعون کی بھی سامعہ اور رمشا سے ہی زیادہ بنتی۔ وہ لوگ اپنے ہلے گلے کے منصوبوں میں اسے شریک کرنے کی کوشش ضرور کرتے لیکن وہ کم ہی ان کا ساتھ دیتی۔ ''کل سے کالج بھی جانا ہے۔ گھر پہنچوں تو جلدی سے اپنی کتابیں اور سب چیزیں ڈھونڈ کر رکھوں۔ اتنے دن ہو گئے گھر سے دور ہوں۔ کام والی نے کمر اصاف کرتے ہوئے کہیں میرے نوٹس نہ گم کر دیے ہوں''۔ اس کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ دراصل اتنی جلدی میں اسے گھر سے نکلنا پڑا تھا کہ اسے اپنی چیزیں سنبھالنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ کالج سے جس روز چھٹیاں ہوئیں، اسی دن نانی اماں کا فون آ گیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں، جلدی سے آ جاؤ۔

منابل تو ان کی آواز میں گھلی اداسی محسوس کر کے بے چین ہو گئی اور اگلے ہی دن لاہور جانے کا منصوبہ بنا لیا۔ وہ تو امی کو بھی بلانا چاہتی تھیں لیکن ان کے اپنی دوستوں کے ساتھ انہی دنوں کچھ تقاریب میں جانے کے منصوبے بنے ہوئے تھے اور وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتی تھیں، لہٰذا منابل کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ نانی اماں بھی اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ منابل کو ان سے پرانے وقتوں کے قصے سننے میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ گئی تو تین چار دن کے لیے تھی لیکن پورے دس دن رہ کر آئی۔ اس کے لیے پرانے زمانے کی باتوں میں عجیب سی کشش تھی۔ اس کی انہی دلچسپیوں کے سبب سب اسے بڈھی روح کہہ کر چھیڑتے۔ کبھی کبھی تو ممی بھی پریشان ہو کر کہتیں کہ اپنے ہم عصروں سے اتنی مختلف لڑکی زمانے کے ساتھ کیسے چلے گی؟ اپنی الگ طبیعت کے سبب کہیں دنیا سے کٹ کر نہ رہ جائے۔ انہی اندیشوں میں گھر کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں لیکن بے سود۔

یہ نہیں کہ اس میں کوئی برائی تھی بلکہ وہ تو بہت حساس اور سب کا خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔ گھر پہنچی تو ممی پاپا اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ بابا بولے ''ہماری بیٹی تو لگتا ہے جا کر ہمیں بھول ہی گئی تھی''۔ ''نہیں پاپا دراصل نانی اماں کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اور اکیلے رہ کر وہ بہت اداس ہو جاتی ہیں''۔ ''دیکھا تم نے ہماری بیٹی کتنے احساس والی ہے''۔ پاپا نے فخریہ انداز سے ممی کی جانب دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیں۔ اتنے میں رمشا، سامعہ اور شمعون بھی شور مچاتے آ گئے۔ آج شام مشی کی سالگرہ تھی اور وہ سب وہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ممی نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن اس نے تھکاوٹ کا بہانہ کر کے اپنے کمرے کا رخ کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر چھائے ہوئے خاموشی سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ سب جا چکے ہیں۔

مشی اس کے چچا کی بیٹی اور ممی پاپا کی بھی چہیتی تھی لہٰذا اس کی سالگرہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اسے بھی چچا کی فیملی سے بہت پیار تھا لیکن اس طرح کی تقریبات میں جا کر وہ بور ہوتی تھی۔ سب ایک دوسرے سے زیادہ ماڈرن دکھائی دینے کے لیے عجیب و غریب فیشن کرتے۔ خواتین اپنے برانڈڈ جوتوں، پرس اور کاسمیٹکس کی بڑھ چڑھ کر نمائش کرتیں، اس بات

قطعاً بے نیاز کہ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ کس قدر اوچھی اور غیر مہذب لگ رہی ہیں۔ اس طرح کی گفتگو کا مقصد محض دوسروں پر اپنی امارت کا رعب ڈالنا اور انہیں حسد میں مبتلا کرنا ہوتا تھا۔

سب ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لیے بے تحاشا پیسا لٹاتے لیکن کوئی بھی مطمئن نہ ہوتا۔ مرد جائیداد اور بزنس معاہدوں کی باتیں کرتے اور عورتیں اپنے طور پر دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتیں۔ اس کی ممی بھی آج دبئی سے لائی ہوئی جیولری پہن کر گئی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح موضوع چھیڑیں گی اور لوگوں کو اس بارے میں ضرور بتائیں گی۔ سامعہ اور رمشا اپنے برانڈڈ جوتوں اور ہینڈ بیگز پر اترا رہی ہوں گی۔ اسے ان چھچھوری حرکتوں کا تصور کر کے گھن سی آنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ رشیدہ سے چائے کا کہہ کر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ تھوڑی دیر سکون سے گزارنا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جانے والوں کی واپسی بہت پرشور اور سکوت شکن ہو گی۔ وہ لوگ جتنے اتراتے ہوئے گئے ہیں، اتنے ہی پشیماں واپس آئیں گے۔ باقی سب لوگوں کے لباس اور ناز و انداز دیکھ کر اپنا آپ کمتر لگنے لگے گا۔ واپسی پر بیویاں شوہروں سے منہ پھلائے ہوں گی اور شوہر دوسروں کی بیویوں کے حسن و ادا کے گرویدہ ہو کر اپنی بیویوں سے نالاں نظر آئیں گے۔ جوان طبقے کے اپنے مسائل تھے۔ سب لوگ بہت کچھ ہونے کے باوجود تہی دست تھے۔ ان کے پاس سب کچھ تھا سوائے قناعت اور سکون قلب کے۔

بھیڑ چال کا حصہ بن کر یہ سب اپنا آپ فراموش کر چکے تھے۔ ہر کوئی دوسروں کو مرعوب کرنے کی فکر میں نیندیں حرام کیے ہوئے تھا لیکن مجال ہے کہ کوئی کبھی کسی کی تعریف کر دے۔ کسی ہوٹل میں چلے جاتے تو تب تک لقمہ نہ لیتے جب تک تصویر لے کر فیس بک پر نہ لگا دی جاتی۔ کوئی نئی چیز خریدی جاتی تو تشہیر کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی۔ چاہے ذوق ہو یا نہ ہو باہر ملکوں کے مہنگے ٹکٹ لے کر ضرور باہر کا ٹور کرتے، محض دوسروں کو جلانے کے لیے۔ بوڑھے جوان عورتیں مرد سبھی انہی کوششوں میں غلطاں تھے۔ کوئی بھی خود سے اور اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھا۔

مہنگے برانڈز کی چیزیں خواہ سوٹ نہ بھی کرتی ہوں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ضرور استعمال کی جاتیں۔ ہر بھونڈا فیشن کرنا ضروری تھا خواہ اس کے لیے جو بھی کرنا پڑے۔ مسابقت کی دوڑ میں محبت اور اپنائیت جیسی قدریں کہیں کھو گئی تھیں۔ جہاں چار لوگ جمع ہوتے دوسروں کا مذاق اڑانے اور اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننے کے سوا کوئی موضوع نہ ہوتا۔ اس ماحول سے اوب کر اس کے پاس پڑھائی میں گم ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اچھے مارکس لیتی تھی۔ معاً اسے یاد آیا کتنے دنوں سے میل چیک نہیں کی۔ یہ خیال آتے ہی وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔ ''ارے واہ! میرا ایڈمیشن ہو گیا''۔ امریکن یونیورسٹی کی میل پڑھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کئی ہفتے پہلے بھیجے گئے داخلہ فارم کو تو وہ بھلا ہی چکی تھی۔ ویسے اسے داخلہ ہونے کا اتنا یقین بھی نہیں تھا۔ اب اس حیران کن خبر نے اسے سرشار کر دیا۔ پڑھنے کا شوق اپنی جگہ لیکن درحقیقت وہ اس دوغلے ماحول سے دور جانا چاہتی تھی۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ جھوٹ اور بناوٹ سے دامن چھڑا کر سچائی کے ساتھ جینے کے لیے اس کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔

نمود و نمائش کی دلدل میں دھنسے لوگوں کو نہ تو وہ نکال سکتی تھی نہ ہی خود ان کا حصہ بن سکتی تھی۔ منابل کے گھر والوں کو یقیناً اس کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا بلکہ انہیں تو ''شو'' مارنے کے لیے ایک اور جواز مل جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ●●●

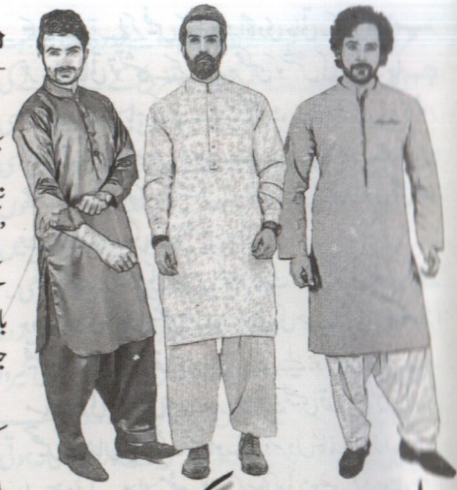

وارث جب کرپٹ ہو جائیں

مصباح الایمان صدیقی

جب سے پاناما لیکس کا معاملہ سامنے آیا ہے پاکستان میں کرپشن کے خلاف طوفان میں بڑی شدت آچکی۔ یہ الگ بات کہ بے ایمانی کرنے والے کئی اہم کردار بھی کرپشن کے خلاف مہم میں آگے آگے ہیں۔ پاکستان میں متفقہ رائے بن چکی کہ اگر بالائی طبقات سے کرپشن ختم ہو جائے تو پھر اس کے اثرات نیچے تک پہنچیں گے اور کرپشن کا مکمل خاتمہ ممکن ہو سکے گا لیکن میرے خیال میں یہ نظریہ درست نہیں۔ اسلامی تعلیمات بھی یہ سکھاتی ہیں کہ فرد کی اصلاح سے کام کا آغاز کیا جائے۔ اگر معاشرے کے افراد اور خاندانوں میں ہی بگاڑ ہو گا تو وہی صورت پیدا ہو جائے گی کہ جس عمارت کی بنیاد ہی ٹیڑھی رکھی گئی وہ آسمان تک بھی پہنچ جائے تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔

بالائی طبقات میں کرپشن روکنے کے لیے پہلے دس سال تک ایک لیڈر کا احتساب ہوتا رہا، قانونی اسقام اور بے نیازانہ پیروی کے نتیجے میں وہ تمام مقدمات سے بری ہو کر آج ''مسٹر کلین'' بنے بیٹھے ہیں۔ اب ایک اور مقتدر لیڈر اور اس کے خاندان کا احتساب جاری ہے مگر نااہل ہو جانے کے باوجود اب تک کرپشن یا عہدوں کے ناجائز استعمال کا کوئی جرم سامنے نہیں آسکا۔

اب ہم آتے ہیں اپنے اصل موضوع یعنی گھر گھر جاری کرپشن کی طرف۔ یہی کرپشن وہ بنیاد ہے جو افراد کو خاندان کی سطح پر بے ایمانی کرنا سکھاتی ہے۔ پھر وہ یہاں سے یہ درس حاصل کر کے زندگی کے جس شعبے میں بھی اور جس سطح تک بھی جائیں، یہ بنیادی تربیت ان سے ہر جگہ کرپشن کے کارنامہ ہائے عظیم سرزد کرواتی ہے۔ آپ شاید سمجھ گئے ہوں، یہ کرپشن وراثت کی غیر منصفانہ تقسیم سے جنم لیتی ہے۔

اس موضوع پر مجھے آج تک کوئی خاص تحریر نظر نہیں

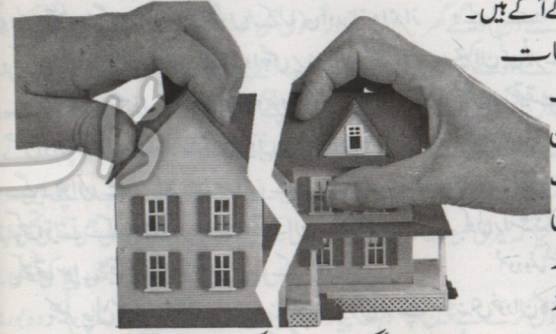

ہنستے بستے گھروں کے ٹکڑے کر کے رکھ دینے والی کرپشن کی ان کہی کہانی

آئی بس کبھی کبھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواتین کے ساتھ اس سلسلے میں زیادتی ہو رہی ہے لیکن درحقیقت یہ صرف یہیں تک محدود نہیں۔ اکثر بھائیوں میں سے بھی چند محرومی کا شکار رہتے ہیں۔ بعض خاندانوں میں بڑا بیٹا جائیداد پر قابض ہو جاتا ہے۔ کئی خاندانوں میں جہاں بڑے بیٹے شادیوں کے بعد علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، وہاں چھوٹا بیٹا جو والدین کے ساتھ ہوتا ہے، وہی کل جائیداد پر قابض ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی بات ہو تو کہتا ہے کہ والدین کے آخری دور میں خدمت بھی تو میں نے اور میرے بال بچوں نے ہی کی ہے۔ اگر بھائی بہنوں میں سے کوئی خدمت کے نام پر آکر کچھ وقت رہتا بھی تھا تو اس کا کھانے پینے، رہنے سہنے کا خرچہ بھی تو میں نے ہی کیا ہے۔

اس دلیل کے ساتھ وہ نہ صرف جائیداد بلکہ والدین کی ہر ہر ایک ایک چیز پر بھی قابض ہو جاتا ہے اور باقی بہن بھائی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کوئی اس سے یہ کہنے کی ہمت نہیں کرتا کہ جس نے جو خدمت کی ہے، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے۔ خدمت ایک نیکی ہے لیکن اس کا وراثت کی تقسیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح حکم دیا ہے کہ کس کس کو کتنا حصہ ملے گا۔ ساتھ ایسی کوئی شرائط نہیں کہ کس نے کتنی خدمت کی ہے یا کون زیادہ قریب تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا گیا کہ جو بیٹا یا بیٹی نافرمان تھا، اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ عاق وغیرہ کا بھی اسلام میں کوئی تصور نہیں۔

بعض صورتوں میں والدین شریعت کے مطابق صحیح تقسیم کی وصیت کر جاتے ہیں لیکن اس کو ایک طرف رکھ کر من مانی کو ہی انصاف بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں کبھی یوں ہوتا ہے کہ والدین سے زبردستی اپنی مرضی کی وصیت لکھوالی جاتی ہے۔ عمر رسیدہ والدین جس بیٹے کے ساتھ رہ رہے ہوں، اس کے مکمل قبضے میں ہوتے ہیں۔ عموماً بیماری کا دور ہوتا ہے۔ انہیں ایک ایک دوا اور مخصوص خوراک کے لیے اسی کی طرف دیکھنا ہوتا ہے چنانچہ ان کی حالت قیدی کی سی ہو جاتی ہے جس کی اپنی مرضی اور اختیار مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ جائیداد پر قبضہ کرنے سے پہلے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے والدین پر حکومت شروع کر دی جاتی ہے پھر غیر محسوس طریقے سے باقی بہن بھائیوں کے علم میں لائے بغیر ایک طرح سے یرغمال بنے والدین سے من پسند وصیت زبردستی لکھوالی جاتی ہے۔

سابق چیف جسٹس پاکستان، افتخار چودھری کے خواجہ سراؤں پر کافی احسانات ہیں۔ انہوں نے ان کی بحالی کے لیے ہر ممکن فیصلے دیے۔ ایک فیصلے میں یہ حکم دیا گیا کہ انہیں جائیداد میں شریعت کے مطابق حصہ ملنا چاہیے۔ تبھی میں نے سوچا تھا کہ خواجہ سرا تو ایک طرف یہاں تو پہلی اور دوسری جنس کی اکثریت بھی جائیداد میں اپنے صحیح حق سے محروم ہے۔ اس کے متعلق کون فیصلہ دے گا؟

قبل ازیں زبردستی والدین سے تحریر لکھوانے کی بات آچکی۔ یہ بھی کوئی ایسا معاملہ نہیں جس سے قرآن حکیم کا فیصلہ (نعوذ باللہ) ساقط ہو جاتا ہے لیکن بات کون کرے؟ لازمی بات ہے کہ جس کے پاس جائیداد ہے، وہی سب سے تگڑا ہے اور ''مائٹ از رائٹ'' دنیا کی تسلیم شدہ حقیقت۔ بہنیں اور عموماً بھائی بھی مسلسل بحثیں کر کر کے تھک جاتے ہیں۔ قریبی تعلقات اور رشتوں کی زنجیروں میں بندھے ہوئے یہ مظلوم بالآخر جگ ہنسائی کے ڈر سے خاموش ہو جاتے ہیں۔ عدالت وغیرہ تو دور کی بات، پنچائیت تک پہنچنے کی بھی کسی میں جرأت اور ہمت نہیں ہوتی۔ جب اپنے ہی قریبی عزیز ظلم پر کمربستہ ہو جائیں تو فریاد کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے، یعنی:

کرے محروم حق یاں کس سے شکوہ
چہیتے، لاڈلے غاصب ہیں اپنے

یہ معاملہ تو اکثر سامنے آتا ہے کہ جائیداد میں بہنوں کو

حصہ نہیں دیا جاتا۔ وجہ یہی اُوپر بیان کردہ مسئلہ کہ طاقتور بھائیوں کے سامنے زبان کون کھولے؟ اس صورت میں جائیداد صرف بھائیوں کے نام کی جاتی ہے۔ بھری محفل میں ایک بھائی اٹھ کر کہتا ہے کہ بھئی بہنیں تو ہمیشہ بھائیوں کا مان رکھتی اور ان کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار رہتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اب بھی آپ کوئی جھگڑا نہیں کریں گی اور اپنی مرضی اور رضامندی سے بھائیوں کے حق میں جائیداد سے دستبردار ہو جائیں گی۔ بہنوں کے دل میں چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن وہ سر جھکا اور دم سادھ لیتی ہیں۔ پھر وہی بھائی دوسرے بھائی سے کہتا ہے (تحریر پہلے سے تیار ہوتی ہے) چلو بھئی جلدی کرو، ان کے انگوٹھے لگوا لو۔ پھر کچہری بھی جانا ہے، دیر ہو رہی ہے۔ اس طرح چشم زدن میں جائیداد کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ بہنیں اپنی اور اپنے بچوں کی ساری زندگی کی محرومی کے سٹامپ پر دستخط کر دیتی ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بہنیں اکثر معاملات میں قطعی طور پر اپنی مرضی کے خلاف فیصلہ تسلیم کر لیتی ہیں۔ یہ فیصلہ اکثر صورتوں میں ان کی رضامندی سے نہیں ہوتا بلکہ زبردستی کروایا جاتا ہے، خواہ الفاظ انتہائی محبت بھرے اور خوبصورت ہی ہوں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی صورت ممکن ہے کہ مظلوم بہنیں یا بھائی بھی اپنے دل کی بات کھل کر ظاہر کر سکیں؟

اب ہم آتے ہیں اس مسئلے کے ممکنہ حل کی طرف۔ میں اپنی تجاویز بیان کرتا ہوں۔ قارئین کو بھی دعوت ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی بہتر حل ہو تو اُسے سامنے لائیں تاکہ اس سنگین ظلم اور ناانصافی کے خاتمے کے لیے تحریک کا آغاز ہو سکے۔ یہ مسئلہ پیچیدہ اور گمبھیر ہے اور اس کا حل کوئی سادہ یا آسان سا نہیں، بلکہ حکومتی سطح پر خاصے بڑے اقدامات کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا جائے جو محکمہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا واحد مجاز ادارہ ہو۔ یہ سرٹیفکیٹ صرف اسی صورت جاری کیا جائے جب فوت شدہ کی جائیداد کی مکمل مصدقہ تفصیلات، ورثا کی تعداد اور جنس کی تصدیق کے ساتھ (نادرا کا ریکارڈ بھی معاون ہو سکتا ہے) اور ورثا کو جائیداد سے ملنے والے حصے کی مکمل تفصیل موجود ہو۔ غلط اور نامکمل معلومات دینے کی صورت میں مناسب سزا کا تعین کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے علیحدہ عدالتیں بھی قائم کی جا سکتی ہیں۔ ان تمام اقدامات کی میڈیا پر مسلسل تشہیر کی جائے۔

یہاں بھی یہ مسئلہ آ جاتا ہے کہ اگر خواتین سے زبردستی رضامندی نامے لکھوا کر لف کیے گئے ہوں تو ان کو انصاف کیسے ملے گا؟ ایک حل یہ ہے کہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے قبل پیش ہونے والوں سے خواتین کی رضامندی سے متعلق سوال کیے جائیں۔ اگر سوالوں کے جواب اطمینان بخش نہ ہوں تو خواتین کو بھی طلب کر کے ان سے استفسار کیا جائے۔ اس سلسلے میں مزید بہتر اقدامات بھی تجویز کیے جا سکتے ہیں مثلاً کچھ خواتین اہل کار گھروں میں خود جا کر بھی تصدیق کا فریضہ انجام دے دیں۔ ہر شہر اور قصبے میں ہر روز، ہفتے یا مہینے میں فوت ہونے والوں کا عموماً ایک اوسط ہوگا۔ اس کے مطابق محکمے کے عملے کی تعداد متعین ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ خصوصاً خواتین کو بھرپور قانونی تحفظ بھی فراہم کیا جائے تاکہ عدم رضامندی ظاہر کرنے کی صورت میں ان پر گھروں میں تشدد وغیرہ کے خدشات باقی نہ رہیں۔

مندرجہ بالا اقدامات کو قانونی ماہرین بہتر شکل دے سکتے ہیں۔ میرا مقصد تو ایسے سنگین مسئلے کی طرف توجہ دلانا ہے جس کے سبب کئی گھروں میں ناانصافی ہو رہی ہے اور کرپشن کی درس گاہیں کھلی ہیں۔ ناجائز طور پر اپنے حق سے زیادہ حاصل کرنے والے افراد اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ہر میدان میں اپنے دوسرے قریبی عزیزوں سے آگے رہیں اور بالآخر ان حکومتی عہدوں تک پہنچ جائیں جہاں وہ کھل کر خاندانی درس گاہ سے سیکھے ہوئے کرپشن کے سبق سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ●●●

انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں نے حقیقت اور تصورات کو گڈمڈ کر دیا

مردہ شوہر کا ہاتھ

مہر افروز

میکس میں اور میرا چودہ سالہ بیٹا ٹینر (Tanner) کو ہم سے بچھڑے پورا ایک سال بیت چکا تھا۔ بہت غم سے گزر رہے تھے۔ آج میکس کی پہلی برسی کے موقع پر جب میں ہاتھ دھونے غسل خانے میں گئی تو آئینہ دیکھ کر چونک گئی کیونکہ وہاں کسی ہاتھ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا ہاتھ جو شاید پاؤڈر سے بنا ہوا تھا۔ میں نے چلانا شروع کر دیا:

''ٹینر، جلدی آؤ۔ جلدی آؤ!''

ٹینر بھاگتا ہوا آیا اور پوچھا: ''امی جان آپ ٹھیک تو ہیں؟ کیا ہوا؟''

میں نے اُلٹا اُس سے سوال پوچھا ''ٹینر، تم نے تو یہ ہاتھ نہیں بنایا؟''

ٹینر کبھی مجھے اور کبھی آئینے کو حیرت سے تک رہا تھا۔ جب میں ٹینر سے سوال کر رہی تھی تو اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ یہ بیٹے کا ہاتھ نہیں کیونکہ وہ اُس سے بہت بڑا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہم ماں، بیٹا پوری دوپہر ایک ساتھ صحن میں بیٹھے رہے تھے۔ جب میں نے بغور مشاہدہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہاتھ

میرے شوہر میکس کا ہے۔ اُس کی ہتھیلی اور انگلیاں بالکل ویسی ہی تھیں۔ میں نے ٹینر سے پوچھا ''کیا تمہیں لگتا ہے کہ اس کا تعلق تمہارے ابو سے ہے؟''

ٹینر نے جواب دیا ''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر ایسا کیسے ممکن ہے؟''

ٹینر چلا گیا' تو میں نے جلدی سے کیمرا اُٹھایا اور اُس ہاتھ کی کچھ تصاویر لے لیں۔ ابھی میں مزید لینا چاہتی تھی مگر اچانک ہاتھ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں کسی سے کچھ چھپانے کی عادی نہ تھی لیکن اس واقعے نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا کہ میں کسی کو کیا بتاؤں۔ میں پختہ ارادہ کر چکی تھی کہ اس معاملے کی تہ تک جاؤں گی۔ یہ واقعہ ۸ مئی ۲۰۰۵ء کو میرے ساتھ پیش آیا۔ اس انوکھے حادثے نے میری تخیلاتی دنیا میں ہلچل برپا کر دی۔

ابھی میری اور میکس کی شادی کو چار سال ہی گزرے تھے جب ہمیں پتا چلا کہ چھپن برس کی عمر میں شوہر کو غذائی نالی کا کینسر ہو چکا۔ ان دنوں میں سکیرامینٹو بی (Sacramento Bee) اخبار میں کام کرتی تھی۔ میکس کے اصرار پر میں نے اپنی ملازمت جاری رکھی۔ میں اکثر دوپہر کا کھانا میکس اور ہیلن کے ساتھ اپنے گھر پر ہی کھاتی تاکہ میکس کے ساتھ وقت گزار سکوں۔ میکس نے اپنی زندگی کے آخری دو مہینوں کا زیادہ وقت ہیلن کے ساتھ گزارا۔ ہیلن نہ صرف گھر کی دیکھ بھال کرتی بلکہ ہماری بہترین دوست بھی تھی۔

میکس کی موت کے بعد ہیلن نے بتایا کہ ایک دن وہ اور میکس باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا کہ اچانک وہ بادلوں کی لپیٹ میں آیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہیلن اور میکس دونوں سورج کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی لمحے ہیلن نے میکس سے کہا ''میں جانتی ہوں کہ تم خدا پر یقین نہیں رکھتے مگر ایسی چیزیں خدا نے ہمارے غور و فکر کے لیے بنائی ہیں۔ سنو میکس! جب تم اس دنیا سے چلے جاؤ گے اور اگر تم دوسری دنیا میں ایسی چیزیں دیکھو جو لافانی اور لامتناہی ہیں یا تمہیں بہت منفرد لگیں تو تم ہمیں بتانے کے لیے ضرور آنا۔ اگر تمہیں وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ملے تو.....''

میکس متفق ہو گیا اور بولا ''تم دونوں دیکھنے کی ہمت کرنا' میں کوشش کروں گا.....''

اب میکس کو ہم سے بچھڑے پورا ایک سال گزر چکا تھا۔ ہم ماں بیٹا صحن میں بیٹھے تھے۔ ہماری رہائش سیکرامنٹو کیلی فورنیا میں تھی۔ ٹینر کے وجود سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ وہ بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ پڑھائی کے دوران اس کے ہونٹوں کی جنبش اور مختلف زاویے مجھے مسکرانے پر مجبور کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں اٹھی اور کھانے کا سامان لینے اندر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ہماری گھڑی پونے ایک پر رکی ہوئی تھی اور یہ میکس کی موت کا وقت تھا.....

یہ پہلا غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ مئی ۲۰۰۴ء میں جس دن میکس چل بسا' ابھی دوست' احباب ہمارے گھر میں تھے کہ گھر میں لگی ہوا سے بجنے والی گھنٹیوں کی جھنکار سنائی دی۔ تمام لوگ اُدھر دیکھنے لگے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گہرے غم کی آواز اُن سے نکل رہی ہو لیکن جو چیز میرے لیے باعث غور تھی وہ یہ کہ بنا ہوا کے گھنٹیاں بج کیسے رہی ہیں؟

اسی طرح میں نے دو' چار بار دیکھا کہ ہماری گھڑی عین اس وقت رک جاتی ہے جس لمحے میکس دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ کیا میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ میکس ہی تھا جو ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا تھا؟ گھڑی بدھ والے دن دوبارہ چلنا شروع ہوئی۔ جب ہیلن چھٹیوں کے بعد واپس آئی تو اس نے بتایا کہ کتنی بار اُس کی موجودگی میں گھر کی بتیاں خود بخود جلتیں اور بند ہو جاتیں.....

میکس کی بیماری کا پتا چلنے سے پہلے ہم نے اٹلی جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میکس بہت پرجوش تھا کیونکہ وہ اطالوی شعراء اور موسیقاروں سے واقف تھا۔ میں نے ٹینر سے کہا ''ہم میکس

کی خاطر اٹلی ضرور جائیں گے اور اس کا یہ خواب پورا کریں گے۔'' ٹینر نے میری تجویز پر رضامندی ظاہر کی۔ سیر کے علاوہ میرا مقصد ٹینر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اور ان تمام معاملات کی تہ تک جانا تھا جو میرے ساتھ پیش آ رہے تھے۔

ہم دونوں روم گئے' فلورنس بھی دیکھا۔ میں نے گزشتہ واقعات بھلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس دن میں اور ٹینر اطالوی رویرا (Italian Riviera) میں تھے۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ اس کی مدھم روشنی بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنا کیمرا ایک راہگیر کو تھمایا اور گزارش کی کہ وہ میری اور ٹینر کی تصاویر بنا دے۔ اس نے ہماری دو تصاویر بنائیں۔

گھر پہنچنے کے بعد ہم نے تصاویر کے پرنٹ لیے اور بڑے شوق سے دیکھنے لگے۔ ایک تصویر پر میری نگاہیں جم گئیں۔ یہ وہی تصویر تھی جو اس راہگیر نے بنائی تھی۔ ٹینر اور میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ہمارے پیچھے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایک کشتی دکھائی دے رہی تھی اور اس کے اوپر کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ بالکل میرے اور ٹینر کے کندھوں کے درمیان تھا۔ جب میں نے غور سے پڑھنے کی کوشش کی تو مجھے تین حروف دکھائی دیے۔ وہ یہ تھے (MAX) یعنی میرے شوہر میکس بسلر کے نام کا پہلا حصہ!

اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس حوالے سے کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ میں سائنسدانوں' پروفیسروں اور روحانی بابوں سے ملنے کے لیے ملکوں ملکوں گھومی۔ خود کو سیدھا راستہ دکھانے میں اور سچائی کی کھوج میں مجھے آٹھ سال لگ گئے۔

ہوا یہ کہ میں ایک ماہر نفسیات' ریڈن سے ملنے گئی۔ ریڈن نے بتایا کہ جب کسی انسان سے اس کا پیارا جدا ہو جائے' تو روزمرہ زندگی میں وقتاً فوقتاً متوفی سے وابستہ اشیاء دکھائی دینے لگتی ہیں۔ عموماً یہ انسانی دماغ کی کارستانی ہوتی ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پریشانی کے عالم میں دماغی قوتیں انسان کو مافوق الفطرت واقعات دکھانے لگتی ہیں جن کا حقیقت سے واسطہ نہیں ہوتا۔

جب میں ریڈن (Raddin) کے دفتر سے نکلی تو حیران تھی کہ کیسے میکس کی موت نے مجھے نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ ڈالا اور اس کے اتنے گہرے اثرات میرے اوپر آئے کہ میں کافی حد تک ابنارمل ہو گئی۔ جب میں نے ہاتھ کے عکس کے حوالے سے سوال کیا تو ریڈن نے کہا کہ وہ اس طرح کے واقعات پر کتاب لکھ سکتا ہے جو بظاہر جادوئی لگتے ہیں مگر ان کا خالق ہمارا دماغ ہے۔ اس کے تجزیے کی رُو سے دنیا میں ۶۷ فیصد مرد و زن نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں جن میں بیوائیں شامل ہیں اور نوجوان بھی!

جس مسئلے کو میں خاص سمجھ رہی تھی' مجھے پتا چلا کہ وہ انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ امریکا میں تو ہر تیسرا' چوتھا شخص ایسے مسائل کا شکار ہے۔ میں نے سوچا کہ میں خاموش نہ رہوں اور کھل کر اس پر بات کروں لہٰذا میں نے قلم اٹھایا اور اپنے واقعات قلمبند کر دیے۔ ◆◆◆

حاضر جوابی

وہ اُن کی ازدواجی زندگی کا پہلا جھگڑا تھا، دونوں ایک دوسرے پر خوب چیخے۔ جب گلا بیٹھنے لگا تو شوہر نے کہا، ''تم کہتی ہو کہ کئی آدمی تم سے شادی کے خواہش مند تھے۔'' ''ہاں، میں اب بھی یہی کہوں گی۔'' بیوی نے جواب دیا۔ ''کاش تم نے پہلے بے وقوف سے شادی کر لی ہوتی۔''

''میں نے یہی کیا ہے۔'' بیوی تنک کر بولی۔

خاکہ

کراچی کے مولانا سیفی

نامور عالمِ دین اور کارکن تحریکِ پاکستان کی دلنواز جگ بیتی

شاہ محی الحق فاروقی

۴ مارچ ۱۹۹۰ء کو کراچی کے ایک روزنامے میں ''محمد منصور خاں وسوگواران'' کی جانب سے ایک مختصر اشتہاری اطلاع شائع ہوئی:

''یہ خبر تمام دینی وسیاسی حلقوں میں بڑے افسوس سے سنی جائے گی کہ ممتاز عالمِ دین اور تحریکِ پاکستان کے نام ور کارکن اور رفیقِ قائدِ اعظم مولانا سید سیفی ندوی طویل علالت کے بعد بروز جمعہ ۲/مارچ ۱۹۹۰ء انتقال فرما گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے مسجد آرام باغ میں بروز اتوار ۴/مارچ ۱۹۹۰ء بعد نمازِ عصر قرآن خوانی و فاتحہ سوئم مقرر ہے۔''

اس اشتہاری اطلاع کے علاوہ میری نظر سے کسی اخبار میں مولانا سیفی ندوی کے انتقال کی کوئی معمولی سی خبر بھی نہ گزری۔ یہ انجام تھا اُس شخص کا جس کے بیانات مختلف قومی وملکی اور مذہبی معاملات پر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں کراچی کے اکثر اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔

ممکن ہے کہ مندرجہ بالا اطلاع میں مولانا کے لیے کوئی توصیفی لاحقہ عقیدت مندانہ مبالغے پر مبنی ہو اور تاریخی دستاویزات کی کسوٹی پر پورا نہ اترے لیکن اظہارِ عقیدت کے ضمن میں مدح وستائش کے ایسے کلمات بہت زیادہ قابلِ اعتراض بھی نہیں ہوتے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا سید سیفی ندوی (اسلام الحیٔ) ایک ممتاز عالمِ دین اور تحریکِ پاکستان کے نام ور کارکن تھے۔

مولانا بیسویں صدی کی ابتدا میں، یوپی کے ضلع بلیا کے ایک مشہور قصبہ سکندر پور میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سکندر پور ہے جو مشہور صوفی شاعر، حضرت آسی غازی پوری (صاحب عین المعارف) کا مولد تھا۔ مولانا حسرت موہانی کے ''انتخابِ سخن'' میں ان کا تذکرہ ''آسی سکندر پوری'' ہی کے نام سے کیا گیا ہے۔ مولانا سیفی ندوی نے ابتدائی تعلیم اپنے بزرگوں اور بطورِ خاص اپنے والد سے جو ایک صاحبِ علم انسان تھے اور مولانا ریاض احمد بلیاوی سے حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے جون پور میں مولانا ماجد علی جون پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے پوری طرح استفادہ کیا بلکہ صحیح معنوں میں ان کے مزاج کی اصل تشکیل یہیں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں انہوں نے مزید تعلیم مدرسۂ فرنگی محل اور ندوۃ العلما لکھنؤ میں پائی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا بمبئی چلے گئے۔ عشرۂ ۱۹۲۰ء کے آخر میں علی برادران آل انڈیا نیشنل کانگریس سے برگشتہ اور علیحدہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد مولانا شوکت علی مرحوم کلیتاً مسلم لیگ کے ہو کر رہ گئے۔ غالباً یہی وہ دور تھا جب مولانا سیفی ندوی خلافت کمیٹی سے منسلک ہو کر روزنامہ ''خلافت'' بمبئی کے مدیر مقرر ہوئے۔ بدقسمتی سے مجھے صحیح سنین یاد نہیں لیکن میں نے مولانا کے پاس روزنامہ ''خلافت'' کے ایسے شمارے دیکھے ہیں جن کی الواح پر ان کا نام بطور مدیر درج تھا۔ انہوں نے بمبئی میں کچھ وقت گزارا اور پھر یوپی واپس آ گئے۔

یوپی میں مولانا سیفی ندوی نے صحافت اور مذہبی سیاست کا مشغلہ جاری رکھا۔ بہت دنوں تک ان کا مستقر اودھ کے ضلع فیض آباد میں رہا۔ یہاں ''تاریخ'' کے نام سے ایک ماہنامہ نکلتا تھا جس میں وہ مضامین لکھتے رہے۔ ان دنوں اجودھیا کی بابری مسجد کے قضیے نے شدت اختیار کر رکھی تھی جس کے تدارک کی خاطر مسلمانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی جس کے روحِ رواں منشی فیاض علی مرحوم تھے۔ وہ بعد میں پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل (اب اٹارنی جنرل) رہے۔ فیاض علی اعلیٰ درجے کے وکیل ہونے کے علاوہ اپنے عہد کے ایک مقبول ناول نگار اور ''شمیم'' اور ''انور'' کے مصنف تھے۔

کراچی کی ایک مشہور ماہرِ تعلیم اور سرسید گرلز کالج کی سابق پرنسپل ''سلمیٰ زمن'' (جناب مختار زمن کی اہلیہ) فیاض علی صاحب کی صاحب زادی ہیں۔ اس انجمن نے ''نصرت'' کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو قضیہ ٹھنڈا پڑنے کے ساتھ ساتھ خود بھی ٹھنڈا ہوتا گیا اور روزنامے سے ہفت روزہ ہو کر بند ہو گیا۔ مولانا سیفی ندوی ''نصرت'' کی ادارت میں شریک رہے۔ اس حیثیت سے انہوں نے بابری مسجد کے لیے بھرپور قلمی جہاد کیا۔ ساتھ ساتھ ان کی تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پاکستان کی تحریک اپنے عروج پر پہنچی تو مولانا سیفی ندوی نے بھی اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے اسے تقویت بخشی۔ کانگریس کی حلیف جماعت جمعیۃ العلمائے ہند کے مقابلے پر علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کی صدارت میں جمعیۃ العلمائے اسلام قائم ہوئی تو کانگریس کے مخالف علما اس میں شریک ہو گئے۔ قارئین کو مولانا آزاد سبحانی یاد ہوں گے۔ کلکتہ میں عیدین کے سب سے بڑے اجتماع کی امامت موروثی طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کرتے تھے۔ مولانا کے قوم پرستانہ رویے اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ساتھ ان کے تعلق کو مسترد کرتے ہوئے کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کا مقاطع کیا اور ان کو جو ''الہلال'' و ''البلاغ'' کے مدیر کی حیثیت سے اعلیٰ مقام کے حامل رہ چکے تھے، عیدین کی امامت سے سبک دوش کر دیا۔

اس فریضے کی ادائیگی کے لیے مولانا آزاد سبحانی کا انتخاب عمل میں آیا جو جمعیۃ العلمائے اسلام کے نمایاں رکن بن چکے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی ممتاز عالمِ دین ہونے کے علاوہ شعلہ بیان خطیب بھی تھے۔ مولانا سیفی ندوی کے تعلقات مولانا آزاد سبحانی سے نہ صرف برادری کے تھے بلکہ خود مولانا آزاد سبحانی کا تعلق بھی سکندر پور ہی سے تھا۔ بہرحال مولانا آزاد سبحانی کی معیت میں مولانا سیفی ندوی نے جمعیۃ العلمائے اسلام کے لیے بڑا کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ براہِ راست مسلم لیگ کے بھی ایک نمایاں کارکن تھے جہاں ان کی حیثیت اور مرتبے کا مجھے بہت زیادہ علم نہیں۔

فیض آباد سے چل کر کئی اور شہروں میں ہوتے ہوئے مولانا سیفی ندوی دہلی پہنچے اور وہاں بھی انہوں نے کسی جریدے کی ادارت کی۔ اس زمانے میں انہیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں معارفِ اسلامیہ کے پروگرام میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی جہاں انہوں نے غالباً دو خطبے دیے جنہیں بہت سراہا گیا۔

پاکستان بنا تو مولانا سیفی ندوی کراچی آ گئے۔ یہاں شروع شروع میں مختلف مذہبی جماعتوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن ان کا مزاج کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جہاں بھی رہتے "بے ہمہ و باہمہ" بن کر رہنا چاہتے تھے۔ مروّجہ مکاتبِ فکر میں کوئی مکتبِ فکر ایسا نہ تھا جس کے سرخیل علما کے ہر فیصلے پر وہ آمنّا و صدّقنا کہتے ہوں۔ اُن علما سے جو ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں عوام کے لیے مرجعِ عقیدت بنے ہوئے تھے، مولانا سیفی ندوی برابری کی بنیاد پر ملتے اور ان کے بہت سے فیصلوں پر ان کے مواجہ میں تنقیدی گفتگو کرتے تھے۔

گروہی سیاست میں اس قسم کا رویہ عموماً قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان مخصوص محفلوں میں مولانا سیفی ندوی اپنی افتادِ طبع اور "میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند" والی عادت کی بنا پر "ناپسندیدہ شخصیت" (Persona non Grata) بنتے چلے گئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ بہت سی انجمنوں کی موجودگی اور ان کے عمائدین سے ذاتی تعلقات کے باوجود وہ ایک فرد بن کر رہ گئے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ مولانا نے اس خاموش مقاطعے کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی زندگی اپنی انفرادی صلاحیتوں کی بنیاد پر گزارنا چاہتے تھے۔ "تحسینِ باہمی" کی حکمتِ عملی ان کے مذہب میں روا نہ تھی۔ وہ بہت اچھے مقرر تھے، چناں چہ جن منتخب محفلوں میں وہ بلائے جاتے، وہاں موضوع سے بھرپور انصاف کرتے اور اپنے استدلالی طرزِ بیان سے سامعین کے دلوں پر اثر انداز ہوتے۔ روزمرہ کے قومی اور مذہبی مسائل پر اپنے خیالات اخباری بیانات کے ذریعے ظاہر کرنے کے علاوہ اپنے نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے وہ ایک زمانے تک "امام" کے نام سے کراچی سے ایک ماہنامہ نکالتے رہے۔ اس میں عموماً سیرتِ پاک کی روشنی میں بڑے پُرمغز مضامین شائع ہوئے۔ اس جریدے کی ورق گردانی سے ہمیں اردو نثر و نظم کے بعض اچھے شہ پارے مل سکتے ہیں بشرطیکہ خود امام کے پرچے بھی اب کہیں مل جائیں۔

مولانا سیفی ندوی اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے بعض بہت عمدہ نعتیں اور غزلیں لکھیں۔ کراچی کی ایک انجمن کے زیرِ اہتمام مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر کئی سال متواتر بڑی پُرمغز اور دل آویز تقریریں کیں۔ مخدوم کی مدح و منقبت میں انہوں نے ایک معرکتہ الآرا نظم بھی لکھی جسے بے انتہا پسند کیا گیا۔

ایک روز وہ میرے گھر آئے۔ دورانِ گفتگو انہوں نے اپنی شاعری کا تذکرہ بھی کر دیا اور ایک غزل سنائی۔ سامنے ایک کتاب رکھی ہوئی تھی، اس کی جلد کے اندرونی حصے پر انہوں نے میرے بیٹے کی فرمائش پر وہ غزل لکھ دی۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کے ساتھ ہی ان کی شاعری بھی رخصت ہو گئی، لہٰذا میں بطورِ تبرک اس ایک غزل کو اس مضمون کے آخر میں شامل کر رہا ہوں تاکہ یاد کے ساتھ کم از کم ان کی وہ ایک غزل ہی باقی رہ جائے۔

مولانا سیفی ندوی کی ذاتی زندگی بھی تنہا تھی۔ غالباً ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ شادی ہوئی تھی لیکن اہلیہ ان کے ساتھ کراچی نہ آئیں اور بھارت ہی میں رہ گئیں۔ کراچی میں ان کے ایک چھوٹے بھائی سرکاری کالج میں لیکچرار تھے جو بہت دنوں بعد اپنے افرادِ خاندان کے ہمراہ لندن منتقل ہو گئے اور وہیں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ یہ ایک المیہ تھا کہ کراچی میں بیس پچیس برس دونوں بھائی مقیم رہے لیکن مولانا اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے کے روادار نہ تھے۔

ذاتی تعلقات کے باوجود اپنی افتادِ طبع کے پیشِ نظر میں اس موضوع پر کبھی ان سے گفتگو نہیں کی، حالاں کہ وہ راولپنڈی اور اسلام آباد میں کئی بار میرے یہاں بطورِ مہمان ٹھہرے ہیں۔ انتقال سے چند ماہ پہلے ایک روز خود ہی کھل گئے۔ معلوم ہوا کہ اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت میں مولانا نے بھرپور کردار ادا کیا تھا جس میں مالی تعاون بھی شامل تھا لیکن بدقسمتی سے وہ دہریت کی طرف مائل ہو گئے۔ سبب قطعِ تعلق کا!

جس وقت مولانا نے مجھے یہ بات بتائی تو ان کے لہجے میں بڑی دل سوزی تھی۔ تاہم گفتگو کے خوش گوار پہلو کے طور پر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ لندن جانے کے بعد چھوٹے بھائی کے خیالات میں تبدیلی آئی اور غالباً دونوں بھائیوں میں کچھ خط کتابت بھی ہوئی۔ اس کے بعد مولانا خود لندن گئے اور سات آٹھ مہینے وہاں رہے۔ چھوٹے بھائی کے بیوی بچے بھی ان سے اچھی محبت اور احترام سے پیش آئے جس کا تاثر ان پر آخری وقت تک طاری رہا۔ بات وہی افتادِ طبع کی ہے کہ ان بھائی کے علاوہ میں نے مولانا کی زبان سے کسی اور عزیز کا نام نہ سنا۔ حالاں کہ ان کے چند قریبی اعزا کراچی میں یقیناً موجود تھے۔

کراچی میں جامع کلاتھ مارکیٹ کے عقب میں ایک فلیٹ میں تنہا رہتے تھے۔ میرے تعلقات ان سے پاکستان کے ابتدائی دنوں ہی سے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار میں اُن کے فلیٹ پر چلا جاتا، کبھی وہ میری قیام گاہ پر آ جاتے ورنہ اکثر دوپہری ان سے ملاقات سرِ راہ یا بہت دنوں تک کتابوں کی ایک دکان "مکتبۃ الشرق" میں ہوتی رہی۔ صبح کو ناشتے سے فارغ ہو کر غالباً "امام" کی انتظامی مصروفیات کے سلسلے میں وہ کچھ تاجروں کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر انہوں نے کاروباری مفاد کا کوئی اور سلسلہ ان لوگوں سے رکھا ہو تو مجھے چنداں تعجب نہ ہوگا۔

اس جانب اشارہ کرنا اس لیے بھی ضروری معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی محفل میں جہاں مولانا موجود نہ ہوتے، ان کا ذکر آتا تو چند ایک افراد ایک آدھ جملہ اس قسم کا ضرور کہہ کر ان پر بالواسطہ تعریض کرتے کہ ان کا عام طور سے معلوم کوئی ذریعۂ آمدنی نہ تھا۔ مولانا دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتے تھے جو انہیں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد بطورِ مہاجر الاٹ ہوا تھا۔ بہرحال اس چھوٹے سے فلیٹ میں ان کی تنہا رہائش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان معترضین کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کرتا کہ مولانا نصف شب کے قریب ایک عمل کے ذریعے اپنے ایک موکل کو بلاتے ہیں جو ان کی ساری ضروریات پوری کر دیا کرتا ہے۔

دوپہر کو اپنے فلیٹ پر مولانا واپس آتے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کرتے اور شام کے تقریباً تین بجے پیدل صدر کا ایک چکر لگاتے جہاں ایک مخصوص ہوٹل میں بیٹھ کر کچھ دیر اپنے احباب اور عقیدت مندوں سے خوش گپیاں کرتے اور پھر واپس اپنے فلیٹ پر آ جاتے۔

مولانا کی ایک خاص ادا ان کی سفید پوشی تھی۔ فلیٹ سے باہر نکلتے تو سر سے پیر تک سفید پوش ہوتے۔ بس ایک چھڑی سفید نہ ہوتی ورنہ سفید فر کی جناح کیپ، سفید شیروانی جس پر بہت خوب صورت سفید چادر زیب گلو ہوتی۔ سفید پاجامہ اور سفید ناگرا جوتا مع سفید موزے کے۔ کپڑوں کی صفائی اور سفیدی اور "شکن شکنی" کا بطور خاص التزام کرتے۔ کھانا وغیرہ پکانے حتیٰ کہ چائے وغیرہ بھی بنانے کا کوئی جھنجھٹ نہیں۔ فلیٹ کے سامنے ایک ہوٹل سے دونوں وقت کھانا اور ضرورت کے وقت چائے منگوا لیتے۔ بس کھڑکی پر کھڑے ہو کر آواز دینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِ صدارت میں حکومت نے علما اور مشائخ کی ایک کانفرنس مری میں بلائی جس میں مولانا سیفی ندوی بھی مدعو تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ میرے یہاں راولپنڈی میں مقیم رہے۔ نہ میں نے ان سے

پوچھا اور نہ انہوں نے بتایا کہ کانفرنس میں کیا گزری۔ اس کے بعد بھی کئی بار ان کا آنا جانا رہا اور میرے ہی ساتھ وہ راولپنڈی یا اسلام آباد میں ٹھہرتے رہے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے احباب اور ملنے والوں کے بچوں میں بھی پوری دلچسپی لیتے۔ سب کے نام اور تعلیمی مدارج معلوم کرتے اور اللہ جانے کس طرح ان تمام کے نام یاد رکھتے۔

برسوں کے بعد ملاقات ہوتی تو ایک ایک بچے کا نام لے کر اس کی خیر و عافیت دریافت کرتے اور ان کا یہ رویہ میں نے بہتوں کے ساتھ دیکھا۔ اچانک ملاقات ہوگئی، تپاک سے ملے اور ابتدائی بات چیت کے بعد نام لے لے کر ملاقاتی کے ہر بچے کی خیریت معلوم کی۔ کسی ایسے شخص کے گھر جاتے جن کے بچوں کا تعارف ان سے پہلے سے ہوتا تو سب کو نام بنام بلواتے۔ سر پر ہاتھ پھیرتے۔ ان کے مشاغل کے بارے میں ان سے سوال جواب کرتے۔ بچوں کے معاملات میں دلچسپی لینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ جن گھروں میں اُن کی آمد و رفت رہتی، ان گھروں کے بچے بھی مولانا کے آنے پر کھل اٹھتے۔ اکثر و بیشتر وہ چھوٹے بچوں کو دینے کے لیے ٹافیاں وغیرہ بھی جیب میں رکھے رہتے۔

مولانا کی طبیعت میں بڑی جولانی اور شگفتگی تھی۔ ایک بار وہ میرے یہاں اسلام آباد میں مقیم تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اچانک ایک سرحدی نوجوان پشاور سے میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا ایک معاملہ میرے دفتر میں زیرِ غور تھا۔ ایک حادثے کی بنا پر اُن کے پیر میں لنگ ہو گیا تھا اور وہ چھڑی کے سہارے بدقت چل رہے تھے۔

غالباً راولپنڈی صدر میں وہ پشاور کی بس سے اتر کر ایک ٹیکسی کے ذریعے میرے گھر اسلام آباد آئے۔ گھنٹی بجی، میں باہر گیا۔ علیک سلیک اور ابتدائی تعارف کے بعد میں انہیں ڈرائنگ روم میں لایا۔ ان کے بیٹھنے کے چند لمحوں بعد ٹیکسی کا ڈرائیور اندر آیا اور ایک خاصا بڑا سردا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ ان کی بغل میں رکھ کر واپس چلا گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ غالباً انہوں نے ٹیکسی باہر روک رکھی ہو گی لیکن جب جانے لگے تو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ انہیں دوسری ٹیکسی لینی تھی جس کے لیے انہیں میرے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر سڑک تک جانا تھا۔ ان سے کچھ دیر میری بات چیت ہوئی۔ میں نے چائے وغیرہ سے ان کی رسمی تواضع کی۔

جب وہ واپس جانے لگے تو میں نے ان سے کہا ''آپ مجھ پر اتنی مہربانی اور کیجیے کہ یہ جو چیزیں آپ اپنے ساتھ لے آئے ہیں، انہیں اپنے ساتھ ہی واپس لیتے جائیے''۔ انہوں نے کہا' جب ہم لوگ کسی سے ملنے پہلی بار جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ آپ انہیں واپس کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔

میں نے ان سے کہا ''اس طرح کسی سے کوئی چیز قبول کرنا ہم لوگوں کے دستور کے خلاف ہے لہٰذا آپ اصرار کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔'' کچھ دیر اصرار اور انکار کا سلسلہ چلتا رہا۔

اچانک مولانا سیفی ندوی نے گفتگو میں حصہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی اپنی رائے دوں۔'' میں نے کہا ''ضرور۔'' انہوں نے مجھ سے کہا ''تم اسے رکھ لو۔ میں بعد میں تم سے بات کروں گا۔'' میں خاموش ہو گیا۔ چیزیں وہیں رہ گئیں اور میں اس نوجوان کو سڑک تک رخصت کر آیا جہاں اسے ٹیکسی مل گئی۔

ان کے جانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا ''اول تو بہت معمولی چیزیں ہیں اور جیسا کہ ان صاحب نے کہا کہ یہ ان کے معاشرے کا دستور ہے لہٰذا یہ اتنی زیادہ قابلِ اعتراض بات نہیں اور تم اسے رشوت وغیرہ پر محمول نہ کرو۔'' پھر کچھ توقف کے بعد مولانا نے ہنستے ہوئے کہا ''سب سے بڑی بات یہ ہے جس کا تم نے احساس نہیں کیا کہ اپنی جسمانی معذوری کی وجہ سے وہ بے چارہ خود ہی صحیح طریقے سے چل نہیں سکتا۔ اب تم

ان کی پیٹھ پر پانچ کلو کا سردا رکھ دیتے تو وہ اسے کس طرح اٹھا لے جاتا۔ بس یہی ہوتا کہ وہ تمہارے دروازے پر اسے رک جاتا۔ تمہیں اس پر ترس بھی نہیں آیا۔''

مولانا کی اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا۔ پھر انہوں نے اسی شگفتگی کے ساتھ کہا ''اسے گھر میں کٹوا کر منگواؤ۔ پہلے میں کھاؤں گا پھر تم کھاؤ۔ اس طرح ہضم ہو جائے گا۔''

مولانا کی عمر اسّی سال سے کچھ اوپر ہی ہو گی لیکن ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ انتقال سے کوئی سال سوا سال پہلے صدر کے علاقے میں ایک کھلے ہوئے گٹر میں ان کا پیر آ گیا جس سے ان کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی۔ بہت دنوں تک اِدھر اُدھر کا علاج کرواتے رہے۔ اسی اثنا میں ان کی سماعت بھی تقریباً جواب دیتی گئی۔ اس دور میں تقریباً ہر ہفتے ان سے ملتا اور اپنی استطاعت کے مطابق انہیں کچھ مالی اور غیر مالی سہولتیں بھی فراہم کرتا رہا لیکن بے پناہ خواہش کے باوجود میں انہیں یہ رائے نہ دے سکا کہ وہ کسی معقول اسپتال میں داخل ہو کر اپنا علاج کروائیں۔ یہ رائے نہ دینے کا ایک سبب تو میری وہی افتادِ طبع کہ میں دوسروں کے معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کروں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ زندگی کے اس مرحلے پر میں مولانا کی مالی حیثیت سے کماحقہٗ واقف نہ تھا اور جتنی کچھ واقفیت تھی وہ ان کی پریشان حالی ہی کی طرف اشارہ کرتی تھی جب کہ اسپتال میں داخل ہونے کا مطلب صرفِ کثیر تھا۔

یہ رائے میں انہیں اسی وقت دے سکتا تھا اگر وہ

ادب کیا ہے؟

انسان جس ماحول میں رہے' اس کا جس سماج سے تعلق ہے' وہ ماحول اور سماج اس کے ادب سے ظاہر ہو گا۔ ادب میں اگر دیو' پریوں کا ذکر ہو تو ان میں ہمیں انسانی خصلتیں نظر آئیں گی۔ دیوتاؤں کے غیظ و غضب میں انسانی جلال اور جمال کی جھلکیاں ملیں گی۔ غرض مافوق الفطرت میں بھی فطرت کا اظہار ہو گا۔

ادب زندگی کی تنقید ہے۔ تنقید کا مقصد ہمیشہ نئی تعمیر ہوتا ہے۔ تعمیر کے لیے مستقبل کے میلان اور اس کے تصور کی ضرورت ہے جس کا دوسرا نام تخیل ہے۔ اس تخیل کی مدد سے وہ اپنے تصورات پیش کرتا اور زندگی کے مستقبل اور اس کے امکانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس لیے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ادیب خواب دیکھتا ہے لیکن ان خوابوں میں حقائق کی زبردست آمیزش ہوتی ہے۔ بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری:

''کامیاب ترین ادب وہ ہے جو ماحول کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقفیت' افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں۔ جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں۔ جو ہمارے ذوقِ حُسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔''

(مراسلہ: فرزانہ زیدی' سمن آباد' لاہور)

ذمہ داری بھی میں اٹھا سکتا۔ بہرحال اسی طرح لشتم پشتم علاج ہوتا رہا۔ مرض بگڑتا گیا اور آخر ایک روز وہ اسپتال میں داخل ہو گئے۔ وقتاً فوقتاً وہ تین چار اسپتالوں میں منتقل ہوتے رہے۔ دو ایک آپریشن بھی ہوئے لیکن مرض اس نہج پر پہنچ چکا تھا کہ ان کی حالت روز بروز سقیم سے سقیم تر ہوتی گئی۔ اس دور میں ان کے ایک پڑوسی محمد منصور خان نے جن کی جانب سے انتقال اور سوئم کا اشتہار چھپا، خدمت اور تیمارداری کا حق ادا کر دیا۔ ایک اور ''معمولی'' انسان جو پیشے کے اعتبار سے حجام تھے، اپنا گھر بار چھوڑ کر رات دن مولانا کی خدمت کرتے رہے۔ غالباً مولانا سے ان کا تعلق ارادت کا تھا۔

منصور صاحب ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اسپتالوں میں مولانا کے علاج کے سلسلے میں کثیر اخراجات کراچی کے ایک مشہور صاحب ثروت نے برداشت کیے جو خود بھی مولانا کے قدردانوں میں تھے۔ تاہم یہ وہ سوال ہے جو ہر دوسرے تیسرے دن اسپتال میں مولانا سے ملنے کے باوجود میں خود ان سے کبھی نہ کر سکا۔ بہرحال جس نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ اس کو اس کا اجر دے۔ مولانا تو ۲/ مارچ کو رخصت ہو گئے اور بعد نمازِ جمعہ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی ''مسجد مصطفیٰ'' میں ان کی نمازِ جنازہ ہوئی۔ وہیں گزری کے قبرستان میں وہ قیامت تک کے لیے لیٹ گئے۔

میں مولانا کے کسی عزیز سے نہیں ملا لیکن ان کے چند پڑوسیوں سے ضرور ملتا رہتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مولانا کے لیے محبت اور احترام کے جو جذبات میں نے دیکھے اس سے ان کے بارے میں میری خوش گمانیوں میں بڑا اضافہ ہوا۔ مولانا کو اخبارات نے بھلا دیا۔ ان کے ہم عصروں، دوستوں اور مستقل ملنے جلنے والوں نے بھی اپنی مصروفیات کی بنا پر انہیں نظر انداز کر دیا، کیوں کہ ان میں سے کوئی مجھے ان کے سرہانے کسی دن نظر نہ آیا۔ بہرحال یہ دنیا ہے لیکن میرا ایمان ہے کہ جو لوگ ان سے بے لوث ''دوستی'' کی بنا پر ملتے رہے، ان کی یادوں میں مولانا ہمیشہ زندہ رہیں گے جس کی پیش گوئی وہ خود اپنے ایک مقطع میں کر گئے ہیں:

بھلایا نہ جاؤں گا سیفی کبھی
دلِ دوستاں پر ہوں نقشِ دوام

(پاکستان بننے سے پہلے مولانا سیفی ندوی کی صحافتی اور سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ معلومات مجھے کراچی کے ایک بزرگ اور ممتاز عالم مولانا سید سعید اشرف ندوی نے فراہم کیں جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں)

مولانا مرحوم کی ایک غزل بطور تبرک پیش خدمت ہے

غزل

ملے جس کو اُن مست آنکھوں سے جام
وہی رِند ہے مے کدے کا امام
کہاں ماضی و حال، کیا صبح و شام
جہاں اُن نگاہوں کا ہو انتظام
تصور نے یوں بھی سجائی ہے بزم
یہ میں ہوں، یہ تو ہے، یہ مینا، یہ جام
مرے دل پہ اُتری نئی وحیِ عشق
لیا جب کسی نے کہیں اُن کا نام
مرا شاہدِ حال ہے مے کدہ
مری داستاں ہے بہر خط جام
زمانے کی تاریخ، المختصر
دلوں کا پیام، اُن نگاہوں کے نام
عجب رنگ ہے محفلِ حسن کا
اشارے ہیں خاص اور دربار عام
ابھی اُس نے پوچھا نہیں حالِ دل
ابھی ہے یہ عمرِ رواں تیز گام
بھلایا نہ جاؤں گا سیفی کبھی
دلِ دوستاں پر ہوں نقشِ دوام

جب راک فیلر پشاور آیا

اجون خان جدون

امریکی آئکون کا رویّہ ایک پاکستانی کو آزادی کی برکات سے روشناس کرا گیا

پشاور کی سٹینڈرڈ ویکیم آئل کمپنی میں ملازمت کے دوران مجھ میں زبردست خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ جنرل منیجر اور آپریشن منیجر مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگے کہ بعض اُمور میں ہیڈ آفس سے پیشگی منظوری لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اِس اعتماد کے پیش نظر میں پشاور میں اپنی ہر چھوٹی بڑی کارکردگی سے اُن کو آگاہ رکھتا۔ اِس کمپنی کے ڈائریکٹر بلکہ مالکان تک جب بھی امریکا سے پاکستان کا دورہ کرتے تو پشاور ضرور آتے۔ میں ہی اُن کی مہمان داری کیا کرتا تھا اور اُن کو مختلف تاریخی مقامات کے علاوہ ورسک ڈیم (جو اُس وقت زیر تعمیر تھا) اور درہ خیبر کی سیر بھی ضرور کرواتا۔

یہ ستر سال پہلے کی بات ہے۔ تب پشاور کا ماحول ملک کے دوسرے شہروں سے اس لیے مختلف تھا کہ لوگ پختون روایات کی رُو سے خواتین کے پردے کی پابندی کرتے تھے۔ وہاں مخلوط میل ملاپ معیوب سمجھا جاتا۔ بہرحال غیر ملکی آتے تو تکہ

کباب، درہ خیبر، قبائلی کلچر سے متعلق معلومات اور خٹک ناچ کی خوشگوار یادیں ہی ساتھ لے جاتے۔

میری تعیناتی کے دوران بے شمار امریکی مہمان پشاور آئے۔ اکثر امریکن خوش طبع ہوتے ہیں بلکہ میرے خیال میں خوش مذاقی اُن کے کلچر کا حصہ ہے۔ میں بھی اُن کے ساتھ خوش مذاقی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا، تفنن طبع کے لیے دو واقعات درج ہیں۔

ایک صاحب امریکا سے دورے پر آئے۔ ان کا نام کولٹ مین (Coltman) تھا۔ بیگم بھی ہمراہ آئی تھی۔ مال گودام روڈ پر میرے دفتر سے کچھ فاصلے پر پہلوان نامی تانگہ بان رہتا تھا۔ اس نے ایک گھوڑی بھی پال رکھی تھی۔ گھوڑی نے حال ہی میں ایک بچھڑے کو جنم دیا تھا۔ میں کولٹ مین اور اس کی بیگم کو گھماتے ہوئے پہلوان کے اصطبل کے پاس لے گیا پھر بچھڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کولٹ مین کی بیوی کو مخاطب کر کے کہا Mrs. Coltman! Here is Coltman Junior۔ (بیگم کولٹ مین، کولٹ مین جونیئر سے ملیے) کولٹ مین انگریزی میں گھوڑی کے بچے کو کہتے ہیں۔ یہ سن کر وہ دونوں بے ساختہ ہنس پڑے اور کافی دیر تک میرے مزاح سے محظوظ ہوتے رہے۔

ایک دفعہ ایک اور امریکی مع بیوی کے دورے پر آئے۔ ان کا نام انڈر ہل (Under Hill) تھا۔ یہ صاحب ہماری کمپنی کے سینئر ڈائریکٹر تھے۔ میں ان کو درہ خیبر لے جا رہا تھا۔ جب ہماری موٹر خیبر کے اونچے پہاڑ پر سے گزرنے لگی تو میں نے انڈر ہل کو مخاطب کر کے کہا۔ Mr. Under Hill "You are now over hill" (مسٹر انڈر ہل، اب آپ ہل (پہاڑ) کے اُوپر ہیں)۔ اس پر ہم سب کافی دیر تک ہنستے رہے۔ واپسی پر جب ہماری موٹر اسی پہاڑ پر پہنچی تو مسٹر انڈر ہل نے مجھے مخاطب کر کے کہا:

Mr. Khan "I am not Under Hill, I am now over hill"۔

اس پر امریکی کی بیوی کی زوردار ہنسی نکل پڑی اور ہم سب نے اس جملے سے لطف اُٹھایا۔

میں امریکا بلکہ دنیا کے امیر ترین اشخاص میں شمار ہونے والے جان ڈی راک فیلر (John D. Rockafelle) کے پشاور میں پانچ روزہ قیام کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ سٹینڈرڈ ویکیم آئل کمپنی کا مالک بھی تھا۔ ۱۹۵۶ میں افغانستان جاتے ہوئے اس نے پشاور میں پانچ دن قیام کا پروگرام بنایا۔ کمپنی کا جنرل منیجر مجھ پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے فون پر بتایا کہ جان راک فیلر مع بیوی اور ایک بیٹے اور بیٹی کے پشاور میں قیام کرے گا۔ اس کے بعد اُسے سرکاری دورے پر افغانستان براستہ طورخم جانا تھا۔ افغانستان میں داخل ہونے تک ان کے ساتھ رہنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔

میں نے پشاور میں تب کے بہترین ہوٹل (ڈین ہوٹل) کے دو عمدہ کمروں میں مہمانوں کو ٹھہرایا اور پروگرام اس طرح بنایا کہ پہلے دن ان کو قصہ خوانی، چوک یادگار اور صرافہ بازار لے گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بیوی بہت خریداری کرے گی۔ خاص کر صرافہ بازار کے زیورات اور بازار مسگراں میں پیتل والے برتنوں پر خوبصورت نقش و نگار سیاحوں کے لیے بہت کشش رکھتے تھے۔ لیکن حیران راک فیلر نے اپنی بیٹی کی ضد پر صرف ایک چھوٹا سا پیتل کا برتن خریدا جس پر خوبصورت نقش نگار کندہ تھے۔ اس کی قیمت ایک ہزار روپے تھی۔

صرافہ بازار میں اس کی بیٹی نے چاندی کا پرانا پازیب پسند کیا جو واقعی بہت پرکشش تھا۔ بیگم راک فیلر نے اسے خریدنے کی اجازت دے دی جس کی قیمت چودہ سو روپے تھی۔ مسٹر راک فیلر اور اس کے بیٹے نے کوئی شے خریدنے میں دلچسپی نہیں لی۔ قصہ خوانی، چوک یادگار، گھنٹا گھر اور مسجد

مہابت خان کی مختصر تاریخ میں نے انہیں بتائی۔ دوسرے دن میں ان کو پشاور کے عجائب گھر لے گیا جہاں راک فیلر نے گندھارا کے تاریخی نوادرات میں بہت زیادہ دلچسپی ظاہر کی۔ اس موقع پر میں نے راک فیلر کی توجہ عجائب گھر میں رکھے ایک پتھر کتبہ نمبر ۲ کی طرف مبذول کروائی جس پر قدیم ترین ''شاردا'' زبان میں ۱۳۰۰ سال قبل کی تحریر کندہ تھی۔ تحریر یہ ہے ''سال ۷۰۸ مطابق ۶۵۱ عیسوی میں ایک شخص کولاسنکا نے سہاسیارا جا کے حکم پر ایک کنواں کھودا تا کہ کیپسونامی ملک کے رہنے والوں کو پینے کا پانی مہیا ہو سکے۔''

عجائب گھر کے ریکارڈ پر یہ تحریر بھی موجود تھی کہ یہ پتھر علاقہ غیر کے دیول نامی گاؤں سے ایک انگریز ایل مٹی نے برآمد کر کے عجائب خانہ کو دیا۔ گاؤں دیول علاقہ گدون میں میرے گاؤں بادہ سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ پتھر جس علاقے سے برآمد ہوا، میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔ یہ انگریز دور حکومت میں آزاد علاقہ رہا ہے۔ عجیب بات یہ کہ آج بھی اس علاقے کے اکثر دیہات پانی کی شدید قلت سے دوچار رہتے ہیں۔ گرمیوں میں اسی وجہ سے بہت تعداد میں جانور مر جاتے ہیں۔

راک فیلر نے میری باتیں توجہ سے سنیں اور سنجیدگی سے کہا، ایشائی ممالک میں یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ امریکا جا کر میں اپنی حکومت کو کہوں گا کہ وہ اس معاملے میں پاکستان کی زیادہ سے زیادہ مدد کرے۔ اگلے روز میں نے انھیں پشاور کے گورنر ہاؤس کی سیر کروائی۔ متعلقہ حکام سے میں نے پیشگی اجازت لے رکھی تھی۔ آخری دن میں انھیں ورسک ڈیم دکھانے لے گیا۔ ایک دن قبل ڈیم کے چیف انجینئر اعظم خان کے ساتھ پروگرام طے کر لیا تھا۔ راک فیلر کا نام سن کر وہ چونک گیا اور مجھے کہا کہ یہ شخص تو ہمارے جیسے سو ڈیم تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے اعزاز میں ظہرانے کا انتظام کروں اور حکومتی اعلیٰ افسران کو بھی مدعو کروں۔

میں نے یہ بات راک فیلر کو بتائی تو اس نے کہا کہ میری طرف سے تشکر کے ساتھ ان سے کہو کہ یہ میرا نجی دورہ ہے لہٰذا کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ بہرحال چیف انجینئر اعظم خان نے ہم سب کو زیر تعمیر ورسک ڈیم کے مختلف مراحل دکھائے۔ راک فیلر نے ان کے ساتھ بہت تفصیلی گفتگو اور سوال اور جواب کی نشست کی۔

اگلے دن صبح آٹھ بجے پشاور سے طورخم کے لیے روانہ ہوئے۔ درہ خیبر کے پیچ و خم سے گزرتے ہوئے لنڈی کوتل میں خیبر رائفلز کے آفیسرز میس میں ان کے لیے مختصر لنچ اور مختصر خٹک ناچ کا اہتمام تھا جس سے وہ بہت محفوظ ہوئے۔ دوپہر دو بجے طورخم کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں راک فیلر اور اس کی بیوی نے میرا شکریہ ادا کیا اور نیویارک میں اپنا پتا اور فون نمبر وغیرہ مجھے دیا۔ بہت اصرار سے کہا کہ جب بھی نیویارک آؤ تو ہمارے مہمان بننا۔ میں سوچنے لگا کہ ''کہاں نیویارک اور کہاں میں۔'' بہرحال طورخم کی سرحد پر انھیں رخصت کیا۔ رخصت ہوتے وقت وہ سب مجھ سے اس طرح ملے جیسے بہت قریبی دوست ایک دوسرے سے بچھڑ رہے ہوں۔

اس قسم کے واقعات کا اب خیال آتا تو میں سوچتا ہوں، انگریزوں کی غلامی کے دور میں کوئی معتبر ہندوستانی بھی کسی انگریز کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب ایک آزاد پاکستانی شہری ہونے کے ناتے ممتاز و معزز امریکی شخصیت نے میرے ساتھ برابری کا سلوک کیا۔ یہ آزادی اور خودداری ہی کا کرشمہ ہے۔ تب میں اپنے کانوں میں علامہ اقبالؒ کے درس خودی کا یہ پیغام گونجتا محسوس کرتا ہوں۔

خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر ◆◆◆

"اور ہم کسی نہ کسی طرح تمھاری آزمائش ضرور کریں گے۔ دشمن کے خوف سے، بھوک پیاس سے، مال وجان سے اور پھلوں کی کمی سے اور ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔" (سورہ بقرہ: آیت ۱۵۵)

"اور تم اس بات کو جان رکھو کہ تمھارے اموال اور تمھاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے اور اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا بھاری اجر ہے۔" (سورہ انفال: آیت ۲۸)

☆☆

مجھے یاد نہیں کہ زینب خالہ کے ہینڈ بیگ کی زِپ میں نے کیوں کھولی تھی اور وہ میرے لرزیدہ ہاتھوں سے کیونکر زمین پر گر گیا۔

شاید نرس نے اُن کے مردہ جسم سے اُتارے گئے زیورات میرے حوالے کیے تھے جن کو بیگ میں رکھتے ہوئے میں اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو نہ پا سکی یا بیگ کے اندر مسلسل بجتے موبائل فون کو نکالنا چاہا تھا......! کچھ بھی تھا، زینب خالہ کا ہینڈ بیگ میرے ہاتھوں سے گرا اور بہت ساری چیزیں زمین پر بکھر گئی تھیں۔ میں زمین پر بیٹھی سب کچھ سمیٹ رہی تھی جن کی وہ پانچ منٹ پہلے تک بلا شرکتِ غیر مالک تھیں۔

چابیاں، بالوں کا کلپ، خوشبو کی چھوٹی شیشی، عینک، بال پوائنٹ، ڈرائی کلینرز اور درزی کی رسیدیں، لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹیں، ادویہ، ایک چھوٹا بٹوہ اور ایک تصویر جو کہ اوندھی پڑی تھی۔ میں نے تصویر کو سیدھا کیا۔ اوہ میرے اللہ...... قریب ہی کہیں کوئی ایٹمی دھماکا ہوا اور میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گیا...... میرے گرد ہوتے وجود کے ذرے دھیرے دھیرے واپس لوٹ کر میری تشکیل نو کر رہے تھے۔

شاید زینب خالہ کی روح نے خاکی اور فانی وجود کا پنجرہ چھوڑنے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا کہ نو سال سے سینے میں چھپایا ہوا دکھ مجھ پر عیاں کرتی جائے! آخر سترہ سالہ دوستی کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

خالہ کا بیٹا نعمان اور بہو حرا صدمے سے بے حال تھے۔ ایسے میں کوئی میری جانب متوجہ نہ تھا۔ میں نے تمام اشیاء سمیٹ کر بیگ میں ڈالیں۔ تصویر کی پشت پر ایک عبارت لکھی تھی جس کے حروف میری آنکھوں میں آئے پانی کی دیوار کے پار لرزتے

دیارِ غیر میں مرتد ہو جانے والی ایک پاکستانی دوشیزہ کی عبرت انگیز کتھا

مراجعت

منزہ نصیر

تھے۔ "یہ تصویر مجھے یاد دلاتی ہے کہ تم میری نہیں، جب تم میری نہ ہوئیں تو میں تمھیں کیوں یاد کروں۔"

یادوں کی پٹاری کھولتے ہوئے ایک سوکھے پھول کی سرسراہٹ ابھر آئی...... کچھ سال پہلے جب میں خالہ کے ساتھ محلے کے ایک گھر کی محفلِ میلاد میں شریک تھی۔ سفید چاندنی کے فرش پر پڑے گلاب کے پھولوں اور لوبان کی ملی جلی خوشبو والے پر تقدس ماحول میں خطیبہ کی آواز گونج رہی تھی وہ اللہ اور بندے کے تعلق پر بات کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کر رہی تھیں:

"جب پانی کی لہر حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی جانب بڑھی، تو وہ شفقتِ پدری سے بے تاب ہو کر پکار اٹھے یا اللہ میرا بیٹا! رب کی طرف سے آواز آئی جو میرا بندہ نہ ہوا وہ تمھارا کیونکر ہوا...... تو میری بہنو! ہمارے سب ناتے اُسی ایک ذات سے بندھے ہیں جس نے یہ رشتے پیدا کیے ہیں۔ جو ہمارے رب کا نہ ہوا وہ ہمارا بھی نہ ہوا۔"

خالہ نے چیخ روکنے کی کوشش میں منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ گھٹی گھٹی سسکیوں اور جھٹکے کھاتے وجود کے ساتھ وہ ایک ہی بات دہرا رہی تھیں "بے شک میرے رب! جو تیرا نہیں وہ میرا بھی نہیں۔"

سترہ سال پہلے اس نئی آبادی میں گھر ایک دوسرے سے دور دور بنے ہوئے تھے اور بیچ کے خالی پلاٹوں پر دیہات سے آئے محنت کشوں نے جھگیاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ مرد زیرِ تعمیر مکانات میں مزدوری کرتے اور عورتیں گھروں میں جھاڑو پونچھا اور برتن دھونے کا کام کر کے اپنے مردوں کا معاشی بوجھ بٹاتی تھیں تاکہ پیچھے دیہات میں اپنے گھریلو حالات بہتر کرنے کے لیے پیسے جوڑ سکیں...... وہاں ایک گھر جو ہمارے نام کا بنا تھا، ہم اس میں آن بسے اور وہ اگلے دن صبح ہی چلی آئی تھیں۔

"میں آپ کے دائیں طرف کونے والے مکان میں رہتی ہوں۔" وہ مسکرائیں۔ میرے اور ان کے گھر کے بیچ تین خالی پلاٹ تھے۔ اس لحاظ سے وہ ہماری نزدیک ترین پڑوسن ٹھہری تھیں۔ میں ڈھیروں ادھ کھلے اور بند کارٹنوں، اوپر تلے رکھی کرسیوں اور بے ترتیب فرنیچر کے درمیان اُن کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے تم کچھ خیال نہ کرو۔" وہ میری گھبراہٹ دیکھ کر بولیں "آرام سے اپنا کام کرتی جاؤ۔" انھوں نے کھلے کارٹن کی طرف اشارہ کیا جس میں سے برتن نکال کر میں الماری میں رکھ رہی تھی۔

"میں بس یہ کہنے آئی تھی کہ آج کھانا مت بنانا، میں بھجوا دوں گی۔"

"نہیں نہیں آپ کیوں تکلف کرتی ہیں۔ میں باہر سے کچھ منگوا

لوں گی۔'' میں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے رسمی طور پر منع کیا۔ میرے شوہر باہر کا کھانا پسند نہ کرتے تھے۔ اگر یہ غیبی رزق نہ آتا تو لامحالہ کھانا مجھے ہی پکانا تھا۔

''اے لو بھلا! تکلف کیسا لڑکی' یہ تو پڑوسیوں کا حق ہوتا ہے۔''

''جی بہت شکریہ!'' میں نے ممنونیت کا اظہار کیا۔

چالیس بیالیس سالہ خوش اطوار' مہذب اور مسکراتے چہرے والی خاتون پہلی ملاقات ہی میں مجھے متاثر کر گئیں۔ بیس سال سعودی عرب میں گزارنے کے بعد وہ لوگ حال ہی میں پاکستان منتقل ہوئے تھے۔ تین بچوں کی ماں تھیں۔ بڑی بیٹی فریحہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ بیٹا نعمان میڈیکل کے پہلے سال میں اور سب سے چھوٹا فرحان میٹرک کا طالب علم تھا۔ اُن کے شوہر کچھ دوستوں کی شراکت سے ٹیکسٹائل مل لگا رہے تھے۔ اچھی خوشگوار زندگی تھی۔

زینب خالہ کی شخصیت نے مجھے جتنا متاثر کیا تھا اُن کی بیٹی نے اس سے زیادہ مایوس کیا۔ وہ ہرگز اپنی ماں کا عکس نہ تھی جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہ قدرے تنک مزاج' کسی کو خاطر میں نہ لانے والی اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ اپنی ماں جیسا رکھ رکھاؤ اور گھڑا پا مفقود تھا۔ میری ہم عمر ہی رہی ہوگی یا سال دو سال کم' کیونکہ میں اُس وقت دو سال کی بیا ہتا تھی اور دس ماہ کا نوفل گود میں تھا۔ عمر کی مناسبت سے میری دوستی فریحہ سے ہونی چاہیے تھی مگر اُس نے کسی کوشش کا مثبت جواب نہ دیا۔

فریحہ کی خودسری اور تنک مزاجی کا اندازہ مجھے اُس دن ہوا جب ایک انتہائی گرم دوپہر خالہ کی طرف کسی کام کے سلسلے میں جا نکلی۔ وہ باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھیں اور صاحبزادی دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے چہرے پر ناگواری کے تاثرات لیے اُن کے قریب کھڑی گرمی میں پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ میرے جانے پر بیزار سی صورت بنائے پاؤں پٹختی اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

''اِسے کیا ہوا خالہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے ہونا کیا ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولیں ''میں نے ہی کہہ دیا تھا کہ کچھ گھر کے کام میں دلچسپی لو' باورچی خانے میں آؤ جاؤ تو کم از کم کھانا پکانے سے آشنائی ہو مگر یہ لڑکی! اُف توبہ.....''

''خالہ آپ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے اُن کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ ''ابھی پڑھائی کا بوجھ ہے اس پر۔ جب گھر کی ذمہ داریاں پڑیں گی تو سب سیکھ جائے گی۔''

''اللہ ہی جانے اس لڑکی کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ شکل سے کوئی حور پری نہیں۔ پھوہڑ اتنی کہ اپنے لیے روٹی تک نہیں ڈال سکتی اوپر سے نخرہ اتنا.....'' وہ ماں ہو کر حقائق سے نظریں نہیں چراتی تھیں۔ اُن کی جن خوبیوں نے مجھے متاثر کیا اُن میں سے ایک حقیقت پسند ہونا بھی تھا۔

''آج بتا ہی دیں کہ آپ میری سگی ماں ہیں یا سوتیلی؟''

فریحہ غالباً ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ غضبناک ہو کر باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوئی ''نہیں ہوتا مجھ سے ہانڈی چولہا اور جھاڑو پوچھا۔ میں پڑھ لکھ کر اچھی سی ملازمت کروں گی۔ ہزاروں کماؤں گی تو چند سو کے ملازم نہ رکھ سکوں گی؟''

اس نے مستقبل کے شاندار منصوبوں سے پردہ اٹھایا۔

''ویسے خالہ! کہہ تو صحیح رہی ہے۔'' میں نے آہستہ سے ممنا کر فریحہ بی بی کے منصوبوں کی توثیق کر ڈالی کیونکہ بس تین سال اِدھر کی بات ہی تو تھی ایسے ہی ہوائی قلعے میں بھی بنایا کرتی تھی لیکن اُدھر میں نے بی اے کے پیپر دیے اِدھر اماں ابا نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق اپنے سر کا بوجھ اتارا اور میرے تعمیر شدہ ہوائی قلعوں کا ملبہ میکے کے صحن میں بکھرا رہ گیا.....!

اس میں کوئی شک نہیں کہ فریحہ مزاحاً ڈپٹی نذیر احمد کی اکبری خانم کا جدید روپ تھی۔ وہ ایک ذہین طالبہ تھی۔ اپلائیڈ سائیکالوجی میں امتیازی حیثیت سے ماسٹرز کرنے کے بعد

اُس کو اپنے ہی کالج میں لیکچرر شپ کی پیش کش ہوئی جو اُس نے فوراً قبول کر لی۔ خالہ روایتی ماؤں کی مانند اُس کے رشتے کے لیے فکرمند تھیں مگر فریحہ کو کوئی جچتا نہ تھا۔ اُس کے اعتراضات عجیب و غریب ہوتے تھے۔

''بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا.....؟ نہ بابا نہ' ایسوں کی مائیں بہت نفسیاتی ہوتی ہیں۔ عدم تحفظ کا احساس ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بیٹوں کو ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتی ہیں۔'' وہ اپنی نفسیات دانی بگھارتی۔

''اسفند یار گیلانی؟ اس کے تو ماں باپ بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ ننھیال میں پلا بڑھا۔ ایسے بچوں کی شخصیت میں کمی رہ جاتی ہے۔ کئی قسم کی نفسیاتی پیچیدگیاں تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ایسے بندے کے ساتھ رہ کر میں خود نفسیاتی مریضہ بن جاؤں گی۔'' اپلائیڈ سائیکالوجی کی ڈگری سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

''شعیب مرزا' اے ایس پی؟ جی نہیں! مجھے کسی پولیس والے سے شادی نہیں کرنی۔ ان کو تو تربیت میں ہی شک کرنا سکھایا جاتا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میری زندگی عذاب بن جائے؟''

بے چاری خالہ اپنا سر تھام کر رہ جاتیں۔

''حوصلہ رکھو زینب بیگم! پریشان کیوں ہوتی ہو۔'' خالہ کے شوہر ضیاء الدین صاحب جن کو میں انکل کہتی تھی' رسان سے سمجھاتے۔ ''جہاں اللہ نے اس کا جوڑ رکھا ہے وہیں اس کا دل خود ہی مائل ہو جائے گا۔''

''آپ ہی کا قصور ہے۔ آپ کی دی ہوئی بے جا آزادی اور لاڈ پیار نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' وہ شکوہ کناں ہوتیں۔

معین احمد کا تعلق جنوبی پنجاب سے تھا۔ پڑھا لکھا' مہذب دھیمے لہجے میں بات کرنے والا خوش قامت اور خوش شکل نوجوان جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں لیکچرر تھا۔ وظیفے پر پی ایچ ڈی کے لیے انگلستان جانے والا تھا' کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ رشتے کروانے والی عورت نے اُس کا رابطہ خالہ زینب سے کروا دیا۔ فریحہ بی بی جواب تک کسی رشتے پر راضی نہ ہوتی تھی' معین احمد کے لیے جھٹ تیار ہو گئی۔

''مجھے بھی باہر جا کر پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔'' وہ اتنے تواتر سے کہتی گویا اس رشتے میں واحد کشش یہی تھی۔

معین کے والدین رشتہ طے کرنے آئے تو ان سے مل کر مجھے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ دیہاتی وضع کے نیم خواندہ لوگ تھے اور کسی حد تک نمائش پسند بھی۔ معین کی والدہ بار بار آستینوں کو تھوڑا سا اوپر کھینچ کر سونے کے بھاری کڑوں اور چوڑیوں کی نمائش کرتیں۔ والد کی گفتگو اپنے مربعوں' حویلی' ٹیوب ویل اور ٹریکٹروں تک ہی محدود رہی۔

میرے ذہن میں عجیب و غریب خدشات سر اٹھاتے۔ جب میں نے خالہ اور فریحہ کے سامنے ذکر کیا تو خالہ کچھ متفکر دکھائی دیں۔ مجھ سے اتفاق بھی کیا مگر معین احمد اور فریحہ کا جوڑ لکھا جا چکا تھا لہٰذا دل کا میلان ہونا ہی تھا۔ فریحہ حسبِ عادت منہ پھاڑ کر بولی ''تو کیا ہوا۔ مجھے کون سا ان پینڈوؤں کے ساتھ رہنا ہے۔ میں تو معین کے ساتھ لندن میں رہوں گی۔'' گویا اُس کا ارادہ شوہر کو لے اُڑنے کا تھا۔ اس کے گھر والے اور والدین غیر متعلقہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

فریحہ کے حصے کا رزق سمندر پار کی اجنبی سرزمینوں سے اُس کو پکارتا تھا۔ تین ماہ کے اندر اندر شادی ہو گئی اور سفری کاغذات کی تکمیل کے بعد دعاؤں کے سائے میں فریحہ بی بی لندن روانہ ہوئیں۔ خالہ نے سکھ کا سانس لیا اور بیٹوں کی جانب متوجہ ہوئیں۔ نعمان میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ انکل اُس کے لیے ذاتی ہسپتال کھولنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ زمین خرید لی گئی تھی۔ ابتدائی تیاریاں

جاری تھیں۔ فرحان ایم بی اے کر رہا تھا۔ والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ فریحہ سے کبھی کبھی میری بھی فون پر بات ہو جاتی۔

''میں نے یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔'' اس نے پرجوش لہجے میں بتایا۔ ''داخلے کے امتحان میں میری نمایاں پوزیشن آئی تھی۔ سکالرشپ مل گیا ہے۔'' اس کے انداز ہنوز یونیورسٹی کی طالبہ جیسے تھے۔

''گھر سنبھالنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بالکل نہیں، میں اور معین اپنی اپنی لانڈری خود کر لیتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دفعہ گھر کی صفائی کرنا ہوتی ہے جو زیادہ تر معین ہی کرتے ہیں اور کھانا بنانا تو مجھے آتا نہیں۔ اس بات پر اکثر معین سے ٹھن جاتی ہے۔ زیادہ تر باہر کے فاسٹ فوڈ پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے ازلی لاابالی پن سے جواب دیا گویا وہ دونوں میاں بیوی نہیں روم میٹ طالب علم تھے!

وقت کا بگٹٹ دوڑتا راہوار تین سال مزید پھلانگ گیا۔ خالہ نعمان کے لیے لڑکیاں تاکتی پھر رہی تھیں اور وہاں فریحہ ضیاء الدین کی ازدواجی زندگی کا ہچکولے کھاتا جہاز کریش کر گیا...... وہ لوٹ آئی تھی۔ ایم فل کی ڈگری اور طلاق نامہ لے کر۔

خالہ کے گھر کے اچھے بھلے پرسکون جزیرے پر شہابِ ثاقب آ گرا۔ ہر سو تباہی کے آثار تھے۔ انکل ضیاء الدین فیکٹری جانا ترک کر کے اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔ کاروبار شدید متاثر ہو رہا تھا۔ خالہ کو چپ لگ گئی۔ نعمان اور فرحان متفکر چہرے لیے صبح اپنے اپنے کام پر نکل جاتے اور رات گئے گھر آتے۔

اس یاسیت بھرے ماحول میں فریحہ نے ایک دن پھر ہلچل مچا دی۔ ''مجھے یونیورسٹی کی طرف سے ای میل آئی ہے۔ میرے ایم فل کے تحقیقی مقالے کو بے حد پزیرائی ملی ہے۔ اسی بنیاد پر پی ایچ ڈی کے لیے سکالرشپ مل گیا ہے۔ اگلے ہفتے میری روانگی ہے۔'' اس نے کسی سے اجازت یا مشورہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بس اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''بس فریحہ بہت ہو گیا!'' ہمیشہ اس کا پشت بان رہنے والا شفیق باپ بھی اب کے بھڑک اُٹھا۔ ''بہت کر لی تم نے اپنی مرضی۔ زندگی کو کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ کہیں نہیں جاؤ گی تم اب......''

''آپ لوگوں کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے تمام ادب لحاظ بالائے طاق رکھ دیا۔ ''میں پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہوں اور کسی پر بوجھ بھی نہیں۔''

وہ مکمل طور پر ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ انکل ضیاء الدین نے اپنا اختیار استعمال کرنے میں بہت دیر کر دی تھی۔

''ٹھیک ہے جو چاہو کرو۔ مگر یاد رکھو کہ اس گھر کے دروازے تم اپنے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے بند کر کے جا رہی ہو۔'' انکل کا لہجہ اُن کی اندرونی شکستگی کا پتا دیتا تھا۔

وہ چلی گئی۔ خالہ اپنی اس لاپروا اور خودسر بیٹی سے لاتعلق نہ ہو سکیں۔ کبھی کبھی فون پر خیریت پوچھ لیا کرتیں۔ روایتی ماؤں کی طرح اُس کا گھر آباد ہونے کی دعا کیا کرتیں۔

وقت ڈھیر ساری تبدیلیاں لے آیا تھا۔ فریحہ کا گھر آباد ہوا یا نہیں البتہ نعمان فرحان کے گھر آباد ہو گئے۔ ان کی شادیوں میں فریحہ کو یاد تک نہ کیا گیا۔ خالہ اب اس کے ذکر سے کترانے لگی تھیں۔ اگر کوئی اُس کے بارے میں پوچھ بیٹھتا تو موضوع بدل دیتیں۔

اُن کا آنگن بہوؤں، پوتوں، پوتیوں سے آباد ہو گیا۔ حرا اور سارہ جیسی ہنس مکھ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کا آنا گھر میں مثبت تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ننھے بچوں کا ہنسنا، رونا، چہکنا، بسورنا اور جابجا بکھرے رنگ برنگے کھلونے یہ نوید سناتے تھے کہ اب یہاں نئے موسم اُترے ہیں اور فریحہ......؟ وہ تو جیسے اس گھر کا کبھی حصہ ہی نہ رہی تھی۔

ان نئے موسموں کے ہنگاموں میں ایک پرانے مگر چھتنار پیڑ کو غم کی دیمک چاٹ گئی۔ انکل ضیاء الدین جو کچھ عرصے سے شوگر اور بلڈ پریشر جیسے عوارض میں مبتلا تھے، دل کے شدید دورے میں جان ہار گئے...... ایک زلزلے کا جھٹکا تھا جو گھر کے در و دیوار پھر سے ہلا گیا۔

تعزیت کے لیے آئی خواتین میں گھری خالہ زینب کے قریب آ کر سارہ نے ہاتھ میں موبائل فون پکڑاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''ماما! فریحہ کا فون ہے بات کر لیں۔'' خالہ نے موبائل پکڑا اور لائن کاٹ دی۔ ''آئندہ اس کا فون آئے تو کال ریسیو نہیں کرنی۔'' انھوں نے موبائل سارہ کو لوٹاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

اُن کا لہجہ بے حد پتھریلا تھا۔ قریب بیٹھی ہونے کی وجہ سے یہ گفتگو صرف میں ہی سن پائی تھی اور یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اتنی شدید ناراضگی کے پیچھے یقیناً کوئی بہت بڑی وجہ ہے۔ وجہ جاننے کے لیے میں نے کئی مرتبہ خالہ سے بات کرنے کی ٹھانی مگر جو زخم عیاں نہیں تھے اُن کی رفوگری تو ممکن نہ تھی۔ کریدنے سے تکلیف ہی بڑھتی۔ سو میں اپنے اندر بات کرنے کی ہمت پیدا نہ کر سکی۔ کچھ عرصے سے اُن کی صحت بھی خراب چلی آ رہی تھی۔ انکل کے بعد تو انھوں نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں ضیاء سے ہمیشہ دو قدم پیچھے رہی ہوں۔ بس دو قدم کا فاصلہ ہے اُن تک پہنچنے میں...... اور ایسا ہی ہوا!

حرا کا فون اچانک ہی آیا تھا۔ ''ماما بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میں نے ایمبولینس کو کال کر دیا ہے۔ آپ فوراً آ جائیں'' اور اگلے ہی منٹ میں اُن کے گھر پر موجود تھی۔ سارہ اُن کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ پریشانی سے گویا ہوئی ''بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھا ہوا ہے۔ اللہ خیر کرے۔'' نعمان فرحان کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ سائرن بجاتی ایمبولینس دروازے پر آ موجود ہوئی۔

''میں بچوں کے ساتھ گھر پر رک جاتی ہوں۔ آپ اور حرا بھابی ماما کو لے کر ہسپتال پہنچیں۔'' سارہ نے ایک ہینڈ بیگ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ اس میں میڈیکل رپورٹس اور دوائیں ہیں۔ رکھ لیں شاید ضرورت پیش آ جائے۔''

میں اور حرا خالہ کو لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے مگر وہ کہیں بیچ راستے میں ہی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے ابتدائی معائنے میں ہی اُن کی موت کی تصدیق کر دی۔

......اور خالہ کے بیگ سے گرنے والی اشیاء سمیٹتے ہوئے جس تصویر نے میرے وجود میں زلزلے برپا کر دیے وہ فریحہ کی تصویر تھی۔

سفید عروسی لباس میں ملبوس ہاتھ میں روایتی انداز میں گلدستہ تھامے ہوئے۔ درمیانی عمر کا سفید فام مرد اُس کے عریاں شانوں کو تھامے ہوئے تھا۔ وہ دونوں ایک چرچ کے باہر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

فریحہ کی مذہب سے دلچسپی ہمیشہ سے رسمی ہی تھی مگر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مرتد ہو جائے گی۔ غالباً یہی صدمہ تھا جو اُس کے ماں باپ کی جان لے گیا۔ وہ اُس کی نافرمانیوں اور بدتمیزیوں کو بھول سکتے تھے مگر جب اُس نے دینِ حنیف سے اپنا رسمی تعلق بھی توڑ لیا تو ماں باپ نے اُس کو چھوڑ دیا۔ جیتے جی اپنے وجود کے کسی حصے کو کاٹ پھینکنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے اس کو وہی کچھ بہتر سمجھ سکتے ہیں جن کے حصے میں ایسی اذیت آتی ہے۔

کیا یہ کہانی یہاں ختم ہو گئی؟

فریحہ ضیاء الدین اپنے خونی رشتوں کے لیے آزمائش تھی یا سزا؟ کیا اس کے والدین اپنی سب سے چہیتی اولاد کے ذریعے آزمائے گئے تھے؟ کیا بیتی ہو گی اُن پر جب وہ دوراہے پر کھڑے تھے کہ بیٹی یا رب میں سے کسی ایک تعلق کا انتخاب کر لیں؟

ایسے بہت سے تشنہ سوالوں کے جواب آخرکار مجھے مل ہی گئے..... مگر ہزاروں میل دور' کوپن ہیگن کے مضافاتی قصبے ہوئی تاسترپ (Hoje Tastrup) کے ایک ہوٹل میں.....!

میرے شوہر رضوان کو کمپنی کی طرف سے ایک تربیتی ورکشاپ میں شرکت کرنے کو پن ہیگن جانا تھا۔ پیرس اور کوپن ہیگن وہ شہر تھے جن کو دیکھنے کی آرزو ہمیشہ مجھے رہی۔

''مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔'' میں نے رضوان سے فرمائش کر ڈالی۔ ''مجھے کوپن ہیگن دیکھنا ہے۔''

میرے دونوں بیٹے نوفل اور اویس بڑے ہو چکے تھے۔ لہٰذا دو ہفتوں کے لیے کہیں جانے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ رضوان نے ہامی بھری اور میں خوشی خوشی تیاری کرنے لگی۔

کوپن ہیگن میں ہمارا قیام مضافاتی قصبے ''ہوئی تاسترپ'' کے ایک ہوٹل میں تھا۔ ماہ ستمبر میں شہر کے ہنگاموں سے دور اس کشادہ اور پرسکون قصبے میں رنگوں بھری خزاں اُترتی تھی۔ میپل کے بلند و بالا درختوں کے پتے سبز سے آتشی' سُرخ سے پھر پیلے ہوئے جاتے تھے۔ ویک اینڈ کے دو دنوں میں ہم نے کوپن ہیگن کے تمام اہم مقامات دیکھ ڈالے۔ پریوں کی سرزمین ایسا مشہورِ زمانہ پارک ''توالی'' اور شاہی محل جہاں روزانہ دوپہر بارہ بجے گارڈ کی تبدیلی عمل میں لائی جاتی۔

ملکہ کے محافظ دستوں کا مارچ پاسٹ ایک دلکش نظارہ پیش کرتا تھا۔ یورپ کی طویل ترین واکنگ سٹریٹ' سترو گے (Stroget) جہاں ہر وقت میلے کا سماں رہتا ہے۔ ''نی ہاون'' جہاں نہر کے دونوں طرف اٹھارہویں انیسویں صدی کی عمارتیں اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں جن میں زیادہ تر ریستوران' بار یا کیفے میں تبدیل ہو چکی ہیں.....

کوپن ہیگن کی سیر نے میری زندگی کی ایک بڑی خواہش پوری کر دی۔ میں سرشاری کے عالم میں واپسی کی تیاری کر رہی تھی۔ رات دو بجے کی پرواز سے واپسی تھی اور اُسی دوپہر کو وہ مجھے نظر آ گئی۔ لانگ اسکرٹ پر ڈھیلا ڈھالا آف وائٹ گاؤن پہنے' بالوں کو رنگین اسکارف سے ڈھانپے وہ کانفرنس ہال سے نکل رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر ٹھٹکی اور آگے بڑھ گئی۔

''بھابی.....!'' اُس نے مجھے پکارا تھا۔ میرے اندر رنج اور نفرت کی ایک لہر سی اٹھی اور میں نے قدم تیز کر دیے۔

''بھابی پلیز رکیں.....'' وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آ رہی تھی۔ ''پہچانا نہیں آپ نے مجھے۔''

''میں صرف فریحہ ضیاء الدین کو جانتی تھی۔ کسی نینسی کیتھی لارا کو نہیں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''میں فریحہ ضیاء الدین تھی' ہوں اور رہوں گی۔ سچ میں جو کچھ بھی ہوا وہ ایک بھیانک خواب تھا۔ پلیز رُک کر میری بات سن لیں۔ بلانے والوں کو دھتکارا نہیں جاتا۔'' اُس کی آواز غیر معمولی بلند ہوئی تھی۔ لابی میں آتے جاتے لوگ متوجہ ہو رہے تھے۔

''میرے ساتھ آؤ' کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔'' میں اُسے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ یہاں کیسے؟ میں تو حیران رہ گئی آپ کو دیکھ کر۔ رضوان بھائی کے ساتھ آئی ہیں؟ کہاں ہیں وہ؟'' کمرے میں پہنچ کر اس نے پے در پے سوالات کر دیے۔

''رضوان ایک تربیتی ورکشاپ کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ میں بھی کوپن ہیگن دیکھنے کے شوق میں ساتھ آ گئی۔ رضوان آج کمپنی کی مقامی برانچ کا وزٹ کرنے گئے ہیں۔ رات دو بجے ہماری واپسی ہے اور پلیز مجھے اپنے بارے میں بتا دو کیونکہ تمہارے گھر میں تمہارے متعلق بات کرنا بھی منع تھا۔ میں صرف ایک تصویر کے حوالے سے تھوڑا بہت سمجھ سکی ہوں وہی جانتی ہوں۔'' میں نے خالہ کے بیگ سے برآمد ہونے والی تصویر کے بارے میں بتایا۔ میرا تجسس انتہا کو چھو رہا تھا۔

''بس.....!'' اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''یوں سمجھ لیں ایک تاریک دور تھا جہالت کا' لاعلمی کا' جو گزر گیا۔ ماں باپ کی دعائیں ساتھ تھیں جو میں لوٹ آئی۔''

''فریحہ پلیز واضح بات کرو۔ میں پہیلیاں بوجھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میں پھر سے تلخ ہونے لگی۔

''میں اسی طرف آ رہی ہوں۔'' اس نے میرے لہجے کا بُرا منائے بغیر جواب دیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک من موجی اور لاپروا لڑکی تھی۔ مذہب سے میرا تعلق محض رسمی تھا۔ یورپ کے لادین معاشرے کے اثرات نے وہ رسمی تعلق بھی ختم کر دیا۔ فریڈرک یونیورسٹی میں میرے استاد تھے۔ میں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ اُن کی نگرانی میں ہی مکمل کیا تھا۔ اُن کا بریک اپ ہو گیا تو مجھے شادی کی پیش کش کر دی۔ میں جس کے نزدیک مذہب کا مختلف ہونا ایسا ہی تھا جیسے شکل کا' فریڈرک کی پیشکش کو رد نہ کر سکی۔ امی ابو سے براہ راست بات نہ کر پائی اور اُن کو شادی کی تصویری سیل کر دی۔ اس کے بعد امی ابو سے آخری گفتگو ہوئی۔ جو میں کبھی نہ بھول پاؤں گی۔

''فریحہ' آج سے ہمارا تمہارا ہر ناتا ختم ہوا لیکن میں ماں ہوں۔ ماں سانس لینا بھول سکتی ہے مگر اولاد کے لیے دعا کرنا نہیں۔ میری ہمیشہ دعا رہے گی کہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اگر میری دعا نے قبولیت پائی اور تم پلٹ آئیں تو میری بانہوں کو اپنے لیے کھلا پاؤ گی۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔''

افسوس کہ ان کے جیتے جی میں پلٹ نہ سکی۔ شاید میرے والدین میرے جیسی ناخلف اولاد کے ذریعے آزمائے جا رہے تھے۔ پھر جب وہ مجھ سے نہ ملنے کے عہد پر قائم رہتے ہوئے یکے بعد دیگرے دنیا سے ہی اُٹھ گئے تو مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ امی ابو نے کیونکر اپنی لاڈلی بیٹی کو ایک ان دیکھے وجود کی محبت پر قربان کر دیا۔ انسانی فطرت میں پنہاں تجسس جب اُس کو اپنے وجود کے بارے میں جاننے پر مجبور کر دیتا ہے تو عقل سلیم اُس کی راہنمائی کا بیڑا اٹھا لیتی ہے۔ اسی تجسس نے مجھے اُس ان دیکھے وجود کی حقیقت سے روشناس کروا دیا۔ گویا کہ مجھے میری حقیقت سے روشناس کروا دیا۔ پھر مجھے واپسی میں دیر نہ لگی۔''

میرے گلے میں جیسے کچھ اٹکنے لگا تھا۔ میں نے اُٹھ کر فریحہ کو بے اختیار لپٹا لیا۔ ہم دونوں کے آنسو بہ نکلے۔

''بھابی! آپ میرے گھر والوں کو میرے بارے میں ضرور بتائیے گا۔ اگر وہ مجھے اپنا لیں تو پہلے سے یکسر مختلف پائیں گے۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے صدق دل سے کہتے ہوئے اُس کا ماتھا چوم لیا ''اور ہاں! مجھے پوچھنا یاد نہیں رہا۔ تم یہاں کیسے؟ کیا آج کل کوپن ہیگن میں رہتی ہو؟''

''نہیں لندن میں ہوں۔ یہاں ایک کانفرنس کے سلسلے میں آئی ہوں۔''

اور اُس رات فریحہ ضیاء الدین جب کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر ہمیں رخصت کر رہی تھی تو رضوان نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے اس کو بھینچ بھینچ کر گلے لگایا۔ فریحہ کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے اور اُس کے چہرے پر نئی صبح کا نور پھیل رہا تھا۔

کوپن ہیگن ہوائی اڈے کی جگمگاتی اور پررونق شام میں مجھے اور رضوان کو رخصت کرنے کے ٹھیک دو ماہ بارہ دن بعد فریحہ ضیاالدین ایک بار پھر اپنوں میں تھی۔ بھائی اپنی جھگڑالو اور نک چڑھی آپی کی جگہ محبت کرنے والی شفیق بڑی بہن کو پا کر نہال ہو گئے۔ بھابیاں اپنی اعلیٰ تعلیم یافتہ نند کی خاطر داری میں بچھی جاتی تھیں۔ ننھے بچے اپنی پھوپھو کی گود میں چڑھتے' کندھوں پر جھولتے' نئے رشتے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

●●●

تابش دہلوی

سب نے مجھ ہی کو دَر بدر دیکھا
بے گھری نے مرا ہی گھر دیکھا

بند آنکھوں سے دیکھ لی دنیا
ہم نے کیا کچھ نہ دیکھ کر، دیکھا

دُور تک لے گئی طلب اُس کی
نقشِ پا کو بھی رہ گزر دیکھا

خود بھی تصویر بن گئیں نظریں
ایک صورت کو اس قدر دیکھا

کہیں موجِ نمو رُکی تو نہیں
شاخ سے پھول توڑ کر دیکھا

یاد اپنی اُڑانیں آئی ہیں
جب بھی کوئی شکستہ پر دیکھا

ہم نے حُسنِ ہزار منظر کو
کتنی نظروں سے اک نظر دیکھا

اب نمو پائیں گے دِلوں کے زخم
ہم نے اک پھول شاخ پر دیکھا

سب نہیں دیتے پھل مگر تابشؔ
سایہ دار ایک اک شجر دیکھا

☆☆☆

امیر مینائی

ہم مر گئے آنے کی جو ان کے خبر آئی
افسوس اجل چار قدم پیشتر آئی

بولے وہ مری شکل جو حیراں نظر آئی
دیوار کہاں سے مرے گھر میں یہ در آئی

ظلمت شب فرقت جو یہ چھائی مرے گھر میں
جب دوپہر آئی تو میں سمجھا سحر آئی

اتنا تو پتا ہجر کی شب صبح کا پایا
صد شکر کہ بالوں میں سفیدی نظر آئی

کیا بے خبری ہے کہ ہوئے عشق کو برسوں
اب تک نہیں معلوم طبیعت کدھر آئی

مہمان کی صورت اسے آنکھوں میں جگہ دی
دامن سے لگی گھر میں جو گردِ سفر آئی

چھائی تھی امیرؔ اس کی صباحت جو نظر میں
شام آئی مرے گھر میں تو سمجھا سحر آئی

☆☆☆

ماہر القادری

رازِ ہستی کی یہاں کس کو خبر ہوتی ہے
زیست اک سلسلۂ شام و سحر ہوتی ہے

میں تری یاد کو اے دوست! دعا دیتا ہوں
زندگی غم میں بھی راحت سے بسر ہوتی ہے

ٹھوکروں ہی سے تو ملتا ہے سراغِ منزل
ظلمتوں ہی سے نمودار سحر ہوتی ہے

وہ ابھی سامنے آئے تھے تصور بن کر
دل کی دھڑکن سے بھی تائیدِ نظر ہوتی ہے

☆☆☆

عرش ملسیانی

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
نہ کسی کے دل میں غبار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

چلی ہے کیسی ہوا کہ اب، نہیں کھلتے پھول ملاپ کے
کبھی دورِ فصل بہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تھیں بہم نشاط کی محفلیں، تھیں قدم میں لطف کی منزلیں
بڑا زندگی پہ نکھار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تھی ہر ایک بات میں چاشنی، حق و صدق و لطف و خلوص کی
رہِ حق پہ چلنا شعار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے لڑ کے ہم سے اگر جدا، رکھی اور ملک کی اک بنا
یہ تمہیں کا شوقِ فرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئی جنگ و حرب کی ابتدا، تو بتاؤ بس یہی اک پتا
کوئی تم میں ننگِ وقار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

☆☆☆

رئیس امروہوی

اپنے کو تلاش کر رہا ہوں!
اپنی ہی طلب سے ڈر رہا ہوں

تم لوگ ہو آندھیوں کی زد میں
میں قحطِ ہوا سے مر رہا ہوں

خود اپنے ہی قلبِ خونچکاں میں
خنجر کی طرح اُتر رہا ہوں!

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے؟
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

اک شخص سے تلخ کام ہو کر
ہر شخص سے پیار کر رہا ہوں

اے دجلۂ خوں! ذرا ٹھہرنا!
اس راہ سے میں گزر رہا ہوں

فریاد کہ زیرِ سایۂ گل!
میں زہرِ خزاں سے مر رہا ہوں

اے شہرِ خیال کے مسافر
کیا میں ترا ہم سفر رہا ہوں

☆☆☆

اقبال عظیم

میں مستند نہ کسی اور کی سند سے ہوا
میں سربلند ہوا تو خود اپنے قد سے ہوا

کسی عطا، نہ کسی اور کی مدد سے ہوا
مرا جو کام ہوا، رحمت اَحد سے ہوا

ہر ایک گام پہ نصرت مجھے نصیب ہوئی
مگر یہ کام ذرا جدوجہد و رَدّ و کد سے ہوا

حریف کوئی نہ شایانِ شان مجھ کو ملا
مناقشہ جو ہوا بھی تو نابلد سے ہوا

خدا کے فضل سے میں ہر طرح اَمان میں ہوں
زیاں کوئی بھی نہ میرا دعائے بد سے ہوا

گرا زمانے کی نظروں سے اور خفیف ہوا
بزعمِ خود کوئی باہر جو اپنی حد سے ہوا

وہ خوش کلام بھی ہیں اور با ہُنر بھی مگر
جو شہرہ ان کا ہوا ہے تو خال و خد سے ہوا
نہ دین پہلے کہیں تھا اور نہ دین اب ہے کہیں
اگرچہ شورِ شریعت تو شد و مد سے ہوا

جنوں کو ہوش کہاں اہتمامِ غارت کا
فساد جو بھی جہاں میں ہوا خرد سے ہوا

خود اپنے علم پہ بھی ناز ہے مجھے، لیکن
میرا جو نام ہوا فیضِ اب و جد سے ہوا

☆☆☆

عاصی کرنالی

نقشِ گل ہوں ایک دن داغِ خزاں رہ جاؤں گا
مِٹ کے بھی میں اپنے ہونے کا نِشاں رہ جاؤں گا

ہاں تو اے دستِ فنا کتنا سمیٹے گا مجھے
میں سمٹ کر بھی کم از کم آسماں رہ جاؤں گا

میں غبارستانِ عالم میں ہوں موجِ روشنی
ٹوٹ کر بکھروں گا پھر بھی کہکشاں رہ جاؤں گا

در قفس کا کھول دو، چاہے مجھے اُڑنے نہ دو
میں گلستان و قفس کے درمیاں رہ جاؤں گا

ایک آئینہ ہے، میں اُس میں کسی کا عکس ہوں
آئینہ جس روز ٹوٹا میں کہاں رہ جاؤں گا

میں کسی اچھے سے مستقبل پہ ہوں گا منکشف
ایسی خوش فہمی میں اُلجھا تو نہاں رہ جاؤں گا

اَب تو اپنی رفعتوں کی سمت اُڑنے دو مجھے
جس فلک پر مجھ کو روکو گے وہاں رہ جاؤں گا

☆☆☆

تاجدار عادل

ساون رُت اور اُڑتی پُروا تیرے نام
دھوپ سے یہ تحفہ تیرے نام

سُرخ گلاب کے سارے موسم تیرے لیے
خوابوں کا ہر ایک دریچہ تیرے نام

چاند کی آنکھیں پھول کی خوشبو بہتی رات
قربت کا ہر ایک وسیلہ تیرے نام

برف میں پھیلا شام دھندلکا تیرے لیے
ہر ایک صبح کا پہلا اُجالا تیرے نام

ہنستی ہوئی سی تیری آنکھیں میرے لیے
بہتی جھیل میں پھول کنول کا تیرے نام

تیری یاد کا بہتا دریا میرے لیے
چاہت کا یہ تنہا جزیرہ تیرے نام

دُنیا بھر میں جتنے منظر اچھے ہیں
اُن کا حُسن اور شور ہوا کا تیرے نام
میری خواہش میرا چہرہ میرے ہاتھ
میری سوچیں اور تمنّا تیرے نام

میں نے اب تک جو کچھ سوچا تیرے لیے
میں نے اب تک جو کچھ لکھا تیرے نام

یاد ہے تجھ کو عادل جس کا نام تھا وہ
اب تک ہے جو آدمی تنہا تیرے نام

☆☆☆

احسان

وہ ایک بے یار و مددگار لڑکی کا سہارا بننا چاہتا تھا مگر ایک دن...

احمد ندیم قاسمی

دھوپ نشہ آور تھی، مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

اس وقت آسمان اتنا نیلا ہو رہا تھا جیسے اسے چھولو، تو پوریں نیلی پڑ جائیں۔ سورج مشرق میں پینتالیس کے زاویے پر تھا۔ رات کی بارش میں اینٹوں کی چھت ڈھل گئی تھی اور دھوپ نے اینٹوں کو صیقل سا کر دیا تھا۔ اتنی کھلی چھت پر میں ایک کُرسی اور ایک تپائی رکھ کر اخبار پڑھنے لگا تو وہ مجھے اجنبی اجنبی سا لگا۔ سو میں نیچے جا کر ایک رسالہ اُٹھا لایا اور تب دھوپ کو شرارت سوجھی اور میں غنودہ سا ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے اپنے پپوٹے لہو کی طرح لال نظر آئے۔ میں نے سوچا کتنی عجیب بات ہے کہ ہم بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں جیسے اس وقت میں اپنے پپوٹے دیکھ رہا ہوں۔ کوشش کی جائے تو بند پپوٹوں سے شاید اور بھی بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہو۔

میں نے غنودگی سے جنگ کرنے کی ٹھانی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو میں

نے ناشتا کیا تھا۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے؟ یہ علم الابدان کا کوئی راز ہوگا کہ جب سرما کی دھوپ میں انسان اپنی نظریں کتاب پر یا کسی ایک نقطے پر مرکوز کردے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ نیند سے بچنے کے لیے میں رسالے کی ایک غزل گنگنانے لگا، مگر میری گنگناہٹ بہت مدھم تھی۔ ممکن ہے پڑوس کی چھت پر خواتین میری طرح بیٹھی دھوپ سینک رہی ہوں۔ میری اور پڑوس کی چھت کے درمیان جو حد فاصل تھی وہ انسان کے اوسط قد سے بھی ہاتھ بھر اونچی تھی۔ پھر جہاں پردے کے سلسلے میں اتنی احتیاط برتی گئی ہو، وہاں بلند آواز سے گنگنانا معیوب ہی ٹھہرے گا۔

دھپ دھپ کی آواز سے میں چونکا۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اُٹھ کر نیچے صحن میں جھانکا۔ میرے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں پلٹا تو دھپ دھپ کی ایک اور آواز آئی۔ اب میں نے اس کی سمت معین کرلی تھی۔ یہ آواز چھتوں کی حد فاصل کی دوسری جانب سے آرہی تھی۔ میں سمجھا بچے کھیل رہے ہیں سو واپس آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک بار پھر دھپ دھپ ہوئی اور پھر ایک نسوانی آواز آئی۔ ''سنیے!''

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ''جی۔ آپ مجھ سے تو مخاطب نہیں ہیں؟''

''آپ ہی سے مخاطب ہوں۔'' آواز آئی۔ ''مجھے معلوم ہے آپ اس مکان میں دو چار روز پہلے ہی تشریف لائے ہیں اور آپ سے کوئی جان پہچان بھی نہیں، مگر سوچا آپ کو تکلیف دے کر دیکھتی ہوں۔ آپ کا کوئی ملازم ہے گھر کے کام کاج کے لیے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہوٹل سے کھانا کھا لیتا ہوں۔''

''اس وقت آپ کے پاس کوئی دوست بیٹھے ہوں تو ان سے کہہ دیجیے۔''

''جی نہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''اکیلا ہوں، مگر آپ کہیے تو، کوئی کام ہے کیا؟''

''جی ہاں۔'' آواز آئی۔ ''میرے ابا جی پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور گھر میں صرف میں ہوں۔ دن کا وقت ہے اور میں پردہ کرتی ہوں۔ ایک دوا لانی ہے دکان سے۔ نسخہ میرے پاس ہے۔ کیا آپ تکلیف کرسکیں گے؟''

''بخوشی۔'' میں نے کہا۔ ''میں ادھر گلی میں آپ کے دروازے پر آتا ہوں۔ نسخہ دے دیجیے تو ایک منٹ میں دوا لاتا ہوں۔ دواؤں کی دکان تو چند قدم پر ہے..... گلی کے موڑ پر۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے۔''

میں فوراً نیچے گلی میں آیا اور پڑوس کے دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ دروازے پر پردے کے لیے ایک پرانا پلنگ پوش آویزاں تھا۔ اپنی موجودگی کا بتانے کے لیے میں کھنکارا تو دبی دبی آواز آئی۔ ''اچھا آپ تشریف لے آئیے! لیجیے۔''

ایک ہاتھ لٹکی ہوئی چادر کے ایک طرف سے نکلا۔ سانولا اور تازہ تازہ سا جیسے ابھی ڈھل کر نکلا ہے۔ ہاتھ چاہے میلا ہو چاہے صاف، سانولا ہو چاہے سفید، انسان کی عمر بتا دیتا ہے۔ لوگ عمروں کے اندازے کے لیے خواہ مخواہ چہروں کو گھورتے رہ جاتے ہیں۔ ہاتھ انسانی عمر کا سچا غماز ہوتا ہے۔ وہ کمپیوٹر کی سی صحت کے ساتھ انسانی عمر کا اعلان کردیتا ہے۔ اس سانولے اور تازہ ہاتھ والی کی عمر بیس بائیس برس کے آس پاس ہوگی۔

میں نے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی پوروں کے درمیان تھما ہوا نسخہ اور ایک روپے کا نوٹ لے لیا اور کہا ''میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

''جی شکریہ۔'' آواز کو شعوری طور پر دبا کر سرگوشی بنا دیا گیا تھا۔

عام سی دوا تھی۔ میں دو گولیاں لے کر فوراً پلٹا اور ایک بار پھر دروازے پر کھنکارا۔ ''ارے! اتنی جلدی!'' ہاتھ چادر کے ایک طرف سے باہر آیا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے بڑا احسان کیا ہے۔''

''احسان!'' میں نے حیرت سے کہا اور گولیاں نسخے سمیت ہتھیلی پر رکھ دیں۔ ''احسان کا وزن تو بہت بھاری ہوتا ہے بی بی۔ ان دو گولیوں کا وزن تو احسان کے وزن کے باسنگ بھی نہیں۔''

''جی میں گولیوں کے وزن کی بات نہیں کر رہی۔'' آواز آئی۔ ''ایک اجنبی کے لیے چھت سے اترنے، یہاں آنے اور دوا لانے کا اپنا ایک وزن ہے۔ آپ نے احسان کیا ہے اس لیے وزن کو محسوس نہیں کر رہے۔ میں نے احسان لیا ہے اس لیے میری گردن احسان کے بار سے جھکی ہوئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔''

پھر مجھے اس کے جانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے گھر کی چھت پر آکر رسالہ کھول لیا، مگر وہاں سب لوگ حیات و کائنات کے مسائل سمجھنے میں لگے ہوئے تھے۔ میری دستگیری کون کرتا۔ میں نے رسالہ میز پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور پپوٹوں کی لہولہو سرخی کے پار دیکھنے لگا جہاں سے ایک ہاتھ چٹکی میں کاغذ کا ایک پرزہ لیے اُبھرا اور پھر جیسے لہولہو ہو کر سُرخی میں تحلیل ہوگیا۔ ایک بار پھر اُبھرا، پھر تحلیل ہوگیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چھوٹی بات! میں نے سوچا۔ مجھے لڑکی کا ہاتھ نظر آرہا ہے مگر اس کا فالج زدہ باپ دکھائی نہیں دیتا جس کے لیے دوا لانے والا ہی کوئی نہیں۔

میں رسالے کو بغل میں مار کر نیچے کمرے میں آگیا۔ ہر شے ٹھہری ہوئی تھی مگر خود میں کتنا تپ رہا تھا۔ ہم مشرقی لوگ بھی عجیب ہونق لوگ ہیں۔ اپنے لیے اتنے فلک بوس اخلاقی قلعے تعمیر کرتے ہیں کہ دیوار پھٹے تو باہر کے منظر کی کوئی جھلک نظر آئے۔ ہم خود ہی اپنی آنکھوں کو اندھا کر کے عمر بھر اپنے اندھے پن کا علاج ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

شام کو میں گھر سے نکلا تو چار قدم پر ہی پڑوس کا وہ دروازہ تھا جس پر ایک پرانا پلنگ پوش لٹک رہا تھا۔ سوچا، لڑکی کے ابا کی مزاج پرسی کر لینی چاہیے۔ پڑوسیوں کے تو ایک دوسرے پر بہت حقوق ہوتے ہیں۔ میں نے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔

''کون!'' دور سے لڑکی کی آواز آئی۔

''جی میں۔ آپ کا پڑوسی۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ کے ابا جی کے مزاج کیسے ہیں؟''

''اچھا تو آپ ہیں!'' اس کی آواز میں اطمینان تھا۔ ''میں اُوپر چھت کی دیوار پر بہت دیر تک دھپ دھپ کرتی رہی۔ پھر سوچا آپ کہیں چلے گئے۔''

''جی میں تو نیچے کمرے میں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ میرا دروازہ کھٹکھٹا دیتیں۔''

وہ بولی۔ ''اس کے لیے مجھے گلی میں جانا پڑتا اور میں عرض کرچکی ہوں کہ میں پردہ کرتی ہوں۔''

''جی۔'' میں مسئلے کی نزاکت سمجھ گیا۔

وہ کہنے لگی ''اب یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا کہ آپ گلی میں میرے دروازے پر کھڑے ہیں اور میں پردے کے پیچھے سے آپ سے باتیں کر رہی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لوگ پرسے کو ابنانے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔''

یکا یک مجھے بھی احساسِ جرم ہوا۔ میں نے ایک قدم ہٹ کر کہا: ''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔ میں تو صرف مزاج پُرسی.....''

''مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں آپ کو کیوں بلا رہی تھی۔'' اس نے لٹکتے ہوئے پلنگ پوش کا ایک کنارا ہاتھ میں لے لیا۔ کمپیوٹر چلنے لگا۔

''جی، جی۔'' میں نے کہا۔ ''فرمایئے۔ میرے لائق کوئی خدمت؟''

''ڈاکٹر کو بلانا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ابا جی کی حالت ویسی ہی ہے اور پہاڑ جیسی رات آنے والی ہے۔ میں کل شام کے اندھیرے میں برقع اوڑھ کر ڈاکٹر عبدالقدوس کو بلا لائی تھی۔ انہی کو پھر بلانا ہے۔ قریب ہی ہوتے ہیں۔ آپ کو تکلیف ہوگی مگر کیا کروں، ابا جی کو تنہا چھوڑتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً آ جائیں گے۔ ابا جی سے ان کی جان پہچان ہے۔''

''ابھی لاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ان کے کلینک کا بورڈ دیکھا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب معمر اور نحیف و نزار بزرگ تھے۔ وہ نسخہ لکھ رہے تھے اور ایک تنومند مریض ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ مریض دراصل ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر صاحب دراصل مریض ہیں۔ میں نے جا کر عرض کیا تو فوراً نسخہ مریض کے حوالے کیا، اسٹیتھو سکوپ اُٹھا کر میرے ساتھ چل پڑے۔

میں نے جا کر دستک دی اور ساتھ ہی کہا: ''ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔''

''جی اچھا۔'' دور سے آواز آئی۔ پھر پلنگ پوش پورے کا پورا اٹھ گیا۔ لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں سمجھا اس نے بدحواسی میں پردہ اٹھا دیا تھا، چنانچہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ بولی ''کوئی بات نہیں۔ آپ بھی آ جایئے۔ میں نے ابا جی کو بتا دیا ہے۔'' پھر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھی۔ ''ابا جی سُن بھی رہے ہیں، دیکھ بھی رہے ہیں، بس بول نہیں سکتے۔''

جب وہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی تو میرے دل نے گواہی دی کہ کمپیوٹر کا اعلان حرف بہ حرف، نقطہ بہ نقطہ درست تھا۔

یہ گھر بالکل میرے گھر کے مشابہ تھا۔ گلی میں کھلنے والا دروازہ دراصل پہلے کمرے کا دروازہ تھا۔ دوسرا کمرا ملحق تھا۔ بغل میں باورچی خانہ اور کائنات ختم۔ اگر حیوانات اشرف المخلوقات ہوتے اور انسانوں کو پالتو جانوروں کی طرح رکھتے تو ان کے لیے ایسے ہی ڈربے بناتے۔

ڈاکٹر صاحب اور لڑکی تو دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں کھڑا یہ سوچتا رہ گیا کہ ایک ہی دِن میں ایک جوان پردہ نشین کا یوں بے تکلفی سے سامنے آ جانا ضرورتاً بھی ہو سکتا ہے اور مجبوراً بھی۔ ضرورتاً یوں کہ باپ کی بیماری میں کام آنے والا کوئی تو ہونا چاہیے اور مجبوراً یوں کہ..... آخر کبھی کے سینے میں دل ہوتا ہے اور باپ بیمار بھی پڑا ہو تو دل کے احکام ٹالے نہیں جا سکتے۔

''آپ تو باہر کھڑے رہ گئے۔'' لڑکی دوسرے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ ''اپنوں سے کیا پردہ، آ جایئے نا!''۔

ایک کوندے کی طرح یہ فیصلہ میرے دل و دماغ میں لپک گیا کہ معاملہ ضرورت کا نہیں، مجبوری کا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ایک لمحے میں میرا قد ایک آدھ اِنچ ضرور بڑھ گیا ہوگا۔

لڑکی کے ابا جی خاصے وجیہہ، مگر بے حد کمزور بزرگ تھے۔ چھوٹی سی آدھی سفید آدھی سیاہ ڈاڑھی تھی۔ مجھے دیکھا تو آنکھوں نے ان کے ہونٹوں کے فرائض انجام دیے۔ وہ مُسکرا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ مُسکراہٹ نظر آ گئی۔ بولے۔ ''صبیحہ بیٹی۔ قریشی صاحب اس نوجوان کو دیکھ کر خوش ہوئے ہیں''۔

میں سمجھا صبیحہ جھینپے گی مگر وہ بظاہر ذرا سی بھی تو نہیں جھینپی۔ صرف اتنا بولی۔ ''میں ابا جی کو بتا چکی ہوں کہ ہمارے یہ پڑوسی صاحب بڑا دَرد مند دل رکھتے ہیں۔''

اب تو میں صبح و شام ذرا سی دستک دے کر پردہ اٹھاتا اور اندر چلا جاتا۔ میں قریشی صاحب کی دوا کے علاوہ ان کے گھر کا سودا بھی لانے لگا۔ ایک دن صبیحہ نے مجھ سے بال پین تک

منگوائے؛ البتہ بات چیت ''تکلیف معاف'' اور ''آپ نے بڑا احسان کیا ہے'' سے آگے نہ بڑھی۔ صبیحہ مجھے دیکھتے ہی بہت فراخدلی سے مسکراتی اور مجھے کام پر روانہ کر دیتی۔ رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تو اس کی ایک ایک حرکت کا بہت گہرا نفسیاتی تجزیہ کرتا۔

سودے کے لیے رقم دیتے ہوئے اس کی پوریں میرے ہاتھ سے یوں ہی تو نہیں چھو گئی تھیں۔ پرسوں شام کو وہ میرے سامنے دوپٹے کے بغیر یوں ہی تو نہیں آ گئی تھی۔ مجھے جو اس نے کہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں رُل جاتی، تو اتنی بامعنی بات اس نے یوں ہی تو نہیں کہہ ڈالی تھی۔ نہیں، میں اُسے رُلنے نہیں دوں گا۔ ایسی ہیرا لڑکیاں رُلنے کے لائق نہیں ہوتیں۔

ایک رات میں نے طے کیا کہ اب اظہار میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجھ میں جرأت کی کمی ہے، چنانچہ صبح کو سودا لا کر دینے کے بعد میں گھر آیا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اظہار کی مشق کرتا رہا۔ پھر باہر گلی میں جانے کے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اس وقفے میں پہلی بار محسوس ہوا کہ صبیحہ کے دروازے پر دستک دینے کے لیے شیر کا کلیجہ چاہیے۔

ابھی میں اپنے مرجھائے ہوئے حوصلے کو تازہ دم کرنے کے مرحلے میں تھا کہ وہ میرے سامنے آ گئی۔ ''اویس صاحب! ذرا جلدی سے آ جایئے۔'' پھر فوراً ہی وہ مشین کی طرح پلٹ گئی۔

میں باہر لپکا۔ پردہ اٹھا کر اندر گیا تو وہ دوسرے کمرے میں تھی۔ میں سیدھا وہاں پہنچا تو وہ اپنے ابا جی پر جھکی چمچے سے انہیں پانی پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی: ''ابا جی بیہوش ہو گئے تھے۔ میں نے گھبرا کر آپ کو بلا لیا۔ اب ٹھیک ہیں۔'' پھر قریشی صاحب پر جُھک کر پوچھا۔ ''ابا جی، اب آپ ٹھیک ہیں نا؟''

قریشی صاحب کے تیور اگرچہ منجمد تھے، مگر ان کے چہرے کے کسی نہ کسی حصّے سے اس جواب کا تاثر مِل رہا تھا کہ..... ٹھیک ہوں بیٹی۔

بڑی احتیاط سے گردن تک لحاف اوڑھا کر وہ بولی۔ ''چائے پئیں گے نا ابا جی۔'' پھر جیسے اس نے جواب سُن لیا ہو۔ بسور کر بولی۔ ''میں رونے بیٹھ جاؤں گی یہیں آپ کے سینے سے لگ کر۔ یہ اویس صاحب بھی مجھے چپ نہیں کروا سکیں گے۔ ہاں..... لاؤں چائے؟'' پھر وہ خوش ہو کر سیدھی ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔ ''ابا جی راضی ہو گئے ہیں۔''

کمرے سے باہر نکلی تو میں بھی ساتھ ہی چلا آیا۔ مجھے ایک مونڈھے پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ ''چائے میں بناؤں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ کھڑی سوچتی رہ گئی۔ پھر مُسکرائی اور بولی۔ ''آیئے۔ مِل کر بنائے لیتے ہیں۔''

میرے باورچی خانے کا سا باورچی خانہ تھا؛ چنانچہ ایک بار تو میں سمجھا وہ میرے گھر میں ہے اور میرے لیے چائے بنا رہی ہے۔ اظہار کے لیے یہ مناسب ترین وقت تھا..... مگر کیا یہ مناسب ترین وقت تھا؟

کیتلی کو چولھے پر رکھ کر وہ بولی۔ ''آج آپ اتنے چُپ کیوں ہیں اویس صاحب؟''

''چپ؟'' میں نے پوچھا۔ ''کون؟ میں؟ مگر میں ایسا باتونی کب تھا صبیحہ صاحبہ۔''

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ اگر میں ''صبیحہ'' کے ساتھ ''صاحبہ'' کا لاحقہ نہ لگاتا تو آدھا اظہار تو یوں ہی ہو جاتا۔

''میں نے کب کہا کہ آپ باتونی ہیں۔'' صبیحہ پیالیاں دھوتے ہوئے بولی۔ ''بس آپ مجھے کھوئے کھوئے سے لگے تو پوچھ لیا اور اس لیے بھی پوچھ لیا کہ کھویا کھویا تو مجھے لگنا چاہیے۔''

یہ بھی اظہار کا ایک پہلو ہے، میں نے سوچا۔ اب لوہا گرم

تھا۔ میں نے ضرب لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ ''بات یہ ہے صبیحہ.....'' ''صاحبہ'' کہنے سے پہلے میں نے حلق میں اٹکا ہوا کا گولا نگلنا چاہا، کہ ادھر سے قریشی صاحب کی بہت لمبی کھانسی کی آواز آئی اور صبیحہ گولی کی طرح باورچی خانے سے نکل گئی۔ میں نے اس دوران میں چائے تیار کرلی۔ دودھ گرم کرلیا۔ ایک پُرانے گھسے ہوئے طشت میں سب چیزیں سجائیں تو وہ واپس آئی۔ ''ارے!'' وہ مُسکرا کر بولی۔ ''آپ تو لڑکیوں کی طرح سلیقہ مند ہیں۔''

لڑکیوں کی طرح! میں نے ناگواری سے سوچا، پھر کہا۔ ''سلیقہ مندی پر صرف لڑکیوں کا اجارہ تو نہیں صبیحہ صاحبہ.....'' ناگواری کی وجہ سے میں صاحبہ کے لفظ کو روک نہ سکا۔

''میں نے آپ کی صنف پر تو حملہ نہیں کیا اویس صاحب'' وہ بولی۔ ''ویسے یہ تو آپ مانیں گے کہ سلیقہ مندی میں فوقیت لڑکی ہی کو حاصل ہے۔'' پھر طشت اُٹھا کر بولی۔ ''آیئے۔ آپ ادھر کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں ابا جی کو چائے پلا کر حاضر ہوتی ہوں۔ آیئے۔''

میں اس کے پیچھے اسی کمرے میں آیا جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور جس پر پُرانا پلنگ پوش لٹک رہا تھا۔ مجھے ایک مونڈھے پر بٹھا کر اس نے چارپائی پر پڑی ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''جب تک آپ یہ کتاب دیکھیے۔''

یہ ٹالسٹائی کی ''آنا کارینینا'' تھی۔ میں نے اسے پڑھ رکھا تھا اس لیے پرلی طرف ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر پڑی ہوئی کتابوں کے پاس گیا۔ سب سے اوپر ایذرا پاؤنڈ کی نظموں کا مجموعہ رکھا تھا۔ اس کے نیچے پاسترنک کی روسی نظموں کے انگریزی تراجم کی کتاب تھی۔ پھر بیدی کا طویل افسانہ ''اِک چادر میلی سی''..... نہ کوئی ڈائجسٹ، نہ کوئی نیوز ویک، نہ کوئی السٹریٹڈ ویکلی! خاصی بقراط لڑکی معلوم ہوتی ہے!

''آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔'' وہ اسی مونڈھے پر آ کر بیٹھ گئی جس پر مجھے بٹھا گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میرے خیال میں آپ مونڈھے پر بیٹھیں۔ میں چارپائی پر بیٹھتی ہوں۔'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی، مگر پھر فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ''میں چائے تو وہیں چھوڑ آئی!''

جب تک وہ طشت لے کر واپس آئی، میں مونڈھے پر بیٹھ چکا تھا۔ بیٹھنے کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑا ہوں۔ آج اسے مجھ سے ایک ضروری بات کہنی ہے نا۔

اور میں جانتا ہوں اس عُمر میں ضروری بات کیا ہوتی ہے مگر کیا یہ ضروری بات کہنے میں پہل مجھے نہیں کرنی چاہیے..... بہرحال دیکھتے ہیں..... دیکھتے ہیں۔

اس نے چائے بنا کر پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بالکل میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ''اویس صاحب'' وہ بولی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی لپکپی تھی جو چھپائی جا رہی تھی۔ مگر چھپ نہیں رہی تھی۔ ''اویس صاحب میں نے آج ابھی ابھی اپنی زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے۔''

مگر فیصلہ تو میں نے بھی کر رکھا ہے، میں نے سوچا۔

''اویس صاحب۔'' وہ چارپائی کو ذرا سا گھسیٹ کر میرے اور قریب آ گئی۔ ''میں دُنیا کی شاید واحد لڑکی ہوں جس کی سہیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں۔''

یہ جملہ کہہ کر صبیحہ مجھ پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے یہ پُرانا مفروضہ غلط ثابت کر دیا تھا کہ عورت چاہے ہزار جان سے مرد پر فریفتہ ہو، محبت کا اظہار ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔

''اویس صاحب۔'' اب اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ''میں دو بھائیوں کی ایک ہی بہن ہوں مگر میرے یہ دونوں بھائی روپے کی تلاش میں ابوظہبی اور دبئی کی طرف نکل گئے اور دولت کے نشے میں ایسے ڈوبے کہ اس گھر سے بھی ہمیشہ کے لیے نکل بھاگے۔ امّی کا انتقال ہوا اور ابا جی نے انہیں اس حادثے کا تار بھجوایا تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جوابی تار آیا جو صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا..... ''سوری!''۔

''سوری'' آپ جانتے ہیں ''افسوس ہے'' کی انگریزی ہے۔ ابا جی ہر روز اُٹھ کر اور ہر روز سونے سے پہلے مجھ سے پوچھتے تھے کہ صابی، تمہارے ان بھائیوں کو کس پر افسوس ہے؟ اپنی ماں کی موت پر افسوس ہے یا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ افسوس ہم اتنے بڑے حادثے پر بھی اپنی دولت کی مشینیں روکنے اور پاکستان آنے سے قاصر ہیں۔

میرے یہ دونوں بھائی مجھ سے بڑے ہیں۔ شروع شروع میں خط لکھتے رہے۔ پھر وہیں شادیاں کرلیں اور خط بند کر دیے۔ اب کسی آتے جاتے کے ہاتھ سلام دُعا بھجوا دیتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے مجھے انہوں نے ایک تسبیح بھیجی تھی جس سے بہتر میں یہیں اپنے شہر کے بازار سے دو روپے میں خرید چکی ہوں۔ سو اویس صاحب، میں ان بھائیوں کی بہن ہوں اور یاد رکھیے، یہ میرے سگے بھائی ہیں مگر دولت تو سگوں کو بھی سوتیلا بنا دیتی ہے۔''

صبیحہ نے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور بولی ''معاف کیجیے گا۔ میں رونے والی لڑکی نہیں مگر کبھی کبھی آنسو زبردستی اپنے بہنے کا جواز پیدا کرلیتے ہیں۔ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اسے رونا کیوں آ رہا ہے اور جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچے، آنسو اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں۔ آپ بور تو نہیں ہو گئے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ پریشان ہو گیا ہوں۔''

''میں اپنی بات مختصر کرتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''یہ باتیں جو میں آپ سے کر رہی ہوں، مجھے اپنی امّی سے کرنی چاہیے تھیں مگر وہ ہیں نہیں۔ ابا سے کرنی چاہیے تھیں مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بھائیوں کا احوال آپ نے سُن لیا۔ اسی لیے تو میں نے ایک پڑوسی نوجوان کو اپنی سہیلی کہا ہے کہ میں اس بھری دُنیا میں آپ کے سوا کسی سے یہ بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا بھرم رکھیں گے اور مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں صبیحہ صاحبہ۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''میں اور آپ کا بھرم نہیں رکھوں گا! میں اور آپ کو شرمندہ کروں گا!..... میں جو آپ کے..... جو آپ کے ایک.....'' پھر میں نے سوچا کہ اس صورتِ حال میں میری طرف سے اظہار مناسب نہیں ہوگا۔ پھر سہی، شام کو سہی۔

''میرے ابا بہت غریب آدمی تھے۔'' صبیحہ بولی۔ ''ننھی سی منیاری کی دکان کرتے تھے۔ یہی سوئی، دھاگا، بٹن، کنگھی، بال پین وغیرہ بیچتے تھے۔ ان کا ایک کھوکھا تھا۔ شام کو گھر آتے تو اپنا سارا اثاثہ گٹھڑی میں باندھ کر لے آتے مگر آفرین ہے ان کی استقامت پر اور امّی کی ہمّت پر کہ پیسا پیسا جمع کرتے اور ہم تینوں کو پڑھاتے رہے۔ بھائیوں میں سے ایک نے ایف اے کیا اور ایک نے میٹرک اور پھر چڑیا کے بچّوں کے پَر نکل آئے اور وہ دوسرے نگروں کو چل دیے۔

اس وقت میں آٹھویں میں تھی۔ اب سارا لاڈ پیار، سارا پیسا مجھ پر خرچ ہونے لگا مگر میں بگڑی نہیں۔ میں نے میٹرک کیا، پھر ایف اے کیا، انہی دِنوں امّی چل بسیں۔ اس کے بعد میں نے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے میں داخلہ بھی لے لیا مگر پھر ابا جی پر فالج کے حملے ہونے لگے۔ دو چار دن ان کا ایک بازو اور ایک ٹانگ سُن رہتے مگر پھر چلنے پھرنے لگتے، تب میں کالج چلی جاتی مگر ایک آدھ دن کے بعد ان پر پھر حملہ ہو جاتا۔

''آمدنی رُک گئی۔ میرا کالج جانا بند ہو گیا اور اب کے تو ابا کی زبان ہی بند ہو گئی ہے۔ آج ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ اب ان کا صحت یاب ہونا مشکل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے منہ میں خاک، آج کل پرسوں تک چل بسیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ دو تین چار سال تک زندہ رہیں مگر وہ اسی حالت میں زندہ رہیں گے..... مفلوج حالت میں۔''

صبیحہ نے شعوری طور پر آنسو پیئے اور پھر گلا صاف کر کے بولی۔ ''یہ سب پس منظر تھا اس بات کا، جو مجھے آپ سے کہنی ہے۔ اگر میں براہِ راست کہہ دیتی تو آپ مجھے بے حیا سمجھتے۔ بات یہ ہے ابھی محلّے میں یہ بات زیادہ نہیں پھیلی کہ کھوکھے میں منیاری کی دکان کرنے والا قریشی مفلوج ہو چکا۔ جس روز سارے محلّے کو یہ بات معلوم ہوگی، میں ایک ایسی لڑکی بن کر رہ جاؤں گی جو رات کے اندھیرے میں سڑک پر سے گزرتے ہوئے غنڈوں کے نرغے میں آجاتی ہے۔ سو میں نے فیصلہ کیا ہے اویس صاحب کہ مجھے فوراً شادی کر لینی چاہیے۔''

''درست فیصلہ ہے۔ بالکل درست فیصلہ۔'' میں نے صبیحہ کی بھرپور تائید کی۔ ایسا کرتے ہوئے میری آواز اتنی بدل گئی، کہ خود میں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' صبیحہ نے اطمینان کی سانس لی۔ ''مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ مجھے ایک نگران ہاتھ چاہیے۔ میں لُوٹ کا مال نہیں بننا چاہتی۔ میرے بھائی مجھے اگر اس معاشرے کے آگے ڈال گئے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کا شکار ہو جاؤں۔ میں اس درندے کے پھیلے ہوئے نوکیلے پنجوں کی زد سے باہر بھی تو جا سکتی ہوں۔ میں شادی بھی تو کر سکتی ہوں۔''

''یقیناً۔ یقیناً۔'' میں نے تائید مزید کی۔

''مجھے بس اتنی بات آپ سے کہنی تھی کہ کوئی اچھا سا رشتہ نظر میں رکھیے۔ اچھا سے میرا مطلب شریف آدمی سے ہے جو محبت کر سکتا ہو۔ قربانی دے سکتا ہو۔ لالچی نہ ہو، تنگ ظرف نہ ہو، دُنیا کی خوبصورتیوں سے پیار کر سکتا ہو، دُنیا کی بدصورتیوں سے نفرت کر سکتا ہو اور اس نفرت کا اظہار کر سکتا ہو۔ مجھے کوئی دولت مند انسان نہیں چاہیے، صرف انسان چاہیے جو غیر معمولی نہ ہو۔ عام سا ہو، جیسے میں ہوں..... جیسے آپ ہیں۔''

اب اظہار مکمل ہو گیا تھا۔ اب مجھے مزید تفصیل پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوا کمرے میں تیرتا پھرتا تھا۔ ایک بار جی چاہا، بڑھ کر صبیحہ کا ہاتھ تھام لوں اور اسے بتاؤں کہ تم نے میرے دِل کی بات کہہ دی۔ کسی نے سچ کہا تھا کہ دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل میں نے طے کر لیا تھا کہ شام تک اسے یہ بتانے آؤں گا کہ میں نے تمہارے لیے رشتہ ڈھونڈ لیا ہے۔ لڑکا تمہارے معیار کے عین مطابق اور لڑکے کا نام اویس ہے اور وہ تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔

ویسے مجھے صبیحہ کی ذہانت پر حیرت ہو رہی تھی کہ اظہارِ محبت کا یہ بالواسطہ طریقہ آج تک اور کسے سُوجھا ہوگا۔

''ایک رشتہ میری نظر میں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شام تک آپ کو بتا سکوں گا۔''

صبیحہ کھل اُٹھی۔ ''یہ بڑا احسان ہوگا آپ کا۔''

''احسان کاہے کا صبیحہ''..... میں صبیحہ سے تعارف کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے ''صاحبہ'' کا لاحقہ گول کر گیا تھا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ اب تو معاملہ صاف تھا۔

میں لٹکے ہوئے پلنگ پوش تک پہنچا تو وہ بولی۔ ''اویس صاحب، سنیے۔''

میں رُک گیا۔ ''کہیے۔''

وہ میرے بہت قریب آگئی اور بولی ''عُمر کا خاص خیال رکھیے گا۔ سکون اور صفائی سے زندگی گزارنے کے لیے زندگی کا تجربہ بہت ضروری ہے۔ میں اکیس بائیس برس کی ہوں۔ اسے کم از کم اکتیس بتیس برس کا ضرور ہونا چاہیے۔ میری آپ کی عُمر کے لڑکے عام طور پر بہت اتھلے ہوتے ہیں۔ ناتجربہ کار، نمائشی سے، سمجھ گئے نا آپ؟''

میں نے دیوار کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر سورج جیسے چھت توڑ کر میرے سَر پر اتر آیا۔ سارا منظر لہولہو ہو رہا تھا اور وہ اس لہو کے سیلاب کو عبور کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں تحلیل ہو گئی۔

کمپیوٹر سائنس

۲۷۲ جی بی کی مفت آن لائن ڈرائیو

ضروری فائلوں کو محفوظ کرنے کا آسان حل نکل آیا

راؤ محمد شاہد اقبال

کئی بار کمپیوٹر پر کام کرنے کے دوران آپ کے سامنے اسکرین پر ایک پیغام آجاتا ہے۔ آپ کی ہارڈ ڈسک میں مزید فائلیں جمع کرنے کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ اگر مزید فائلیں ہارڈ ڈسک میں محفوظ کرنا چاہتے ہیں تو خریدیں یا پھر بازار سے ایک یو ایس بی ڈرائیو خریدیں تاکہ آپ اپنی اہم ترین فائلوں کو محفوظ کرنے کا درست انتظام کر سکیں۔ مصیبت یہ ہے کہ جب آپ ایک اچھی کمپنی کی یو ایس بی ڈرائیو خریدنے بازار جاتے ہیں تو اُس کی قیمت بعض اوقات آپ کی جیب کی گنجائش سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ ہلکے معیار کی یو ایس بی ڈرائیو کا انتخاب کر لیں تو پھر آپ کو ہر وقت یہ ہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ اچانک خراب نہ ہو جائے۔ تب برائے مہربانی پرانی فائلوں میں سے کچھ غیر ضروری فائلوں کو ڈیلیٹ کر دیں۔

اگر آپ کے کمپیوٹر میں موجود تمام فائلیں اہم اور ضروری ہوں۔ ان میں سے ایک بھی فائل ڈیلیٹ کرنا آپ کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر آپ کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے یا تو آپ ایک زیادہ ہارڈ ڈسک کی گنجائش والا نیا کمپیوٹر

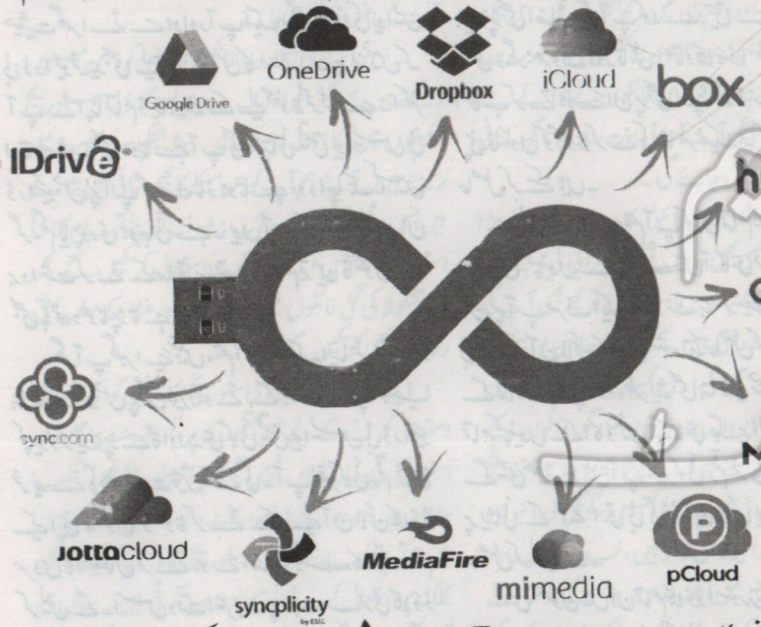

آپ کا تمام محفوظ کیا ہوا ڈیٹا ضائع ہو جائے گا۔

اس وقت ہمارے ہاں ایک اچھی کمپنی کی ۲۰۰ جی بی گنجائش والی یو ایس بی ڈرائیو پانچ سے چھ ہزار روپے میں دستیاب ہے۔ اگر بالفرض آپ کا تعلق ایک صاحبِ حیثیت گھرانے سے ہو اور آپ ایک اچھی کمپنی کی یو ایس بی ڈرائیو خرید بھی لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ نے اپنا تمام ڈیٹا ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے آپ کی انتہائی قیمتی یو ایس بی ڈرائیو جس پر آپ کو بہت ناز ہوتا ہے، وہ اچانک کہیں گر، گم یا چوری ہو جاتی ہے۔ یوں آپ کو مالی نقصان برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اہم ترین فائلوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

مگر آپ گھبرائیے نہیں، ہم آپ کو ایک ایسا طریقہ بتائیں گے جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد نہ تو آپ کو نیا کمپیوٹر خریدنا پڑے گا اور نہ ہی کوئی قیمتی یو ایس بی ڈرائیو خریدنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ بغیر کوئی رقم خرچ کیے اپنی فائلوں کو محفوظ کرنے کے لیے آن لائن کلاؤڈ سروس کا استعمال کرتے ہوئے اضافی جگہ کا انتظام کر لیں گے۔ اس وقت انٹرنیٹ پر بہت ساری کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیاں اپنے صارفین کو اہم ترین فائلیں اور دیگر مواد محفوظ کرنے کے لیے جگہ بالکل مفت فراہم کرتی ہیں۔ کئی کلاؤڈ کمپنیاں شروع میں کم جگہ فراہم کرتی ہیں لیکن جیسے جیسے آپ ان کی مفت خدمات سے استفادہ کرتے جاتے ہیں، یہ بتدریج آپ کی فائلیں محفوظ کرنے کی گنجائش میں اضافہ کرتی جاتی ہیں۔

مثال کے طور ''ڈراپ باکس'' ایک ایسی ہی معروف اور قابلِ اعتماد کلاؤڈ اسٹوریج کمپنی ہے جو اپنے صارفین کو ابتدا میں دو جی بی فائلیں محفوظ کرنے کی جگہ دیتی ہے لیکن جیسے ہی آپ اس کمپنی سے اپنے کسی دوست کو متعارف کرواتے ہیں تو پھر یہ کمپنی ہر ایک دوست کے بدلے میں آپ کو مزید ۵۰۰ ایم بی کی اضافی جگہ فراہم کر دیتی ہے۔ اگر آپ یا آپ کا دوست اس کمپنی کے ٹویٹر اکاؤنٹ کو فالو کرتا ہے تو یہ ۱۲۵ ایم بی اپنا ٹویٹر اکاؤنٹ فالو کرنے کی بنیاد پر بھی اضافی جگہ آپ کو دے دیتی ہے۔ اگر آپ اس جیسی دیگر معروف اور قابلِ اعتماد کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں کا انتخاب کرتے ہوئے ان پر بھی اپنے اکاؤنٹ بنا لیں تو آپ اپنی فائلوں کو محفوظ کرنے کی خاطر ٹھیک ٹھاک جگہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں ہم آپ کو ان تمام بہترین کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں کے بارے میں آگاہی فراہم کریں گے جن پر آپ صرف ایک اکاؤنٹ بنا کر مفت میں ۲۷۲ جی بی تک کی آن لائن کلاؤڈ اسٹوریج حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم آپ کو وہ طریقہ بھی بتائیں جس سے آپ ان تمام کمپنیوں کے اکاؤنٹس ایک ہی جگہ پر استعمال کر سکیں گے یعنی حقیقت میں آپ بغیر کوئی رقم خرچ کیے اور بغیر کسی پریشانی کے ۲۷۲ جی بی کی ''آن لائن یو ایس بی ڈرائیو'' حاصل کر لیں گے۔

اس مضمون میں اُن تمام کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں کے مکمل ویب سائٹ ایڈریس اور اُن کی طرف سے ڈیٹا محفوظ کرنے کے لیے مفت میں فراہم کردہ گنجائش کی تفصیلات دی جا رہی ہیں جو دنیائے انٹرنیٹ میں اپنی خدمات اور سہولیات کے حوالے سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ آپ ان ویب سائٹس پر جا کر بآسانی اپنے اکاؤنٹس بنا سکتے ہیں۔

''آن لائن یو ایس بی ڈرائیو'' کے فائدے:

دفتری اُمور کی انجام دہی کے دوران کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچانک آپ کے باس نے آپ سے ایک فائل طلب کر لی لیکن بدقسمتی سے وہ فائل آپ کے گھر والے کمپیوٹر میں موجود ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لیے

آپ کے پاس گھر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

''آن لائن یو ایس بی ڈرائیو'' کا سب سے بڑا فائدہ جو آپ کو ہوگا وہ یہ ہے کہ آپ اپنی تمام فائلوں کو کسی بھی جگہ سے، کسی بھی کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل فون کے ذریعے ہر وقت اپنی رسائی اور دسترس میں رکھ سکیں گے۔ اس کام کے لیے بس آپ کو ایک عدد انٹرنیٹ کنکشن کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح آپ کو اہم ترین فائلوں کے حوالے سے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی بہت ساری ناگہانی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔

''آن لائن یو ایس بی ڈرائیو'' کا دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی بھی حادثے یا فنی خرابی کی وجہ سے آپ کا کمپیوٹر خراب یا تباہ و برباد ہو جائے تو پھر بھی آپ کی اہم ترین فائلیں محفوظ رہتی ہیں۔ آپ ''آن لائن یو ایس بی ڈرائیو'' کے ذریعے بآسانی اپنے کمپیوٹر میں فائلیں منتقل کر سکتے اور جب چاہیں اپنے دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ انہیں شیئر بھی کر سکتے ہیں۔ بے شمار کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیاں جن میں ڈراپ باکس، گوگل ڈرائیو اور مائیکروسافٹ ون ڈرائیو قابلِ ذکر ہیں، خدمات اور سہولیات کے میدان میں ایک قدم مزید آگے بڑھاتے ہوئے اپنے صارفین کو یہ سہولت بھی مہیا کر دی ہے کہ اگر آپ ان کے پاس اپنی محفوظ کی ہوئی فائلوں کو اپنے اکاؤنٹ سے ڈیلیٹ بھی کر دیں پھر بھی یہ انہیں اپنے سرور پر محفوظ رکھتی ہیں۔ انہیں آپ بوقت ضرورت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔

کلاؤڈ اسٹوریج اکاؤنٹس سے ایک آن لائن یو ایس بی بنائیں:

آپ میں سے کچھ قارئین انفرادی طور پر کلاؤڈ اسٹوریج سروس جیسے گوگل ڈرائیو کو پہلے ہی سے استعمال کر رہے ہوں گے۔ اب آپ سوچتے ہوں گے کہ دیگر کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں پر اگر اکاؤنٹ بنا بھی لیں تو اتنے سارے اکاؤنٹ ایک ساتھ استعمال کیسے کریں گے؟ سب سے بڑی بات یہ کہ کیسے یاد رکھیں گے کہ کونسی فائل کس کلاؤڈ اسٹوریج کمپنی کے پاس محفوظ ہے۔ یہ مسئلہ اُس وقت اور بھی شدید ہو سکتا ہے جب کسی فائل کی اچانک اور عجلت میں ضرورت پڑ جائے۔

یہ ہی وہ بنیادی نکات یا نقائص ہیں جن کو ذہن میں رکھتے ہوئے اکثر افراد ایک سے زیادہ کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں میں اکاؤنٹ بنانے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ کا شکار رہتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو اس مسئلے کا بھی شافی حل بتاتے ہیں جس پر عمل کرنے سے آپ نہ صرف اپنے تمام کلاؤڈ اسٹوریج اکاؤنٹس ایک ہی جگہ پر استعمال کر سکیں گے بلکہ اپنی محفوظ کی گئی فائلوں میں اپنی مرضی اور منشا کے مطابق ردوبدل بھی کر سکیں گے۔

ایک سے زیادہ کلاؤڈ اسٹوریج اکاؤنٹس کو ایک ساتھ استعمال کرنے کے لیے جس قسم کے پروگرام دنیا بھر استعمال کیے جاتے ہیں انہیں ''کلاؤڈ اسٹوریج منیجر'' کہا جاتا ہے۔ بہت سے ایسے سافٹ ویئر اور آن لائن کمپنیاں ہیں جو آپ کو بے شمار کلاؤڈ اسٹوریج اکاؤنٹس کو ایک سنگل کلک پر استعمال کرنے کی سہولت مہیا کرتی ہیں۔ یہاں ہم آپ کو اپنا مناسب سے پسندیدہ، آزمودہ اور انتہائی سہل تھرڈ پارٹی پروگرام ''او ڈرائیو'' www.odrive.com استعمال کرنے کا مشورہ دیں گے۔ اس کے ذریعے آپ بآسانی اپنے تمام کلاؤڈ اسٹوریج اکاؤنٹس کو ''آن لائن یو ایس بی ڈرائیو'' میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

''او ڈرائیو'' تقریباً تمام کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں جیسے ڈراپ باکس، گوگل ڈرائیو، مائیکروسافٹ ون ڈرائیو اور باکس وغیرہ کو ایک جگہ یکجا کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ ''او ڈرائیو'' کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے آپ فیس بک اور انسٹاگرام پر اپنی محفوظ کی گئی تصاویر اور فائلوں

کلاؤڈ اسٹوریج کمپنی	فراہم کردہ گنجائش	ویب سائٹ ایڈریس
گوگل ڈرائیو	۱۵ جی بی	www.google.com/drive
ون ڈرائیو	۵ جی بی	https://onedrive.live.com
ڈراپ باکس	۲ جی بی	www.dropbox.com
آئی کلاؤڈ	۵ جی بی	www.apple.com/uk/icloud
باکس	۱۰ جی بی	www.box.com
آئی ڈرائیو	۵ جی بی	www.idrive.com
جوٹا کلاؤڈ	۵ جی بی	www.jottacloud.com
سنک ڈاٹ کام	۵ جی بی	www.sync.com
ویب اسٹوریج	۵ جی بی	www.asuwebstorage.com
سنک پلیسٹی	۱۰ جی بی	www.syncplicity.com
میڈیا فائر	۱۰ جی بی	www.mediafire.com
می میڈیا	۱۰ جی بی	www.mimedia.com
پی کلاؤڈ	۱۰ جی بی	www.pcloud.com
میگا	۵۰ جی بی	https://mega.nz
ہوبی سی	۲۵ جی بی	https://hubic.com
ڈی گو	۱۰۰ جی بی	https://degoo.com

تک بھی بآسانی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ نے بس کرنا یہ ہے کہ "اوڈرائیو" کی بتائی گئی ویب سائٹ پر جا کر وہاں موجود ڈیسک ٹاپ ایپ کو انسٹال کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ نے کلاؤڈ اسٹوریج کمپنیوں پر بنائے گئے اکاؤنٹس باری باری اس ایپ میں لاگ ان کرنے ہیں۔ یوں ۲۷۲ جی بی "آن لائن یو ایس بی ڈرائیو" آپ کے سامنے حاضر خدمت ہے اور وہ بھی بالکل مفت میں۔ ◆◆◆

بات نیت کی ہے......

نیت میں خلوص ہے تو انسا...... نیت، اگر وحشت ہے تو حیوا...... نیت، اگر تکبر ہے تو شیطا...... نیت۔ بس نیت دُرست کرلو۔

ورنہ نیکی اور بدی میں کوئی فاصلہ نہیں۔

جزیرے کا سفر

لمحہ لمحہ کروٹ بدلتی ایک شاطر قاتل کی سنسنی خیز کہانی

ٹ کالبائی / فاروق ساحلی

برابر والے کمرے سے کسی کے محتاط اور دبے دبے قدموں کی آہٹیں سُن کر وہ اچانک نیم غنودگی سے مکمل بیداری کی کیفیت میں آ گیا۔ تب ہی اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے خفیہ منصوبے پر اگلے روز کے بجائے ابھی عمل کر ڈالے اور پوئی کا قصہ تمام کر دے۔

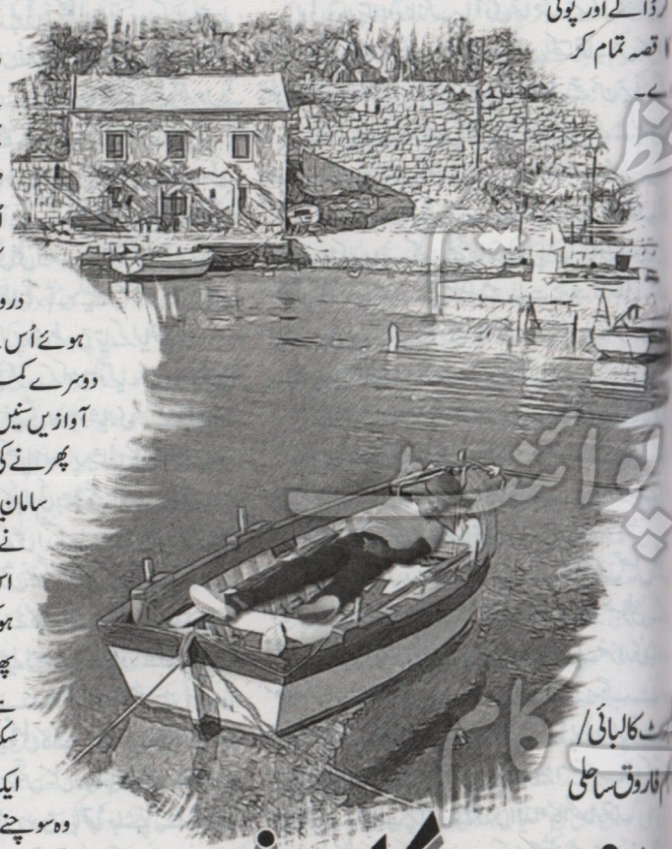

ریمنگ نے تکیے سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے بے ترتیب سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور زرد روشنی کی اُس پتلی سی لکیر کو گھورنے لگا جو دروازے کی نچلی جھری سے دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اُس نے کمبل ایک طرف اچھالا اور بستر سے اُٹھ کر تیزی سے شب خوابی کا لباس بدلنے لگا۔

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر دوسرے کمرے سے آنے والی آوازیں سنیں۔ وہ پوئی ہی کے چلنے پھرنے کی آوازیں تھیں جو یقیناً اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ ریمنگ نے تلخی سے سوچا کہ شاید پوئی اس کے منصوبے سے آگاہ ہو کر جلد از جلد اُس کے پھندے سے نکلنا چاہتا ہے۔ اُس کا دہانہ غصے سے سکڑ گیا اور ہونٹ سختی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔

وہ سوچنے لگا کہ میں مزید چند منٹ سوتا رہتا تو یہ پرندہ اُڑ کر میری دسترس سے دور چلا گیا تھا۔ پھر وہ یہ محسوس کر کے مطمئن ہو گیا کہ پوئی اب کہیں نہیں جا سکتا۔ جب تک اُسے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی دھیمی آوازوں سے یقین نہیں ہو گیا کہ پوئی اب خواب گاہ سے نکل کر کمرا نشست

میں چلا گیا ہے‘ وہ اپنے دروازے سے ٹیک لگائے انتظار کرتا رہا۔ پھر اچانک ہی وہ کمرۂ نشست میں جا پہنچا جہاں اُس فرشی لیمپ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس کا سوئچ پوئی نے عین اُس لمحے آن کیا تھا۔

قدموں کی آہٹ سن کر پوئی اُچھل پڑا۔ وہ پیکٹ اُس کے ہاتھوں سے گر گئے جن میں اُس نے کیمپ لگانے کا سامان باندھ رکھا تھا‘ وہ تیزی سے پلٹا اور دہشت آمیز نظروں سے ریمنگ کی طرف دیکھنے لگا

”تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو پوئی؟“ اس نے بناوٹی حیرت سے پوچھا ”تم نے سونے کے لیے کمرے میں جانے سے قبل کہا تھا کہ تمھاری روانگی علی الصباح ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا رہا۔ ویسے اُس نے کسی ناگہانی مصیبت کے لیے خود کو پوری طرح تیار کر لیا تھا۔

پوئی اُس کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی دھنسی دھنسی آنکھوں میں بے پناہ سنجیدگی اور ہوشیاری کے تاثرات نمایاں تھے لیکن دبلا پتلا چہرہ کھنچاؤ اور پریشانی کا مظہر تھا۔ فرشی لیمپ کی روشنی میں اس کا بالائی دھڑ نیم تاریک سا لگ رہا تھا۔ ”کچھ دیر پہلے میں نے علی الصبح جانے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر بارش ہو گئی تو پھر کیمپنگ کے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا لہٰذا اس وقت جانا زیادہ مناسب ہوگا۔“ اس نے ڈھیلے ڈھالے اور لٹکے ہوئے ہونٹوں پر بدشکل مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ”میں سورج طلوع ہونے سے قبل کچھ دیر مچھلی کا شکار کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے یہاں سے دس میل دور جانا ہوگا۔ شکار کا اصل لطف وہیں آتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا‘ جانے سے پہلے تمھارے نام ایک مختصر سا پیغام چھوڑ جاؤں کہ میری واپسی دو ایک روز میں ہوگی۔ تب ہم دونوں اس موضوع پر کھل کر بات چیت کریں گے۔“

”اوہ...... کوئی بات نہیں پوئی۔“ ریمنگ نے جلدی سے اُس کی بات کاٹتے ہوئے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ اُس کا ہاتھ اپنے پاجامے کی جیب میں رینگ گیا جس میں ایک ڈوری موجود تھی۔ اب وہ پوئی کے اس قدر قریب پہنچ چکا تھا کہ اگر اُس کا حریف کوئی غیر معمولی حرکت کرتا تب بھی وہ اُس پر آسانی سے جھپٹ سکتا تھا۔

پوئی دبلا پتلا اور نازک سا آدمی تھا جبکہ ریمنگ خاصا طاقتور اور کسی کھلاڑی جیسا مضبوط بدن رکھتا تھا۔ اس کا سر پہلوانوں جیسا تھا۔ بازو لمبے اور مضبوط تھے جن پر اُگے ہوئے گھنے سیاہ بال جسم میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ ”کوئی بات نہیں پوئی۔“ اس نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے دوبارہ کہا ”میں نے تمھیں شام ہی کو بتا دیا تھا کہ میں دو ایک روز کے لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ جائیداد کے سلسلے میں بات چیت ہو جاتی لیکن اس موضوع پر بعد میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔ تم اپنے تفریحی سفر پر چلے جاؤ اور لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو۔“

اُس کی نرم اور دھیمی آواز اور ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ نے پوئی کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ وہ فرش پر پیکٹ اُٹھانے کے لیے جھکا اور بولا ”ٹھیک ہے ریمنگ! پھر دو ایک روز بعد ہی تم سے ملاقات......“

”لیکن پوئی۔“ ریمنگ نے اچانک کہا ”کروک جھیل میں تو مچھلی کا اچھا شکار مل جاتا ہے۔“ اس نے قدموں کو مضبوطی سے فرش پر جما لیا۔ وہ پوئی کو قتل کرنے سے پہلے ایک ضروری بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس قسم کے واقعات میں ریمنگ بے حد شاطر قسم کا آدمی واقع ہوا تھا۔ ”برسبیل تذکرہ‘ پوئی! کیا تم نے تیرنا سیکھ لیا ہے؟“ یہ سوال کرتے وقت وہ بڑا مضطرب تھا کیونکہ اسی سوال کے جواب پر اس کے فوری اقدام کا انحصار تھا۔

پوئی مطمئن ہو کر فرش سے پیکٹ سمیٹنے میں مصروف تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سر اُٹھا کر ریمنگ کو دیکھا اور سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا ”نہیں...... ابھی تو نہیں لیکن میں جلد ہی......“

ریمنگ کو اسی جواب کا انتظار تھا۔ اُس کا دایاں ہاتھ

جیب سے باہر آ گیا۔ اگلے ہی لمحے ڈوری کا پھندہ پوئی کے سر سے ہوتا اُس کی گردن میں پھنس چکا تھا۔ ریمنگ نے پھندے کو جھٹکا دیا تو پوئی کے باقی ماندہ الفاظ اُس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔ ریمنگ نے کسی درندے کی طرح جست لگا کر اُسے جکڑ لیا اور اُس پر سوار ہو گیا۔ ریمنگ کے بھاری بھر کم بوجھ تلے پوئی کا دبلا پتلا اور کمزور جسم دبتے ہوئے ہلکی آواز کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں فضا میں لہرانے لگیں۔ ناتواں انگلیوں نے گردن میں پھنسی ہوئی ڈوری کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ریمنگ نے اُسے پوری قوت سے دبوچ رکھا تھا۔

رفتہ رفتہ پوئی کے جسم کی تڑپ ختم ہو گئی۔ اُس کا وجود جیسے ہی ساکت ہوا‘ ریمنگ نے بڑی پھرتی اور مہارت سے پھندہ نکال لیا اور اُس کی نبض ٹٹولنے لگا۔ نبض چل رہی تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا کہ اُس نے گلا گھونٹنے کا عمل بروقت ہی چھوڑ دیا تھا۔ اُس نے پوئی کا ڈھیلا ڈھالا جسم اٹھا کر غسل خانے کے ٹب میں ڈال دیا اور اس بات کا خیال رکھا کہ پوئی کا چہرہ نیچے کی طرف رہے۔ پوئی اب بھی سانس لے رہا تھا لیکن سانس کی آمد و رفت بے حد کمزور تھی۔ یہی ریمنگ بھی چاہتا تھا۔ اس نے نل کھول دیا۔ وہ جانتا تھا کہ دو روز بعد جب پوئی کی لاش جھیل سے برآمد ہو گی تو اُس کے پھیپھڑوں میں پانی بھرا ہو گا اور منصوبے کی کامیابی کے لیے یہی ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے ٹب سے پوئی کا جسم نکال کر اپنے کندھے پر ڈالا اور گھر سے نکل کر کچھ ہی فاصلے پر واقع جھیل کی طرف چل دیا۔ راستہ سنسان تھا۔ جھیل کے کنارے ایک چھوٹی سی گودی میں کئی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے پوئی کا بے جان جسم اسی کی کشتی میں چت لٹا دیا۔

فلوریڈا کی یہ ایک خاموش اور تاریک رات تھی۔ آسمان پر گہرے بادلوں کا تسلط تھا۔ مغربی اُفق پر چاند کا زرد چہرہ مدھم روشنی بکھیرتا نڈھال سا لگ رہا تھا۔ ریمنگ کے لیے یہ روشنی بھی کافی تھی۔ وہ کچھ دور تک دیکھ سکتا تھا۔ جب کہ خود اس کا وجود دوسروں کی نگاہوں میں آنا محال تھا۔ وہ واپس پوئی کے گھر پہنچا اور وہ تمام پیکٹ اٹھا کر جھیل کے کنارے واپس آ گیا جو پوئی تفریحی سفر پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اُس نے یہ سامان بھی پوئی کے بے حرکت جسم کے قریب رکھ دیا۔ پھر ایک اور کشتی کھول کر پوئی کی کشتی کے ساتھ باندھ دی۔

تاریکی میں اُس کے ہاتھ بڑی تیزی سے کام کرنے لگے۔ وہ پوئی کی کشتی میں بیٹھ کر اُسے چپوؤں کی مدد سے کھینے لگا۔ اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ طاقتور بازو چپوؤں کی مدد سے جھیل کا پانی کاٹنے میں مصروف تھے۔ خالی کشتی پوئی کی کشتی کے پیچھے ہچکولے کھاتی چلی آ رہی تھی۔

وہ پوئی کی کشتی کروک جھیل تک لے جانا چاہتا تھا جو وہاں سے دس میل دور تھی لیکن مشرقی افق کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے اپنے منصوبے پر دوبارہ غور کرنا پڑا۔ افق پر سپیدۂ سحر کی لکیریں نمودار ہونے لگیں اور وہ صبح ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ پوئی کی لاش قریبی جھاڑ جھنکار میں کسی ایسی جگہ چھپا دی جائے جہاں سے آئندہ شب آسانی سے نکال کر اُسے کروک جھیل میں غرق کر سکے۔

ریمنگ اس علاقے میں اجنبی تھا۔ اُسے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ راستہ نہ بھول جائے۔ اُس نے سوچا کہ دن کی روشنی میں راستوں کی اچھی طرح پہچان کر لے گا تاکہ اگلی رات پوئی کی لاش کروک جھیل تک لے جانے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس نے قتل کی یہ واردات بے حد محتاط انداز میں کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب بھی پوئی کی لاش ملی تو اُس پر تشدد کی ہلکی سی علامت بھی نہیں ہو گی۔ اُس کے بجائے پوئی کے پھیپھڑوں میں بھرا پانی اُس کے ڈوبنے کی کہانی سنائے گا۔

بہت سے لوگوں کو معلوم تھا کہ پوئی آج کل میں کروک جھیل جانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھا اور آس پاس کے ہر شخص کو یقیناً علم ہو گا کہ وہ تیرنا نہیں جانتا۔ کشتی میں موجود کسی

بھی چیز پر پوئی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔ ریمنگ یہ سب سوچ کر مسکرانے لگا۔ اس نے اسی لیے انتظار کیا تھا کہ پوئی اپنا سامان باندھ لے تو پھر ہی اُسے ٹھکانے لگائے۔

ریمنگ کو معلوم تھا کہ اس قسم کی لاش ملنے کے بعد سرکاری ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتا ہے۔ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا ''ڈاکٹر کہے گا یہ حادثاتی موت ہے اور پوئی ڈوبنے کے سبب ہلاک ہوا ہے۔'' اس کے حلق سے دھیما سا قہقہہ اُبل پڑا۔ باز و مزید تیزی سے کشتی کھینے لگے۔ کچھ دور اُسے چند درخت اور گھنی جھاڑیاں نظر آئیں تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے کشتی اسی سمت میں رواں دواں رکھی۔

اچانک بادلوں کی درزوں سے روشنی جھانکنے لگی۔ ریمنگ کشتی کنارے سے لگا، اسے ایک درخت سے باندھنے کے بعد لاش کندھے پر ڈال کر خشکی کے اس ٹکڑے پر آ گیا۔ وہ ہاتھ سے جھاڑیاں اور گھنی شاخیں ہٹاتا ہوا چند قدم آگے گیا اور ایک مناسب جگہ تلاش کر کے لاش چھپا دی۔ لاش چھپانے کے بعد اس نے پوئی کی کشتی بھی درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا کر باندھ دی۔ یہ جگہ اگرچہ پوئی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی تاہم یہاں درختوں کے اتنے جھنڈ تھے کہ لاش اور کشتی دونوں پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ خود بھی یہاں آنے کا راستہ بھول سکتا تھا لہٰذا اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور نشانیاں ذہن نشین کر کے اس کشتی میں آ بیٹھا جسے وہ پوئی کی کشتی کے ساتھ باندھ کر یہاں تک لایا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خاموش اور بے حرکت بیٹھا رہا۔ اسے صرف ہواؤں کا شور اور درختوں کے پتوں کی تالیاں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کشتی کو کھینا شروع کر دیا۔ جب وہ گودی میں پہنچا تو سپیدۂ سحر پھیل چکا تھا لیکن دھند اور رات کی تلچھٹ ابھی باقی تھی۔ اس نے کشتی وہیں باندھی جہاں سے اس کو لایا تھا اور پھر پوئی کے گھر واپس آ کر اطمینان سے سو گیا۔

اس کی آنکھ دروازے پر ہونے والی زوردار دستک سے کھلی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے سوچ اور فکر کیجا کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں چاروں طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

''اٹھو دروازہ کھولو۔'' کسی کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ریمنگ سوچنے لگا کہ دروازے پر ایک سے زیادہ لوگ موجود ہیں کیونکہ اسے گرج دار آواز کے علاوہ بھی کئی آوازیں سنائی دی تھیں۔

''آ رہا ہوں۔'' ریمنگ نے کپڑے پہنتے ہوئے چلا کر کہا۔ اس نے دروازہ کھولا تو تین افراد دندناتے ہوئے گھر نشست میں گھس آئے۔ وہ تینوں اجنبی تھے اور ان کی چھ عدد آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔

''کیا تم ہی ریمنگ ہو؟'' اجنبی مثلث کے ایک کونے سے آواز آئی۔ یہ ایک موٹا اور اجنبی آدمی تھا۔

''جی ہاں۔'' ریمنگ نے بڑے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''پوئی کے کزن۔'' اسی موٹے شخص نے اپنا ہیٹ سر سے ہٹاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے کزن سے ملنے کل ہی یہاں آئے تھے نا؟''

''درست۔ میں کل ہی آیا تھا۔'' اس نے باقی دو افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی سوچتا رہا کہ اس مثلث کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

''میرا نام ہینک ہے' شیرف ہینک۔'' موٹے اور لمبے شخص نے بڑے کھردرے انداز میں اپنا تعارف کروایا اور ریمنگ اپنی جگہ ہل کر رہ گیا۔ اس نے شیرف کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہاں کھردرے پن کے علاوہ کوئی تاثر نہیں تھا۔ ''پوئی کہاں ہے؟'' شیرف نے اپنی مول گردن کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''پوئی..... وہ آج صبح ہونے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔'' اس نے پرسکون لہجے میں شیرف کو آگاہ کیا۔ ''کسی جھیل میں مچھلی کا شکار کرنے گیا ہے۔ یہ کہہ کر گیا تھا کہ کل تک واپس آ جائے گا۔'' ریمنگ نے یہ پوچھنا چاہا تھا کہ انھیں پوئی کی تلاش کیوں ہے لیکن یہ سوال نہ کیا کیونکہ یوں اس کا اضطراب

بے نقاب ہو جاتا۔

''ہم پوئی سے ملنے آئے تھے۔'' شیرف نے سلگتی ہوئی آنکھوں سے اُسے گھور کر کہا۔ ''آج صبح نو بجے اسے ایک چھوٹا سے معاملہ سلجھانے کے لیے مجھ سے ملنا تھا۔

''نو بجے۔'' ریمنگ نے سوچا اور اس کی نظریں بے اختیار دیوار گیر گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ گیارہ بج چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بہت گہری نیند سویا تھا۔

''وہ وعدے کے مطابق مجھ سے ملنے نہیں آیا تو فطری طور پر ہمیں ہی آنا پڑا۔''

شیرف کہتا رہا۔ اس کی باتوں سے ریمنگ کو اطمینان ہو رہا تھا کہ مسئلہ سنگین نہیں۔ ''مجھے افسوس ہے کہ پوئی یہاں موجود نہیں۔'' اس نے شیرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے پوئی پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے آج صبح کا وقت ہی کیوں طے کیا تھا۔

ریمنگ کو ان تینوں کی موجودگی میں تھکن کا احساس ہونے لگا۔ گہری نیند سے چونک اٹھنا اور اس کے بعد یہ غیر متوقع سوالات اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہے تھے۔ وہ تھک کر آرام کرسی میں پھنس کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں۔ شیرف نے نجانے کیوں برا سا منہ بنایا جیسے اسے ریمنگ کے اس طرح بیٹھنے پر اعتراض ہو۔

اس نے سرد نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں گھمائیں اور داخلی دروازے کو گھورنے لگا' پھر اس کی آنکھوں کا رخ کھڑکی کی طرف ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ریمنگ سے دروازے تک اور دروازے سے کھڑکی کے درمیان فاصلے کی پیمائش کر رہا ہو۔ تاہم اس کے چوڑے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ ریمنگ نے سوچا' مجھے فرار ہونے کی ضرورت نہیں۔ تینوں دفعان ہو جائیں گے تو میں بچ نکلوں گا۔

شیرف اچانک اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹا اور دروازے کی دہلیز کی طرف نکل گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی تقلید کی۔ اب وہ جہاں تھے وہ جگہ ریمنگ کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی ریمنگ ان کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح انھیں اس پر شک ہو سکتا تھا۔ صورت حال قابو سے باہر نہ تھی لہٰذا اسے یہ تشویش بھی نہیں ہوئی کہ وہ مکان کی تلاشی لے رہے ہیں۔ اس نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر طویل سانس لی لیکن نہ جانے اسے یہ شک ہونے لگا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

کرسی کے ساتھ میز پڑی تھی جس پر ایک ٹیلی فون بھی رکھا تھا۔ اسے اچانک ایک انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے ذہن میں کلبلانے والی اس تجویز پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا۔ اس کا دایاں ہاتھ پہلے ہی ٹیلی فون کو چھو رہا تھا اور اس کے ہاتھ کی حرکت کو کھڑکی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے ڈائل کے وسط میں لکھے ہوئے نمبر دیکھے جو اسی فون کے تھے۔ پھر آہستگی سے ریسیور اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

وہ ماضی میں ٹیلی فون سپروائزر رہ چکا تھا لہٰذا اس سے اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی کہ ایسا کون سا نمبر فون پر ڈائل کیا جائے کہ ریسیور رکھنے پر گھنٹی بج اٹھے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ چھوٹا سا منصوبہ ان پولیس والوں کو مزید بھاگ دوڑ سے باز رکھے گا۔ اس نے کان لگا کر شیرف اور اس کے ساتھیوں کی گفتگو سننا چاہی لیکن ان کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

اسے یہ یقین ضرور تھا کہ پولیس والے جلد واپس نہیں جائیں گے۔ شاید وہ پورے گھر کی تلاشی لینا چاہتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے گھر یا گودی میں ایسی کوئی غلطی نہیں کی جو اس کے لیے خطرناک ثابت ہو پھر بھی پولیس والوں سے بچنا ضروری تھا اور اس کے لیے اسکیم تیار تھی۔ اس نے ٹیلی فون ڈائل تین مرتبہ گھمایا اور ایک نمبر ملا کر ریسیور واپس رکھ دیا لیکن گھنٹی نہیں بجی۔ اس نے دوسری مرتبہ کوشش کی تو ریسیور رکھتے ہی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے تین مرتبہ گھنٹی بجنے دی تاکہ شیرف بھی اس کی آواز سن لے اور پھر ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو۔ ہاں میں ریمنگ بات کر رہا ہوں..... اوہ..... یہ تم ہو پوئی..... سنو پوئی آج تمھیں شیرف سے ملنا تھا۔ اوہ..... اچھا..... ہاں..... میں شیرف سے کہہ دوں گا۔ مگر سنو تو..... شیرف یہاں..... ہیلو..... ہیلو..... ہیلو۔''

آخری مرتبہ ہیلو کہنے کے بعد اس نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا کیونکہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ شیرف اور اس کے ساتھی سامنے والے دروازے تک پہنچ گئے ہیں۔

''بہت جلدی میں تھا' پوری بات بھی نہیں کی۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''کون تھا ریمنگ؟'' شیرف نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

''پوئی۔ اس نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ اسے تم سے آج کی ملاقات یاد نہیں رہی لہٰذا وہ کل صبح ملے گا۔''

''تم نے مجھے بات کرنے کے لیے آواز کیوں نہیں دی۔''

''میں اسے بتا رہا تھا کہ شیرف گھر میں ہی موجود ہے لیکن اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔''

''اس نے کہاں سے فون کیا تھا؟''

''یہ تو اس نے نہیں بتایا لیکن وہ کروک جھیل ہی کے کسی کیمپ میں ہوگا۔''

ریمنگ کے جواب پر شیرف نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ داخلی دروازے اور کھڑکی کو گھورنے لگا۔ پھر اچانک ہی وہ ریمنگ کی طرف پلٹا اور پوچھا ''تمھیں کوئی بات یاد ہے ریمنگ۔ کوئی ایسی بات جو تم مجھے بتانا بھول گئے ہو۔''

اس کا یہ جملہ ریمنگ کے لیے دودھاری تلوار سے کم نہیں تھا لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ شیرف اسے گھور رہا تھا۔ اسے جواب کا انتظار تھا لیکن ریمنگ بھی خاموش اور منتظر رہا۔

''تم بھولی ہوئی باتیں یاد کرنا نہیں چاہتے ریمنگ؟''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ریمنگ نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''تم پوئی کے کزن ہو؟'' اس مرتبہ شیرف کی آواز سخت اور ٹھوس تھی۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم پوئی سے ملنے آئے تھے اور تمھیں یہاں چند روز تک قیام کرنا تھا۔ تم اور پوئی ایک لب گور شخص کے دو ہی بھانجے ہو۔ اس کا کوئی اور وارث نہیں اور وہ کسی وقت بھی شکاگو میں دم توڑ سکتا ہے۔ اب اگر پوئی مر جاتا ہے تو صرف تم ہی اکیلے اس کی ساری جائیداد کے وارث ہو گے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا' جیسے ریمنگ کو جواب دینے کی مہلت دے رہا ہو۔

''لیکن شیرف' پوئی تو زندہ ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' ریمنگ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ تب پھر ہم مزید کچھ یاد کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ہماری یادداشت تازہ رہے۔'' شیرف کی آواز اب بھی کھردری تھی لیکن اس میں دھیما پن آ گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ریمنگ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ خطرے میں گھر چکا ہے۔

''ریمنگ' تم پوئی سے ملنے آئے تھے اور تمھاری آمد کا واحد مقصد پوئی کو قتل کرنا تھا تاکہ تم اپنے چچا کی جائیداد اور دولت کے واحد وارث بن سکو۔''

پولیس افسر کے سرد ترین لہجے اور انکشاف سے اس کے بدن میں درجہ حرارت تیزی سے کم ہو گیا۔ اُسے پسینا بھی آنے لگا۔ اس نے شیرف کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سحر انگیز چمک نظر آئی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بہت آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ یہی اس کا جواب تھا۔

''ریمنگ' کیا تمھیں کسی ایسی موت کا علم ہے جو خشکی پر واقع ہوئی ہو لیکن اس لاش کے پھیپھڑوں میں پانی بھرا ہوا ہو۔'' شیرف کے سوال پر اس کے تمام مساموں نے ٹھنڈا پسینا اُگل دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ تب ہی اس کے شاطر دماغ نے اسے ٹہوکا دیا کہ شیرف محض مفروضات پر گفتگو کر رہا ہے اور پولیس کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔ اس نے سوچا' پولیس کو حقیقت حال کا علم ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ لاش درختوں کے گھنے جھنڈ میں چھپا کر آیا تھا۔

''تم اس علاقے میں بالکل اجنبی اور یہاں کی خصوصیات سے ناواقف ہو۔'' شیرف کی آواز اس کے

کانوں میں کسی خنجر کی طرح اترتی چلی گئی۔ ''ہم نے تمھیں باہر نکل کر آس پاس دیکھنے کا موقع فراہم کیے بغیر ہی آلیا۔ تم بیدار ہو کر آئے تو یہاں کرسی پر بیٹھے رہے جس سے جھیل کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔''

ریمنگ نے شیرف کی یہ بات ممکنہ حد تک پرسکون انداز میں سنی۔ وہ اس کی سحر انگیز آنکھوں کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ شیرف کیا کہنا چاہتا ہے۔

''اٹھو ریمنگ اور کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرو۔'' شیرف نے اس مرتبہ تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ریمنگ میں اب اٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ گم صم سا آنکھیں پھاڑے بیٹھا رہا لیکن اب اس کی سماعت پر جھیل سے آنے والی ہوا کی آواز اتھوڑے برسانے لگی تھی۔ شیرف نے اُسے دوسری مرتبہ اٹھنے کا حکم دیا تو وہ میکانی انداز میں اٹھ کر کھڑکی تک پہنچ گیا۔

''دیکھو! جھیل کی طرف..... صبح میں معمول کے مطابق گشت پر اس طرف سے گزرا تو میں نے بھی یہی منظر دیکھا تھا۔'' ریمنگ کا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ جسم کانپ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے منجمد اور ساکت کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی خوف زدہ نظروں نے جو کچھ دیکھا اس پر وہ زندگی بھر یقین کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا مگر وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔

پوئی کی لاش جھیل کے کنارے پڑی تھی۔ پوئی کی کشتی بھی وہیں موجود تھی اور سامان بھی وہیں رکھا ہوا تھا۔ کشتی درختوں کے ایک جھنڈ سے بندھی ہوئی تھی' بالکل اسی طرح جس طرح کل رات وہ خود اسے باندھ کر آیا تھا۔

ناممکن کو ممکن ہوتا دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو گئی۔ گودی کے خشک ٹکڑے پر ایک ڈاکٹر اور شاید دو پولیس والے کھڑے تھے جن کی توجہ لاش پر تھی۔ ریمنگ کو یوں لگا جیسے گودی کا ساحل راتوں رات بالکل ہی بدل گیا ہو۔

''تم نے کل پوئی کو قتل کیا تھا ریمنگ!'' شیرف کی بے لوچ آواز اس کے اعصاب کو منتشر کرتی چلی گئی۔ ''تم اس کی لاش کشتی میں چھپا کر کچھ دور گئے اور پھر خشکی کے ایک ٹکڑے پر لاش چھپا کر تم نے کشتی بھی وہیں باندھ دی۔''

ریمنگ نے سر کو کئی مرتبہ جھٹکا دیا لیکن اب ذہن میں دھند لکا چھانے لگا تھا۔ پھر اُسے اپنے آخری ہتھیار کا خیال آیا کہ یہ لوگ اس کے خلاف کیا ثبوت پیش کریں گے؟ لیکن پھر خود ہی سوچا کہ پوئی کے نام فون کر کے اس نے خود کو تہی دست کر لیا ہے۔ وہ اپنی حماقت کا ماتم کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ایک جال میں پھنسا لیا گیا ہے۔

اس کا خون کھولنے لگا۔ آنکھوں سے آگ نکلنے لگی لیکن شیرف پہلے ہی اس کے جھپٹنے اور حملہ کرنے کا ارادہ بھانپ گیا تھا لہٰذا جب وہ جھپٹا تو شیرف کا گھٹنا اس کے پیٹ پر لگا۔ اُس نے ریوالور نکال لیا لیکن شیرف کے دوسرے گھٹنے نے اُسے دہرا ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کے ریوالور کی گولیاں دیوار کا پلستر ادھیڑتی چلی گئیں۔ اسی وقت شیرف کے ساتھیوں نے اُسے دبوچ لیا اور ایک نے اس کی کلائیوں میں آہنی کڑیاں ڈال دیں۔

''اس ٹیلی فون کال نے تمھیں پھنسا دیا ریمنگ!'' شیرف نے سگار سلگا کر دانتوں میں دباتے ہوئے کہا ''تمھارا مقصد شاید یہ تھا کہ تم لاش کہیں چھپا کر آج کی شب کروک جھیل میں ڈال آؤ گے لیکن تم اس علاقے سے واقف نہیں تھے۔ تم نے جس جگہ درختوں کے جھنڈ میں لاش چھپائی وہاں اس وقت پانی ہی پانی نظر آ رہا ہوگا۔ دراصل بلدیہ نے جھیل کے حسن میں اضافے کے لیے اس میں تیرتے مصنوعی جزیرے بنا رکھے ہیں جو ایک سے دوسری جگہ خود بخود حرکت کرتے ہیں۔ تم نے ایک ایسے ہی جزیرے کے درختوں میں لاش چھپائی اور وہاں کشتی باندھ دی۔ جب ہوا کا رخ تبدیل ہوا تو تیرنے والا جزیرہ ہماری بستی کی طرف آیا اور پھر ساحل سے آلگا۔ یوں پوئی کی لاش بھی اسی جگہ پہنچ گئی جہاں تم نے اُسے قتل کیا تھا۔ اب تمھیں کوئی بھی پھانسی سے نہیں بچا سکتا۔''

روہنگیا مسلمانوں کو بے سہارا نہ چھوڑیے

مہاجرین کی بحالی کے لیے پاکستانی تنظیمیں بھی سرگرم

ڈاکٹر آصف محمود جاہ (ستارہ امتیاز)

روہنگیا مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔ ان کے گھر جلادیے گئے۔ خواتین کی عزتیں پامال کی گئیں۔ عورتوں کی گود سے بچے لے کر ان کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ نوجوانوں کو زندہ جلایا گیا۔ بدھ مت کے پیروکاروں نے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ پانچ لاکھ سے زائد مسلمانوں نے بنگلہ دیش میں پناہ لی ہے۔ بنگلہ دیش کے ریلیف کیمپوں میں ان بے بس، لاچار مسلمانوں کی حالت

حالات حاضرہ

تپلی ہے۔ اقوام متحدہ انہیں ابھی تک ریفیوجی کا درجہ دینے اور سہولتیں مہیا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ترکی کے انسان دوست اور امت مسلمہ کا درد رکھنے والے صدر نے ان مظلوم ترین مسلمانوں کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اپنے نائب صدر بیٹے، وزیر خارجہ اور اپنی نیک دل، نیک سیرت اور دردآشنا بیگم کو فوراً بنگلہ دیش روانہ کیا۔ ترکی کی خاتون اوّل اتی

عظیم خاتون ہیں کہ انہوں نے ائیر پورٹ سے اترتے ہی روہنگیا مسلمانوں کے کیمپوں کا رُخ کیا۔ ائیر پورٹ پر استقبالیہ میں کچھ کھانے پینے سے انکار کیا۔ کیمپ پہنچ کر مظلوموں کی حالت زار دیکھ کر ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ زار و قطار رونے لگیں۔ عورتوں اور بچوں کو گلے لگایا۔ امت مسلمہ کے عظیم لیڈر ترکی کے صدر طیب اردوان نے بنگلہ دیش کی وزیر اعظم کو یقین دلایا ہے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ روہنگیا مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری کے تمام اخراجات ترک حکومت اٹھائے گی۔

کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کی ٹیمیں بھی ہر آفت کے دوران مصیبت زدوں کی مدد کے لیے پہنچتی ہیں۔ الحمدللہ! کچھ عرصے سے ہماری ٹیمیں ترکی اور شام میں مصروفِ عمل ہیں اور شامی مہاجرین کی مدد کررہی ہیں۔ جونہی روہنگیا مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی، مخیر حضرات اور دوستوں نے پوچھنا شروع کردیا کہ آپ اب بنگلہ دیش یا میانمار جارہے ہیں؟ دردِدل رکھنے والے ایاز سکا، افتخار بشیر، ڈاکٹر عمران وحید، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر نہدیٰ اشرف، چوہدری امین اور آپا مدنی نے عطیات کے لیے خطیر رقم بھجوادی۔ سینیٹر طلحہ محمود ترکی سے سیدھے بنگلہ دیش پہنچے اور ان کے تعاون اور توسط سے ہمارا بھی وہاں رابطہ ہوا۔ الحمدللہ! کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کی طرف سے روہنگیا مسلمانوں کو روزانہ کی بنیاد پر خوراک بھی مہیا کی جارہی ہے۔ ان کے لیے شیلٹر کا بندوبست بھی کیا جارہا ہے۔ سٹیٹ بینک کے ایک سابق پاکستانی افسر کے تعاون سے بھی ریلیف کا کام جاری ہے۔ روہنگیا مہاجرین کو صاف پانی مہیا کرنے کے لیے ٹیوب ویل لگائے گئے اور ان کے مریضوں کے علاج کے لیے بھی بندوبست کیا جارہا ہے۔

اگرچہ ابھی تک پاکستان سے باضابطہ طور پر کسی قسم کی امداد نہیں بھجوائی جاسکی لیکن کچھ لوگ اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر بنگلہ دیش رقوم بھجوا رہے ہیں جس سے روہنگیا مسلمانوں کی دیکھ بھال کی جارہی ہے۔ ۲۵ اگست ۲۰۱۷ء کے بعد سے فسادات میں لاکھوں روہنگیا مسلمان بے گھر ہوچکے۔ صعوبتیں، مصیبتیں اور ذلت برداشت کرکے راستے میں اپنے پیاروں کو اپنے سامنے مرتا دیکھ کر جنگل اور دریا عبور کرکے بے حال ہوکر بنگلہ دیش پہنچے ہیں جہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔

۲۵ اگست ۲۰۱۷ء سے یومیہ ایک ہزار مسلمان شہید ہورہے ہیں۔ بوسیدنگ، راسیدنگم اور منگڈو کے علاقوں میں سینکڑوں بستیاں جلائی گئیں، گھروں کے ساتھ ساتھ کافی سارے مکینوں کو بھی جلاڈالا گیا۔ جان بچا کر نکلنے والے معصوم بچوں، بچیوں، بوڑھوں اور علماء کرام کو بے دردی سے شہید کیا گیا، ڈنڈے مار مار کر مارڈالنا، گھروں کو جلا کر خاکستر کردینا، بلڈوزر چلا کر نام و نشان کو مٹانے کی کوشش کرنا وہاں معمولی بات بن چکی ہے۔

جان بچانے والے بچے، بوڑھے، جوان دریاؤں کے کنارے جنگلات میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لینے کی کوشش کررہے ہیں جہاں خوفناک قسم کے درندوں کے ساتھ ساتھ جونک، مچھر اور ہر قسم کے حشرات الارض کی بہتات ہے۔ کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے بڑے لوگ درختوں کے پتے چبانے پر مجبور ہیں اور بچے بلک بلک کر ماؤں کی گودوں میں جان دے رہے ہیں۔

دوسری طرف بنگلہ دیش پہنچنے تک راستے میں دیگر آفات کے علاوہ بدھ بھکشو کی صورت میں دہشت گردوں کی ٹولیاں، میانمار حکومت کی پولیس اور فوج کی پوری فورس اپنی پوری توانائی کے ساتھ ان نہتے اور بے سہاروں کو تہ تیغ کرنے کے درپے ہیں۔ کتنے ہی سمندر اور دریاؤں میں مچھلیوں کی خوراک بن رہے ہیں اور کئی ظالموں اور سفاکوں کی درندگی کا شکار ہورہے ہیں۔

روہنگیا مسلمانوں کی فوری امداد مسلمانانِ عالم کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ مسئلے کے حل کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے:

۱۔ میانمار حکومت اور اس کی بھرپور حمایت کے ساتھ وہاں

کی فوج، پولیس، عوام، بدھ بھکشو اور دہشت گرد تنظیمیں روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی کے درپے ہیں، لہٰذا ان کی نسل کشی بند کی جائے اور اس سلسلے میں اقوام متحدہ اپنا کردار ادا کرے اور فوری طور پر وہاں اپنی امن فوج بھیجے، وہاں کے بچے کھچے مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرے اور ان کی فوری آبادکاری کا انتظام کر کے زندگی کی تمام تر بنیادی ضروریات و سہولیات انہیں بہم پہنچائی جائیں۔

۲۔ عالم اسلام بلکہ پورے عالم کے انسان دوست ممالک سے مطالبہ ہے کہ وہ فوری طور پر میانمار حکومت پر سفارتی اور اخلاقی دباؤ ڈالے تاکہ وہ انسانیت کش حرکتوں سے باز آئے۔ روہنگیا مسلمانوں کو ان کی شہریت سے محروم کرنے والے انسانیت سوز اور ظالمانہ قانون کو ختم کرے اور ان کی شہریت اور حقوق بحال کرے۔

۳۔ رابطہ عالم اسلامی، مؤتمر عالم اسلامی اور او آئی سی نمائشی قراردادوں اور جذباتی بیانات داغنے کے بجائے فوری طور پر مؤثر اور عملی قدم اٹھائیں۔

۴۔ صدر مملکت، وزیراعظم پاکستان، وزیر خارجہ، وزیر دفاع اور دیگر ارباب اختیار سے بھی اپیل ہے کہ وہ اس سلسلے میں قائدانہ کردار ادا کریں۔

۵۔ بنگلہ دیش میں موجود رجسٹرڈ اور نان رجسٹرڈ تمام مہاجرین کے ساتھ کیمپوں میں جو غیر انسانی سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اس سلسلہ کو بند کیا جائے اور انہیں عزت کے ساتھ رہنے بسنے کی آزادی دی جائے۔ انہیں تعلیم کے مواقع فراہم کیے جائیں اور ان کو صحت اور علاج و معالجہ کی بھرپور سہولتیں دی جائیں نیز عالمی تنظیموں کو ان تک براہ راست رسائی دی جائے۔

۶۔ رنگون اور اخیاب میں او آئی سی یا مؤتمر عالم اسلامی کا باقاعدہ دفتر کھولا جائے تاکہ عالم اسلام کے ذمہ داران روہنگیا مسلمانوں کے حالات سے کماحقہ واقف رہ سکیں۔

۷۔ پاکستان، سعودی عرب، ترکی، ملائیشیا اور انڈونیشیا کی اعلیٰ ترین سطح پر کمیٹی تشکیل دی جائے جو روہنگیا مسلمانوں کی اراکان کے اندر آبادکاری اور ان کے تحفظ کا انتظام کرے اور جتنے روہنگیا مسلمان ممالک میں دربدر ہو چکے، ان کو بنیادی حقوق فراہم کرنے کا اہتمام کرے۔

۸۔ پاکستان کی تمام مؤثر شخصیات سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی، انسانیت کی بنیاد پر اپیل ہے کہ روہنگیا کے مسلمانوں کے دکھ اور مصائب کے ازالے کے سلسلے میں اپنا کردار ضرور ادا کریں۔

۹۔ تمام سیاسی جماعتیں، نیز بااثر شخصیات اور مقتدر علماء کرام ایک ایسی مشترکہ کمیٹی تشکیل دیں جو روہنگیا مسلمانوں کے اراکان کے اندر تحفظ اور دیگر حقوق شہریت کی بہم رسانی کو یقینی بنائے نیز اراکان سے نکل کر پناہ گزینی کی زندگی گزارنے پر مجبور لوگوں کو ''مہاجروں'' کے حقوق دلائے۔

۱۰۔ تمام اہل خیر حضرات سے اپیل ہے کہ روہنگیا مسلمان جو اراکان میں پھنسے ہوئے ہیں اور اسی طرح مختلف ملکوں میں پناہ لے چکے ہیں، ان کی خوراک، صحت اور تعلیم کا مؤثر انتظام کریں اور ترکی حکومت کے تحت کام کرنے والی این جی اوز کے ذریعے بنگلہ دیش میں زیادہ سے زیادہ امداد پہنچائے تاکہ مہاجر کیمپوں میں رہنے والے روہنگیا مسلمان عزت و احترام سے زندگی گزار سکیں۔ ان میں یہ احساس اجاگر ہو کہ ان کا خیال رکھنے والے مسلمان ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔ بنگلہ دیش کی حکومت تنہا سات لاکھ سے زیادہ مہاجرین کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلے میں تمام اسلامی ممالک بنگلہ دیش کا ساتھ دیں۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل اور اس کے جنرل سیکرٹری نے بھی مہاجرین کی فراخدلانہ امداد کے لیے اپیل کی ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کے مسئلے کو عالمی سطح پر زیادہ سے زیادہ اُجاگر کیا جائے تاکہ دنیا اس مسئلے کی حساسیت سے آگاہ ہو اور درد دل رکھنے والے مسلمان اور دوسرے مذاہب کے لوگ مل کر اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکیں۔

●●●

سیدھا راستہ

وقاص چودھری

زندگی کی تلخیوں نے اُسے بھی دوسروں کے دکھ درد سے آشنا کروا دیا... ایک دلگداز کتھا

اکثر جب کالج میں کوئی لیکچر نہ ہوتا تو میں چائے پینے کالج سے فرلانگ کے فاصلے پر واقع فیقے کے ڈھابے پر چلا جاتا۔ جانے کیوں اس کی بنائی ہوئی چائے ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جیسے گھر میں ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہو۔ پردیس میں اپنوں کی خوشبو بھی کبھی کبھی بینائی لوٹانے کا سبب بن جاتی ہے۔ جو چیز بھی اپنی سی لگے دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ فیقے کا ڈھابہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بیٹھنے کے لیے اس نے چار پانچ چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں جن کی پائنتیوں پر بڑے سلیقے سے کھیس ڈال رکھے تھے۔

راہ چلتے مسافروں، ہل مزدوروں اور طلبہ کی اکثریت یہاں رش جمائے رکھتی۔ مزدوروں اور ڈرائیوروں کو خوش کرنے کے لیے اس نے ایک حقہ بھی رکھا ہوا تھا جو آٹھوں پہر تازہ رہتا۔ ایک ہجوم ہر وقت اس کے گرد مختلف موضوعات پر تبصرے کرتا ہوا ملتا۔

ان میں سے بہتوں کے پاس اگرچہ علم و دانش اور اصولوں سے واقفیت کا فقدان تھا مگر وہ ضرور موجود تھا جو اس ٹیکنالوجی کے دور میں ختم ہوتا جا رہا ہے، ان کے پاس ایک دوسرے کو سننے کا وقت تھا۔ کچھ باتوں کو بغیر سوچے سمجھے بس مان لینے کی معصومیت تھی۔ گنجلک افکار سے پُردماغ اطمینان کی سیہ رمق پانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اکثر نظر آ جایا کرتے۔ انہی میں ایک شخص نور محمد بھی تھا۔ عمر کوئی پچاس پچپن سال کے قریب ہوگی۔ سفید ریش، ملنسار اور ہر وقت مسکراتا ہوا ایک مطمئن چہرہ۔

فیقے نے باتوں باتوں میں ایک دن بتایا تھا کہ نور محمد شہر کا نامور وکیل ہے۔ تب سے مجھے اس شخص کے متعلق مزید جاننے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً میں بھی اسی جگہ بیٹھنے لگا جہاں نور محمد

بیٹھا کرتا تھا۔ کچھ دنوں کی سلام دعا کے بعد جب شناسائی مزید بڑھی تو مجھے معلوم پڑا کہ یہ شخص نہ صرف ایک قابل وکیل ہے بلکہ دیگر علوم میں بھی گراں قدر مہارت رکھتا ہے۔ میں اس سے قانون کے بارے میں ڈھیروں سوال کیا کرتا۔ کبھی کبھی وہ مقدموں کی روداد بھی سنا دیا کرتا۔

یہ برکھارت کی ایک دوپہر تھی۔ فضا میں نمی کا احساس تھا۔ سورج کے چہرے پر بادلوں نے اپنا پردہ ڈال رکھا تھا۔ میں فیقے کے ڈھابے پر اسی جگہ بیٹھا تھا' نور محمد کے سامنے۔ معاشرتی خرابیوں پر باتیں کرتے کرتے میرے چہرے پر مایوسی کا تاثر دیکھ کر وہ مسکرایا اور کہنے لگا:

آج میں تمہیں ایک بہت پرانی کہانی سناتا ہوں جواب بھی مجھے حرف بہ حرف، منظر بہ منظر یاد ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سڑکوں پر کاروں اور بسوں کی تعداد بہت کم اور تانگوں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔ عام سڑکوں پر برقی قمقمے بھی نہ ہوتے۔ جاڑے کا موسم تھا، دھند اتنی تھی کہ چند قدم آگے دیکھنا محال تھا۔ ایسے میں ایک بڑھیا لڑکھراتے قدموں اور تیز سانسوں کے ساتھ اپنی لاٹھی کے سہارے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تانگوں اور موٹروں نے اس شاہراہ کو مصروف کر رکھا تھا۔ لاٹھی سے بڑا سہارا اس کے ساتھ چلتا دس بارہ سال کا لڑکا تھا جو اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اگرچہ کم عمر تھا مگر اتنا مضبوط تنکا ضرور تھا کہ ڈوبتی بڑھیا کو کنارے تک پہنچا دے۔ وہ سہما ہوا تھا مگر اپنے حواس پر اس کا قابو تھا۔

آنکھوں میں کوئی خوف تھا جو اس سڑک پر چلتی لاریوں کا ہرگز نہیں تھا۔ ان دونوں کو سڑک کے پار بنے پان اور سگریٹ کے کھوکھے تک جانا تھا۔ آخر اللہ اللہ کر کے انھوں نے سڑک پار کی اور اس تک پہنچ گئے۔ یہ ایک عام سا کھوکھا تھا جیسے سڑک کنارے ہوا کرتے ہیں۔ ٹین اور لکڑی کا ملا جلا سا ایک مکعب۔ کھوکھے کا مالک سامنے کا پٹ آدھا نیچے گرا کر بیٹھا تھا تاکہ وہ سردی سے محفوظ بھی رہے اور گاہکوں کو بھی اس کی موجودگی کا معلوم ہو سکے۔ بڑھیا نے اپنی لاٹھی سے ٹین کے پٹ کو کھٹکھٹایا۔

''بیٹا سگریٹ کی ڈبی دے دو۔'' اس نے اپنی کانپتی آواز میں دکاندار سے کہا۔

''اچھا دیتا ہوں اماں۔'' دکاندار نے اپنے پاس کھڑے لڑکے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اس طرف متوجہ کیا اور دونوں مسکرانے لگے۔

بڑھیا اور بچہ سگریٹ لے کر ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک قہقہہ بلند ہوا، جو دکاندار اور اس کے دوست کا تھا۔

"دیکھو یار! اماں کو اس عمر میں بھی چین نہیں..... ٹانگیں قبر میں اور کام دیکھو..... توبہ توبہ۔''

بڑھیا تو شاید سماعت کی کمزوری کے باعث نہ سن سکی ہو مگر لڑکے نے سن کر نظر انداز کر دیا۔ چند منٹ کی مسافت کے بعد وہ دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں انہیں جانا تھا یعنی شہر کے تھانے میں!

بڑھیا نے اندر داخل ہو کر کرسی پر بیٹھے ایک شخص کو سگریٹ کی وہ ڈبیا تھما دی۔ اس کا سفید، جھریوں سے بھرا چہرہ اب ایک دم سے زرد پڑ گیا۔ ملتجی لہجے میں کہنے لگی:

''بابو اب تو میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ تم نے کہا تھا نا کہ پہلے سگریٹ لے کر آؤ۔ بابو میرا بچہ بے قصور ہے' وہ تو صرف روٹی لینے گھر سے نکلا تھا۔''

''اماں' چوری کا کیس ہے اس پہ چوری کا۔ وہ بھی ہوٹل کے مالک کی چوری جو سیاسی کارکن بھی ہے۔ ایسے نہیں چھوٹے گا۔ اب چھوڑنے کا فیصلہ یا تو بڑے صاحب کریں گے یا عدالت لیکن تجھے تیرے لڑکے سے ملوا دیتا ہوں۔'' اس شخص نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا جیسے کوئی بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔

بڑھیا اپنے لڑکے سے ملی۔ مار کی وجہ سے اس کی حالت قابل رحم حد تک خراب ہو چکی تھی۔

''اماں تو جانتی ہے نا میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ لازمی تو نہیں کہ پرانے کپڑے میرے چور ہونے کی طرف اشارہ کریں اور چوری تو میرے ہوٹل پر پہنچنے سے پہلے ہو چکی تھی۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔

"ہاں جمیلے پتر' میں جانتی ہوں تو بے قصور ہے۔ میں بڑے صاحب سے کہوں گی کہ تیرے اس دس سالہ بچے کا سوچ کر ہی تجھے رہا کر دیں جس کی ماں برسوں پہلے گزر چکی اور اب تو ہی اس کا سب کچھ ہے۔ میری کمزور ہڈیوں میں اتنی جان کہاں کہ اسے پڑھانے کے لیے کام کر سکوں۔''

لیکن اس سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ بڑھیا کبھی بڑے صاحب تک پہنچ ہی نہیں سکی اور نہ کوئی وکیل اس کی مدد کر سکا۔ ایسے لاوارث مجرم پر دو تین کیس مفت میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ اب بڑھیا کے لڑکے کو حوالات سے جیل منتقل کر دیا گیا۔ بڑھیا کے پاس جو تھوڑا بہت پیسا تھا' وہ چند دنوں میں ہی ختم ہو گیا۔

گھر میں نوبت فاقوں کی آئی تو دس سالہ لڑکے کو گھر کا کماؤ پوت بننا پڑا۔ کبھی پٹرول پمپوں پر گاڑیوں کے شیشے صاف کرتا۔ کبھی کسی بڑے صاحب کے بچوں کے اسکول کے بستے اٹھانے کی نوکری کرتا۔ وہ اب چند ماہ پہلے والا معصوم بچہ نہیں رہا تھا جسے کھلونوں کے لیے ضد کرنی تھی۔ گلی میں دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنا تھا۔ اسکول سے چھٹی کرنے کی خاطر رونا تھا۔

زندگی نے اس کے سامنے اپنی تلخ حقیقت کو کھول دیا۔ زندگی عجیب ہے وقاص بابو۔ یہ کچھ لوگوں کی جھولی میں رعنائیاں ڈالتی ہے اور کچھ کی جھولی میں اپنی تلخ حقیقتیں۔

اسے پھولوں کی سیج سے یک دم اٹھا کر خاردار جھاڑیوں کے درمیان پٹخ دیا گیا۔ اسے اب مالک کی مار بھی کھانی تھی، کام کرنا تھا اور بہت کچھ سہنا تھا۔ دو سال بعد خبر آئی کہ چند قیدی جیل سے بھاگنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ انہی میں ایک بڑھیا کا بیٹا بھی تھا۔ وہ بہت روئی تھی۔ امید پہ امید ٹوٹے تو زندگی مایوس سی ہو جاتی ہے۔ اب بڑھیا شاید مزید کچھ سہنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ خبر سننے کے چند ہفتوں بعد ہی اپنے بیٹے کے پاس جا پہنچی۔

''اس لڑکے کا کیا بنا؟'' میں اب مکمل توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ کھلے منہ کے ساتھ جیسے کوئی بچہ نانی کی کہانیاں سنتے سنتے اپنے تخیل میں شہزادوں اور پریوں کے دیس پہنچ جاتا ہے۔ مجھے بھی کہانی اور اس کے کردار تخیل کے کسی خانے میں اپنے سامنے دکھائی دے رہے تھے۔

''اس نے کام کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ مزدوری کرتا تھا اور اپنی پڑھائی بھی۔ اب وہ اس شہر میں وکیل ہے۔ وہ بے قصور لوگوں کے مقدمے بغیر فیس کے لڑتا ہے۔ پچاس سال کا ہو گیا ہے اور تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔'' نور محمد مسکرا رہا تھا۔ میرے دل میں اس کی عزت کا خانہ مزید وسیع ہو گیا۔ ●●●

ڈینگ

ایک پھلدار درخت کبھی بھی پکار پکار کر نہیں کہتا:
میں پھلدار ہوں..... میں پھلدار ہوں.....
دوسرے کہتے ہیں کہ یہ پھلدار ہے۔ بس پھلدار درخت کی ایک نمایاں ترین علامت یہ ہے کہ اس کی ٹہنیاں جھکی ہوتی ہیں..... جتنا زیادہ پھل..... اتنی ہی زیادہ عاجزی۔

جتنی عاجزی ہو گی..... اتنا ہی پھل ملے گا۔

جب تیز آندھی چلتی ہے تو پھلدار درخت خاموش ہوتے ہیں..... اور دوسرے درخت ''شاں شاں'' کر رہے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا، تھوتھا چنا باجے گھنا۔!

انسانی جسم کی فیکٹری

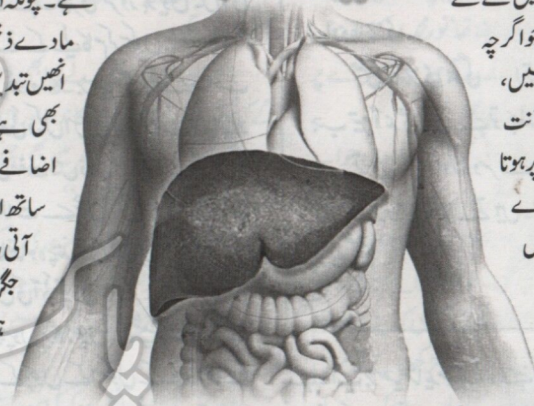

عمل صفائی انجام دینے والا یہ کارخانہ بند ہوجائے تو انسان کا بھی آخری وقت آن پہنچتا ہے

ڈاکٹر جاوید اقبال

انسان کے بدن میں جگر اہم ترین اعضاء میں شامل ہے۔ یہ خاص طور پر ہمارے نظامِ ہضم کا بنیادی حصہ ہے۔ جگر کا وزن تقریباً تین پونڈ ہے۔ یہ عضو پیٹ کے دائیں طرف واقع ہے۔ زیادہ تر حصہ نچلی پسلیوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دایاں حصہ بائیں حصے سے ذرا بڑا ہے۔ بایاں حصہ جو اگرچہ واضح طور پر منقسم نہیں، معدے اور اثنا عشری آنت کے کچھ حصے کے اوپر ہوتا ہے۔ ایک سائنسی اندازے کے مطابق انسانی جسم میں تقریباً ۵۰۰ افعال جگر کے ذمے ہیں۔

جگر کے خلیے ہزاروں کثیر شاخہ نالیوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مرکزی رگ سے منسلک ہوتا اور آنتوں میں موجود غذا سے خون وصول کرتا ہے۔ دوسرے اعضاء مثلاً گردوں اور پھیپھڑوں کی طرح جگر میں بھی بافتوں کی تعداد کافی حد تک فاضل ہوتی ہے۔ چنانچہ ضرورت پڑنے پر جگر کا تین چوتھائی حصہ کاٹا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں جگر کا فعل بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔

ایک صحت مند آدمی کے جگر کا وزن دِل یا گُردوں کے وزن سے تقریباً چار گُنا زیادہ ہے۔ یہ کیپسول کی طرح ایک ہموار جھلی میں ملفوف ہوتا ہے۔ جگر چپٹا اور ایک طرف سے گول گنبد نُما ہے۔ انسانی جگر کی ظاہری شکل وصُورت بالکل گائے کے جگر جیسی ہے۔ چونکہ اس میں بہت سے مادے ذخیرہ ہوتے ہیں اور یہ انھیں تبدیل شُدہ شکلوں میں بدلتا بھی ہے، اس لیے عُمر میں اضافے اور تغذیہ کے ساتھ ساتھ اس کے حجم میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

جگر تباہ کیسے ہوتا ہے؟

ہم جو کچھ کھاتے پیتے ہیں اس سے جگر بہت متاثر ہوسکتا ہے۔ انسانی ہاضمے کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب غذا منہ سے گزر کر معدے اور آنتوں میں پہنچتی ہے۔ اس عمل کا انحصار امینو ایسڈ، گلوکوز اور روغنی تیزابوں پر ہے۔ مقویات جذب کرنے کا عمل چھوٹی اور بڑی آنت میں جنم لیتا ہے۔ اگر ہاضمے کا عمل ٹھیک ہو تو آنتوں میں مقویات کے جذب ہونے کے بعد فضلہ خارج ہوجاتا ہے۔

اس پورے نظام کا اثر انسان کے دورانِ خون پر بھی پڑتا ہے جو فوری طور پر جگر کو متاثر کرتا ہے۔ اگر زہریلا اور بے کار مادہ جسم سے پوری طرح خارج نہیں ہوتا اور اس کا کچھ حصہ یا کافی حصہ خون میں شامل ہوگیا تو جگر اپنا کام صحیح طرح سے نہیں کر پائے گا۔ جگر کی صحت کے لیے متوازن غذا کا استعمال اور ایسی ورزش بہت اہم ہے جس میں لمبے لمبے سانس لیے جائیں۔ شراب، نکوٹین، جانوروں سے حاصل شدہ چکنائی اور روغنی تیزاب جگر کے لیے انتہائی مضر ہیں۔ جگر کا بیڑہ غرق کرنے میں درج ذیل عناصر کا بہت بڑا ہاتھ ہے:

۱۔ تیز مرچ مسالے والی غذائیں۔ کوئلے پر بھنا گوشت، کباب یا چکن پیس کھانے والے بہت جلد جگر کو تباہ کرلیتے ہیں۔

۲۔ غیر معیاری تیل میں پکائے گئے کھانے جگر کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۳۔ معمولی درد روکنے کے لیے فوری طور پر درد کش (pain killer) ادویہ کھانے والے افراد جگر کی تباہی کا خود سامان کرتے ہیں۔

۴۔ مرغ کڑاہی اور خاص کر برائلر کڑاہی کھانے کے شوقین افراد جو دالیں اور سبزیاں بالکل نہیں کھاتے، ان کا جگر ناکارہ ہونے لگتا ہے۔

۵۔ تمباکو اور دیگر نشہ آور اشیاء کا بکثرت استعمال۔

۶۔ بخار یا کسی عارضے کو فوری طور پر کم کرنے کے لیے اندھا دھند اینٹی بائیوٹک ادویہ کھانا۔

۹۔ دمہ، الرجی، ڈسٹ الرجی، ہائی بلڈ پریشر، ٹینشن، ڈپریشن، جوڑوں کے درد، نیند نہ آنے یا اس طرح کے دیگر امراض کے علاج کے لیے سٹیرائیڈز کا استعمال جگر کے خلیے تباہ کر دیتا ہے۔

۱۰۔ مردانہ طاقت کی کوئی بھی دوا جگر کو نقصان پہنچاتی ہے۔

جگر کی صحت کے لیے درج ذیل اشیاء کا استعمال کم سے کم کیا جائے:

چائے، کافی، سفید آٹا، کیمیائی عمل سے گزری ہوئی غذائیں، گوشت، مکھن، تلی ہوئی چیزیں، گرم مسالے اور دیگر

مسکراہٹیں

مُلّا نصیرالدّین کے ہاں دعوت تھی۔ مُلّا پڑوسی سے کچھ برتن مانگ کر لائے۔ جب اُنھوں نے برتن واپس کیے تو ساتھ ہی ہر برتن کے ساتھ ایک چھوٹا سا زائد برتن بھی دے دیا۔ پڑوسی نے حیران ہوکر پوچھا، ''یہ کیا ہے؟''

مُلّا نے کہا، ''آپ کے برتنوں نے بچّے دیے ہیں۔''

پڑوسی نے زائد برتن بھی رکھ لیے۔ کچھ دنوں بعد مُلّا نے اُسی پڑوسی سے پھر کچھ برتن مانگے۔ کئی دن گزر گئے۔ پڑوسی نے برتنوں کا تقاضا کیا تو مُلّا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''وہ مر گئے۔''

پڑوسی نے حیران ہوکر پوچھا، ''کیا برتن بھی مرسکتے ہیں؟''

مُلّا نے بڑے تحمل سے کہا، ''کیوں نہیں! اگر برتن بچّے دے سکتے ہیں تو مر بھی سکتے ہیں۔''

☆☆☆

ایک آدمی پٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمت پر اظہارِ افسوس کررہا تھا۔ اُس کے دوست نے پوچھا، ''یار! تمھارے پاس کار ہے نہ اسکوٹر، پھر تم پٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمت سے کیوں گھبرا رہے ہو؟''

اِس پر اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا، ''یہ دیکھو میرا لائٹر، پٹرول سے جلتا ہے۔''

☆☆☆

بادی اور ثقیل اشیاء۔

ماہرینِ غذا کہتے ہیں کہ جگر کی تندرستی کے لیے سبزیاں کھائیں۔ آٹا چوکر سمیت استعمال کریں۔ آلو، سورج مکھی اور زیتون کا تیل، شہد، جڑی بوٹیوں کی چائے، سیب کارس، انگور اور دیگر گودے دار پھل وافر مقدار میں کھائیں۔ بعض ماہرین کے خیال میں ہفتہ میں ایک دن فاقہ کرنا جگر کے افعال تیز کرتا ہے۔

جگر کی سوزش یا ورم / ہیپاٹائٹس (Hepatitis)

جگر کے خلیات میں سوزش کو ہیپاٹائٹس کہتے ہیں۔ اصطلاح میں Hept جگر کو کہا جاتا ہے جبکہ Itis کے معنی سوزش کے ہیں۔ سوزشِ جگر بنیادی طور پر دو قسم کی ہے:

۱۔ متعدی سوزشِ جگر: یہ سب سے اہم اور عام طور پر لاحق ہونے والی سوزش ہے۔ اس سوزش کا سبب وائرس ہوتا ہے جسے اے بی سی ڈی یا مختلف نام دیے جاتے ہیں۔

۲۔ غیر متعدی سوزشِ جگر: وائرس کے علاوہ جسمانی دفاعی نظام کی خرابی یا نظریہ طب یونانی کے مطابق جسم میں غیر طبعی تغیر واقع ہونے یا مضر جگر ادویات کے ذریعے جنم لینے والی سوزش غیر متعدی سوزش کہلاتی ہے۔

قدیم نظریے کے مطابق غذا کی خرابیوں کی وجہ سے خون میں گندگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یوں جسم میں حسبِ ضرورت خون پیدا نہیں ہو پاتا اور جگر کے افعال اور پٹھے کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جگر ماؤف ہو جاتا ہے اور ورم کا باعث بنتا ہے۔ جدید سائنس کے مطابق ہیپاٹائٹس کا مرض ایک موذی وائرس کی بدولت لاحق ہوتا ہے۔ وائرس کے سرایت کرنے سے جگر کے خلیات مردہ ہونے لگتے ہیں اور بالآخر جگر کے فعلیاتی نظام میں کافی حد تک تبدیلی آجاتی ہے۔

سوزش جگر کا باعث بے شمار اشیاء سمیت زہریلی ادویہ کا استعمال، طفیلی کیڑے اور دیگر ایسی ادویہ بنتی ہیں جو مابعد اثرات کی حامل ہوں۔ ماہرین کے مطابق اس مرض کا سبب بننے والا وائرس اتنا مہلک ہے کہ مریض کے خون کا چوتھائی چائے والا چمچ ایسے تالاب میں ڈال دیا جائے جس میں ایک لاکھ لیٹر سادہ پانی موجود ہو اور پھر اس کا چوتھائی چمچ کسی جاندار کو پلایا جائے تو اُسے بھی یہ مرض لاحق ہو جائے گا۔

ہیپاٹائٹس کے اسباب

ہیپاٹائٹس کی تمام اقسام کے جنم لینے والے اسباب تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ ان کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔ انتقال خون سے یعنی متاثرہ شخص کے خون سے، لینے والے میں یہ مرض منتقل ہو جاتا ہے۔

۲۔ استعمال شدہ سرنج کا بار بار استعمال بہت بڑا سبب ہے۔

۳۔ غیر مستند اور عطائی دندان ساز جو عموماً فٹ پاتھوں پر اپنے ہسپتال سجائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

۴۔ حجام حضرات کے ایک ہی اُسترے سے کئی شیو اور ایک ہی تولیہ مختلف افراد کے استعمال کرنے سے یہ مرض پھیلتا ہے۔

۵۔ ناک وکان چھدوانے والے آلے اگر تبدیل نہ کیے جائیں تو عموماً متاثرہ خواتین سے صحت مند عورتوں میں یہ وائرس منتقل ہو جاتا ہے۔

۶۔ آکوپنکچر طریقہ علاج کے تحت سوئیوں سے علاج ہوتا ہے۔ اگر یہ سوئیاں مختلف مریضوں میں بار بار استعمال کی جائیں تو مرض پھیلنے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔

۷۔ متاثرہ مریضوں کے ساتھ جسمانی قربت مرض پھیلانے کا بڑا ذریعہ ہے۔

۸۔ متاثرہ ماں سے پیدا ہونے والے بچے کو بھی یہ مرض منتقل ہو جاتا ہے۔

۹۔ ایسے افراد جو متاثرہ مریض کی تیمارداری کرتے ہوں اور کوئی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کریں، وہ بھی ہیپاٹائٹس کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

۱۰۔ مریض کے لعاب دہن میں یہ وائرس موجود ہو سکتا ہے۔

●●●

دو ٹکے کا آدمی

ظاہر و باطن میں تمیز نہ رکھنے والے ایک کم عقل نوجوان کی سبق آموز داستان

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

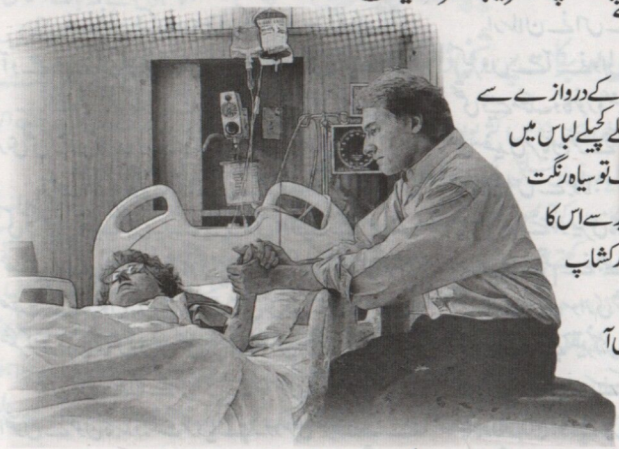

"دیکھ کر نہیں چل سکتے، اندھے ہو گیا؟"

ارسلان زور سے دہاڑا۔ ہسپتال کے دروازے سے نکلتے وقت اپنی پریشانی میں مگن وہ میلے کچیلے لباس میں ملبوس ایک نوجوان سے ٹکرا گیا تھا۔ ایک تو سیاہ رنگت پر ارسلان کو ویسے ہی سخت ناپسند تھی اوپر سے اس کا لباس، لگ رہا تھا کہ وہ کسی گاڑیوں کی ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔

"اتنے بڑے ہسپتال میں بھی آ ٹکتے ہیں دو ٹکے کے یہ لوگ۔ ارے جائی جاؤ کسی سرکاری ہسپتال میں، یہاں علاج کروانے والا تھوبڑا ہے کیا تمہارا؟"

وہیں کھڑے کھڑے ارسلان نے اس نوجوان کو کھری کھری سنا دیں۔

اماں کے دل کی سرجری ہوئی تھی۔ کسی پیچیدگی کی وجہ سے خون زیادہ بہ گیا تھا اور اب خون درکار تھا۔ ڈاکٹروں نے چند گھنٹوں کا وقت دیا تھا کہ اگر خون کا بندوبست ہو جائے تو جان بچ سکتی ہے۔"

بدقسمتی سے اماں کے خون کا گروپ ایسا نایاب تھا یا ہسپتال کے پاس موجود نہیں تھا بہرحال وہ ہسپتال سے دستیاب نہیں ہوا۔ اچانک اسے اماں کی حالت یاد آئی تو وہ سب کچھ بھول بھال کر پھر باہر کی طرف دوڑا۔ تمام رشتہ داروں،

دوستوں اور احباب کو خون کے لیے کہا تھا مگر عین وقت پر کسی کو کوئی بیماری نکل آئی تو کسی میں خون کم پڑ گیا۔ کوئی شہر سے باہر چلا گیا تو کوئی شہر میں ہوتے ہوئے بھی غائب ہو گیا۔

اب وہ قریب ہی واقع شہر کے سب سے بڑے بلڈ بینک کی طرف جا رہا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہاں سے خون مل ہی جائے گا۔ مگر وہاں پہنچنے پر بھی اسے انکار کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اماں کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ تبھی موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اس کی بیوی تھی۔ ''ارسلان! اماں کی حالت بگڑ رہی ہے تم کہاں ہو؟''

وہ کیا جواب دیتا۔ اچانک اسے اپنے ماموں کا خیال آیا۔ اماں اور ان کے خون کا گروپ یکساں تھا لیکن پچھلے دس سال سے ان کی اور اماں کی بول چال نہیں تھی۔ ارسلان نے سوچا' شاید بہن کی حالت کا سن کر بھائی کا دل نرم پڑ جائے۔ اس نے ماموں کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک دو دفعہ گھنٹی بجنے کے بعد دوسری طرف سے ماموں کی آواز آئی۔ ''ارے ارسلان بیٹا، کیا ہوا؟''

خلاف توقع ماموں کا لہجہ نہایت نرم تھا۔ ''کیا ہوا بیٹے خیر تو ہے نا؟'' ارسلان نے ساری بات بتا دی۔ ماموں بولے: ''تم فکر نہ کرو بیٹے' میں اپنے بیٹے کو ابھی بھیجتا ہوں، اس کا بھی یہی خون گروپ ہے، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے فون بند کیا اور ہسپتال کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی آدھے راستے میں ہی تھا کہ اس کی بیوی کا فون پھر آ گیا۔

یا اللہ خیر!! ارسلان کے دل سے دعا نکلی۔ اس کی بیوی کہہ رہی تھی کہ خون کا بندوبست ہو گیا ہے، تم آ جاؤ جلدی سے۔

ماموں کا لڑکا پہنچ گیا ہو گا۔ اس نے سوچا اور تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے تپتے صحرا میں ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہوں۔ دل کر رہا تھا اس فرشتہ صفت کے قدموں میں بیٹھ جائے۔ دل ہی دل میں وہ ماموں کا شکر گزار ہو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، یہ ماموں تھے۔

فون کان سے لگاتے ہی اس نے ماموں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے خون کا بندوبست کر دیا ہے۔ دوسری طرف سے ماموں حیران ہو کر بولے: ''نہیں بیٹا میں نے تو تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ میرے لڑکے نے ابھی ایک مہینا پہلے ہی کسی کو خون دیا ہے۔ اس لیے وہ نہیں آ سکے گا۔ بہر حال خوشی کی بات ہے اگر خون کا بندوبست ہو گیا ہے ہم شام کو چکر لگائیں گے۔''

''یا اللہ پھر یہ فرشتہ کون ہے؟ ان ہی سوچوں میں گم وہ ہسپتال پہنچ گیا۔ پہنچتے ہی سب سے پہلے وہ خون عطیہ کرنے والے کمرے میں گیا۔ وہاں موجود عملے سے اس نے پوچھا اماں کو خون دینے والے صاحب کہاں ہیں؟ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے ایک بستر کی طرف اشارہ کیا۔

جونہی ارسلان کی نظر اس بیڈ پر پڑی وہ سُن ہو کر رہ گیا۔ اس کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ یہ وہی میلے کچیلے لباس میں ملبوس سیاہ رنگت والا ''دو ٹکے'' کا نوجوان تھا۔ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ وہ اس کی طرف بڑھا۔

''تم..... کیسے..... کس نے تمہیں.....'' بے ربط سے الفاظ اس کے منہ سے نکلنے لگے۔

''آپ نے خون کے لیے اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا اتفاق سے میں قریب ہی بیٹھا تھا اور آپ کی ساری باتیں سن لیں چونکہ میرے خون کا گروپ بھی یہی ہے لہٰذا آپ کی اماں کو خون دینے آ گیا۔'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

ارسلان نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کے کپڑوں سے آنے والی ڈیزل کی بُو اب اُسے ایسے لگ رہی تھی جیسے مشک و کافور و عنبر ہو۔ اُس کی سیاہ رنگت پر ساری دنیا کی سفیدی قربان کرنے کو دل چاہتا تھا۔ فرطِ جذبات میں ارسلان اس سے بولا:

''جانتے ہو میری ماں کو خون دینے سے بھی بڑا ایک احسان کیا ہے تم نے مجھ پر؟ تم نے مجھے آج یہ سکھا دیا کہ میں اگر بادلوں پر بھی سواری شروع کر دوں تو بھی زمین کا ایک ذرہ بھی میرے لیے حقیر نہیں۔ سیاہ رنگت کے پیچھے بھی شیشے کی طرح صاف دل ہو سکتے ہیں۔ بدبودار لباس کے پیچھے بھی خوشبودار بدن ہو سکتے ہیں۔'' ◆◆◆

پُل و چاہ نہیں پوتا بنا

پوتے کی خوبیوں اور برکات پر روشنی ڈالتا اچھوتا قلمی مرقع

پروفیسر غلام جیلانی اصغر

نام کو زندہ رکھنے کا سب سے سہل اور ارزاں طریقہ پوتا ہے۔ طریقے تو اور بھی ہیں، جیسے پُل بنا، چاہ بنا، تالاب بنا، لیکن ایک تو یہ کام ڈھنگ کے ہیں اور پھر ان سے نتیجہ بھی خاطر خواہ نہیں نکلتا۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جس کام کو کارِ خیر سمجھ کر کیا گیا وہ فساد خلق بلکہ بدنامی کا سبب بن جاتا ہے۔ لوگ نیک کاموں کو تو بھول جاتے ہیں لیکن بدنیتی کو بُرے شعر کی طرح یاد رکھتے ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں جنھیں ورثے میں ذخیرہ اندوزی اور کارِ خیر کا جذبہ ملا ہوا ہے۔ ان کے والد مرحوم بھی غالباً کسی کارِ خیر میں ہی مرے تھے۔ چنانچہ سعادت مند بیٹے نے آبائی روایت کو ہمیشہ آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے اپنی نیک نامی کو پائیدار بنانے کے لیے گاؤں میں ایک کنواں کھدوایا۔ پانی ذرا کھارا تھا۔ قصور تو طبقات الارضی کا تھا لیکن الزام میرے دوست پر آ گیا۔ جو عورت بھی پانی بھرنے آتی صرف پانی میں ہی عیب نہ نکالتی بلکہ میرے دوست کی نیت پر شک کرتی اور اس کے شجرہ نسب میں سینکڑوں عیوب کی نشاندہی کرتی، مثلاً یہ کہ اس کا باپ معروف سمگلر تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اب گاؤں میں ہزار خرابیاں سہی لیکن اس میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ بات آکاس بیل کی طرح بڑی تیزی سے پھیلتی ہے۔ وہی بات جو بظاہر بے ضرر سی نظر آتی ہے، دوسرے محلے میں پہنچتے پہنچتے اس کی صرف گرائمر ہی نہیں بلکہ مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔

چنانچہ میرے دوست کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا۔ بات چلتے چلتے اس مقام پر پہنچی جہاں کنواں بند کروانا لازمی ہو گیا۔ اب میرا دوست صرف ٹھیکیداری کرتا اور نیکی کے کاموں سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہے..... پُل بنانے کا مجھے کوئی زیادہ تجربہ نہیں صرف ایک دو پُلوں پر انتہائی احتیاط سے چلا ہوں۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ نام زندہ رکھنے کے لیے یہ طریقہ

کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ البتہ پوتا، جیسے میں نے ابتدا میں ذکر کیا، اپنے اسلاف کے نام زندہ رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے معاشرے میں پوتا پیدا کرنے کا عام رواج ہے۔

ہر ذی فہم باپ اپنے بیٹے سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ہمہ وقت (یا کم از کم فرصت کے وقت) کوشاں رہے گا۔ اسی لیے جن گھروں میں پوتا نہیں ہوتا وہاں سوگواری اور مایوسی کی ایسی عجیب سی کیفیت پائی جاتی ہے جیسے ابھی ابھی کوئی فانی کے شعر پڑھ کر اٹھا ہو ؎

کفن سرکاؤ منہ سے بے زبانی دیکھتے جاؤ

پوتا ایک خاندان ہی نہیں بلکہ اپنے قبیلے کی ساری روایات کا نمائندہ و نگہبان ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کیونکہ معاشرہ پدری اساس پر استوار ہے، اس لیے پوتے کی پیدائش کو ایک معرکہ سمجھا جاتا ہے۔ جونہی پوتے کے ورود کی خبر اندرون خانہ سے بیرون در آتی ہے (درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟) تو اچھے بھلے معقول لوگ غیر معقول بن جاتے ہیں۔

خبر کی اہمیت کے پیش نظر خود دادا اس خبر کو براڈ کاسٹ کرنے کے لیے اناؤنسر کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ گھر کے باہر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چہرے پر خوش کلامی، تفاخر اور لازوال مسکراہٹ کا خول پہن لیتا ہے۔ ہر غیر متعلق آدمی کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا اور اسے بتاتا ہے کہ وہ آج بہت خوش ہے۔

کبھی کبھی وہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ دوسرے اس کی بے پایاں مسرت کی وجہ دریافت کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ دراصل اس کی خوشی موسم کی خوشبو کی طرح تمام فضا کا احاطہ کر لیتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے پوتے نے پیدا ہو کر صرف دادا اور اس کے متعلقین کو ہی نہیں بلکہ سارے ماحول کو متاثر کیا ہے۔ اس کی پیدائش جلتے ہوئے صحرا میں ساون کی پہلی بوند کی طرح ذی روح کو زندگی کا نیا پیغام دیتی ہے۔ دادا ہر گزرنے والے سے پوچھتا ہے کہ شہر میں کون سا قابل اعتماد حجامت سپیشلسٹ ہے۔ نرسری اسکول کون سا اچھا ہے؟ فیڈرکس کمپنی کے اچھے ہوتے ہیں؟ اور کون سا پاؤڈر ملک ماں کے دودھ کے قریب بلکہ عنقریب ہوتا ہے۔

یہ تمام سوال اتنی تیزی سے لوگوں کے درمیان گردش کرتے ہیں کہ اکثر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ حضرت دادا ابا حضور عمر عزیز کی اس سرحد سے آگے نکل گئے ہیں جہاں معقولیت اور غیر معقولیت میں تمیز کی جاتی ہے لیکن غیر متعلق آدمی کو بوڑھے دادا کی خوشی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ بوڑھا دادا تو پوتے کے ساتھ از سر نو پیدا ہوا ہے۔ اس کی عمر کی وہ رسی جس کا دوسرا سرا بالکل قریب نظر آتا تھا، اب طویل ہو کر صدیوں پر محیط ہوگئی ہے۔ دادا کے سامنے صرف پوتے کا ہی سلف نہیں، بلکہ اُن ننھے منّے پوتا در پوتا پوتوں کا بھی ہے جو قبیلے کی روایات کی ڈور کو مضبوطی سے پکڑے ایک نہ ختم ہونے والے قافلے کی طرح آگے بڑھ رہے ہیں۔

دادا اپنے پوتے کی شکل میں تاریخ کی اس متحرک روح کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو افراد سے بے نیاز ہو کر نسلوں کو انگلی سے پکڑے آگے بڑھ رہی ہوتی ہے۔ جب تک پوتا عالم غیب سے منظر عام پر نہیں آیا تھا، تو تاریخ رکی پڑی تھی اور بوڑھے دادا کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ کوئی حادثہ، کوئی ناشدنی واقعہ اس تاریخی تسلسل کو یکسر منقطع نہ کر دے لیکن اب اسے کوئی ڈر نہیں۔ اب تو تاریخ پوتے کی ناف کی گرہ سے بندھی ہوئی ہے۔ جس طرف وہ حرکت کرتا ہے تاریخ بھی اس مدار میں گھوم جاتی ہے۔ پوتے نے پیدا ہو کر صرف ایک محدود خاندان پر ہی احسان نہیں کیا بلکہ اس نے تاریخ کے دھارے کو بھی متاثر کیا ہے۔

وہی تاریخ جو ایک نقطہ پر رُکی کھڑی تھی، اَب وسیع تر مدار میں داخل ہوگئی ہے، چنانچہ دادا اس تاریخی امر کا عوامی طور پر اعتراف کرنے کے لیے سرِ راہ کھڑا ہو جاتا ہے اور ہر گزرنے

والے کو ہدیہ تبرک پیش کرتا ہے۔ حالانکہ بظاہر ان تمام لوگوں کا اس تاریخی واقعہ سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ بھی اس فضا میں سانس لے رہے ہیں جس میں نوزائیدہ پوتا سانس لے گا۔

پوتے کی آمد پر بوڑھے دادا کی خوشی تو ایک حد تک سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ اس کی گھٹتی عمر میں مزید کئی صدیوں کا اضافہ ہوگیا۔ وہ پہلے اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا لیکن وہ اب تاریخ کے مربوط سلسلے کی ایک کڑی بن گیا ہے۔ پہلے اسے خدشہ لگا رہتا تھا کہ اگر اس کے بیٹے نے اپنی ذمے داری کو پورا نہ کیا تو وہ اس زنجیر کی طرح بن جائے گا جس کا ایک سرا ہوا میں معلق ہو اور دوسرا کہیں ماضی کے جھٹپٹے میں غائب ہوگیا، لیکن اب اسے یقین ہوگیا ہے کہ زندگی کی ریلے ریس میں جو بیٹن (Baton) اس نے اپنے مرحوم باپ سے لیا تھا، وہ اب قابل اعتماد ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔

اس لحاظ سے دادا کی خوشی بڑی حد تک جائز اور قابل فہم ہے لیکن خوشی تو قبیلے کی دیدنی ہوتی ہے! ابھی نومولود ابتدائی مراحل میں ہی ہوتا ہے کہ تمام قبیلہ خبر کی ڈور سے بندھا کھنچا چلا آتا ہے۔ بوڑھی خواتین جنہیں محض ضرورتِ شعری کی خاطر زندہ سمجھا جاتا ہے، سب سے پہلے داد دینے پہنچتی ہیں۔ ان کی ژرف نگاہی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ نومولود کے غیر متعین چہرے کے سرسری مطالعہ پر ہی اس کے ناک نقشے کا سلسلہ خاندان کے مختلف افراد سے جوڑ دیتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ کوئی بوڑھی خاتون نوزائیدہ چہرے کو اہلور ایک کُل کے نہیں دیکھتی۔ بلکہ ایک اچھے نقاد کی طرح اس کا تنقیدی تجزیہ کرتی ہے۔ ناک اگر ماموں سے ملتی ہے تو آنکھ ماموں کے خسر کے کسی قریبی رشتہ دار سے، کان غالباً پردادا کی دین ہیں۔ ٹانگیں ہو بہو ایسی ہیں جیسی نومولود کے اس رشتہ دار کی جو ایک ناشدنی واقعہ میں تعاقب کرنے والے پولیس کانسٹیبل سے آگے نکل گیا تھا۔ سر اگر چھوٹا ہو تو ذہانت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ اگر بڑا ہو تو سرداری کی علامت۔

تمام خواتین بچے کو حصّوں میں بانٹ کر اتنا مکمل تجزیہ کرتی ہیں کہ اگر اس بچے کو نیشنل لیبارٹری میں بھیجا جاتا تو بھی شاید اتنا مکمل تجزیہ نہ ہو پاتا۔

اس کے بعد مشوروں کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ مشورے بچے سے ہوتے ہوئے زچہ تک پہنچتے اور پھر وہاں سے وسیع تر میدان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ماں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ فی الحال ایک دو ماہ مکمل آرام کرے۔ خانہ داری کا جملہ بوجھ اپنی ساس کو منتقل کر دے۔ اوپر کا دودھ بچے کو نہ پلائے، خود پی لے تو کوئی حرج نہیں۔ اپنی صحت کا خاص طور پر خیال رکھے۔

جو عقلمند خواتین ہوتی ہیں وہ بچے میں تو واجبی طور پر دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں البتہ منے کی ماں کو جاتے جاتے فہمائش کر جاتی ہیں کہ ایسے مبارک موقعوں پر خاندان کی ناک کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ یونہی اشارتاً وہ یہ ذکر بھی کرنا ضروری سمجھتی ہیں کہ بازار میں اب امپورٹڈ کپڑا آسانی مل جاتا ہے۔ اس کے بعد اُن خسروں کا نمبر آتا ہے جنہوں نے پوتی کی پیدائش پر بائیکاٹ کیا تھا۔

پوتا یوں تو دنیا کے ہر حصّے میں پایا جاتا ہے لیکن اس کے منصب اور اعزاز کو جغرافیہ بڑی حد تک متاثر کرتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مغرب میں پوتے کو وہ مقام حاصل نہیں جو مشرق میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشرق میں ہر خاندان ایک مکمل اکائی ہے جس کی ساخت اہرام مصر کی طرح ہے۔ یہ نظام زینہ بہ زینہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ اس لیے آپ اسے عمودی نظام بھی کہہ سکتے ہیں لیکن مغرب کا جمہوری مزاج افقی ساخت کا ہے۔ اس میں ہر فرد دوسرے کے برابر ہے۔ یقیناً ایسے نظام میں دادا پوتا کی تقسیم بے معنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں پوتے کی حیثیت نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ مغرب میں ہر مسئلے کی طرح

اس اہم مسئلے کو بھی معاشی تناظر میں دیکھا گیا ہے کیونکہ پوتی پوتے سے ارزاں پڑتی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت پر اتنا خرچ نہیں اٹھتا جتنا کہ ایک نالائق پوتے پر اور یوں بھی مغرب میں پوتی ایک خاص عمر کے بعد خود کفیل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے والدین اور ان کے والدین پوتی کی پیدائش پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ انگریزی ناولوں میں جہاں کہیں پوتی کا ذکر آتا ہے تو ناول نگار کی روانی دیدنی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ناول نگار پیدائش کے عمل میں باقاعدہ فریق کی حیثیت سے داخل ہو گیا ہو۔

پوتے کی اہمیت کے باوصف وہ ایک ایسا وجود ہے جسے تاریخ نے ابھی مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اگر تاریخ کا مطالعہ سنجیدگی سے کریں تو آپ کو احساس ہو گا کہ پیدائش آدم سے لے کر ۱۹۱۴ء تک پوتے کا کہیں وجود نہیں ملتا۔ آدم کے بھی صرف دو بیٹوں کا ذکر ہے۔ اس سے آگے تاریخ گونگی اور بہری ہے۔ اِن تاریخی شواہد کے پیش نظر آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پوتا بحیثیت پوتا تاریخ میں ابھی ابھی داخل ہوا ہے۔ اس کی وجہ معقول ہے۔ پُرانے زمانے میں وراثت (بلکہ حماقت بھی) بلاواسطہ باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی۔ پوتا تو صرف باپ کی بے وقت موت کی صورت میں سامنے آتا تھا۔ اسی لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔

مغلوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو بابر سے بہادر شاہ ظفر تک ایک اٹوٹ سلسلہ ملے گا۔ مورخ ہمیشہ اس کا یوں ذکر کرتا ہے "بابر کا بیٹا ہمایوں، ہمایوں کا بیٹا اکبر اور اکبر کا بیٹا نورالدین جہانگیر وغیرہ" حالانکہ یوں بھی لکھا جا سکتا تھا کہ اکبر ظہیر الدین کا پوتا تھا، لیکن اس طرح تاریخ کا سارا تسلسل مسنوخ بن جاتا۔ میں نے خود کئی بار چاہا کہ مغلوں کے شاہی شجرہ نسب میں پوتے کو کہیں ایڈجسٹ کر سکوں لیکن ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مغل بیالوجی میں انا پسندی اور خود پرستی کا عنصر اتنا غالب تھا کہ باپ جب بیٹے پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا تو وہ بیٹے کے بیٹے پر (جس سے اس کا دور کا تعلق تھا) کیسے اعتماد کر سکتا تھا؟ اسی وجہ سے مغل تاریخ کے طویل سِلسلے میں پوتا بطور پوتے کے کہیں بھی نہیں ابھرا۔ شاید دوسرے خانوادوں میں بھی یہی حال ہو۔

پوتا، جیسے میں نے عرض کیا تاریخ کے ایوان میں حال ہی میں داخل ہوا ہے۔ خاندان میں اگر کوئی رشتہ توڑنا یا جوڑنا ہوتا تو بات باپ بیٹے تک محدود رہتی۔ پوتا ایسے موقعوں پر صیغہ واحد غائب کی حیثیت رکھتا تھا۔ البتہ اگر کسی شرارت یا معقول مطالبہ پر پوتے کو سزا دینا مطلوب ہوتی تو باپ بیٹا ایک مشترکہ محاذ بنا لیتے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں اسکول سے واپس آتا تو میرے والد مرحوم اس مفروضے پر کہ شاید میں آج بھی اسکول نہیں گیا' مجھے ضرور تھپڑ لگاتے۔ یہ تھپڑ عام طور پر بے ساختہ ہوتا۔ میں دادا مرحوم کی گود میں پناہ لیتا۔ وہ مجھے اس سے شدید تھپڑ لگا کر واپس کر دیتے۔ ٹینس کا یہ کھیل کچھ عرصہ جاری رہتا۔ ایسے لگتا تھا کہ باپ بیٹا پوتے کو نہیں بلکہ کسی اجنبی کو مار رہے ہوں۔

میں اس سراسر ظلم کو اس لیے برداشت کرتا کہ مجھے بھی اس کھیل سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور بہر حال خطائے بزرگاں ریاضی کے پیریڈ سے تو بہتر تھی لیکن بیسویں صدی میں صورتحال ایک حد تک بدل گئی خصوصاً دوسری جنگِ عظیم کے بعد۔ جنگ میں جہاں بہت سا نقصان ہوا وہاں ایک فائدہ بھی ہوا کہ پہلی بار مغرب میں پوتا نمایاں ہو گیا۔

جنگ میں عام طور پر وہی لوگ شریک ہوتے ہیں جو شادی شدہ ہوں۔ اس لیے بہت چھوٹی نسل یا بڑی نسل محاذِ جنگ سے دور ہی رہتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ حادثہ رونما ہوا کہ باپ یا تو مارا گیا یا غائب ہو گیا۔ اب پیچھے دادا اور پوتا رہ گئے۔ یوں انسانی معاشروں میں پہلی بار پوتا نمایاں ہوا اور اس کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔

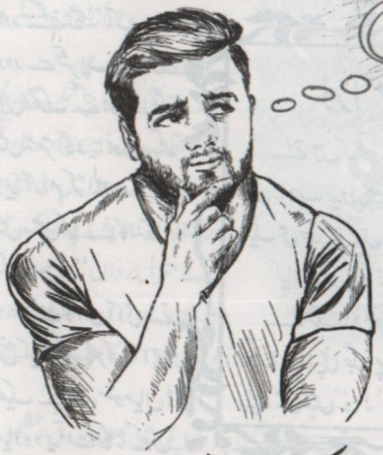

دوست! اتنا مت سوچ

کمال احمد

بے مقصد سوچوں میں الجھ کر انسان کہیں کا نہیں رہتا

ایک شخص کو بہت زیادہ سوچنے کی عادت تھی۔ وہ ہر معاملے میں خاصے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اس کے فیصلے میں اگر سوچ کے مزید پہلو نکلتے تو وہ ان پر مزید سوچنے بیٹھ جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ اس کے اکثر کام تاخیر کا شکار ہو جاتے اور نقصان اٹھانا پڑتا لیکن وہ آدمی اس بات کو چنداں اہمیت نہ دیتا۔

گھر والے اسے کھانا دیتے تو کسی بات پر غور و فکر کرتے ہوئے وہ کھانا ٹھنڈا کر دیتا۔ کبھی چائے اس کے آگے رکھی رکھی ٹھنڈی ہو جاتی۔ اس کے دوست احباب اکثر اسے سمجھاتے کہ اتنا نہ سوچا کرو لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس کا ایک پرانا دوست بہت دور کے شہر سے اس سے ملنے آیا اور اُسے کو کہنے لگا کہ میں اپنے شہر سے ایک بڑے کاروباری آدمی کا تمہارے لیے پیغام لے کر آیا ہوں۔ وہ تم سے کوئی کام کروانا چاہتا ہے اور بہت بڑا آرڈر ہے۔ تم سوچ کر جلدی فیصلہ کرنا۔

تمہارے شہر آ رہا ہے اور تم سے بھی ملے گا۔ تم اسے اچھا کھانا وغیرہ کھلانا، ڈھنگ سے پیش آنا اور اس کے ساتھ معاملات طے کر لینا۔" آدمی نے ہامی بھر لی۔

شام کو جب دوست رخصت ہونے لگا تو اس آدمی سے کہنے لگا "دیکھو تم میرے بہت اچھے دوست ہو لیکن تم اپنی بہت زیادہ سوچ و بچار کی عادت کی وجہ سے کام کاج میں سستی کر دیتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پھر سے اچھے بھلے ہو جاؤ اور کاروباری دنیا میں تمہارا نام ہو۔ اچھا سنو! کل کے لیے میری

آدمی یہ سن کر بہت خوش ہوا کیوں کہ وہ کافی عرصے سے بیروزگار تھا اور اُسے کام کی تلاش تھی۔ اس نے کہا "دوست تم فکر نہ کرو، میں تو پہلے ہی کام کی تلاش میں ہوں۔ تم اس آدمی سے مجھے جلد ملا دو۔"

دوست نے کہا "کل وہ آدمی

نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں لیکن اس کاروباری آدمی کے ساتھ معاملہ طے کرتے ہوئے مہربانی کرکے زیادہ سوچوں میں نہ پڑ جانا۔ سیانے ٹھیک کہہ گئے ہیں ''سوچی پیاتے بندہ گیا۔'' (زیادہ سوچ میں پڑ گئے تو کام کرنے سے ہی رہ جاؤ گے) یہ کہہ کر دوست رخصت ہوگیا۔

اگلے روز جس کاروباری آدمی کا ذکر دوست نے کیا تھا، عین دوپہر کے وقت اُس سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ سوچ و بچار والے آدمی نے اسے اچھے طریقے سے بٹھایا، پانی پلایا اور کہنے لگا ''آپ بہت دور سے تشریف لائے ہیں، تھک گئے ہوں گے، میں بستر لگا دیتا ہوں، کچھ دیر آرام کر لیں، اتنے میں، میں کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔''

پہلے تو اس آدمی نے منع کیا لیکن پھر کہا ''اچھا ٹھیک ہے لیکن سنو میاں! زیادہ دیر مت لگانا کیوں کہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں نے تم سے معاملہ بھی طے کرنا ہے اور پھر واپس بھی جانا ہے۔ کہیں میری بس نہ نکل جائے۔''

یہ ان دنوں کی بات ہے جن دنوں سواریاں بہت کم تھیں اور ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے سورج ڈوبنے کے بعد کوئی سواری دستیاب نہیں ہوتی تھی۔

سوچ و بچار کرنے والا آدمی اس مہمان کو چارپائی پہ آرام کرتا چھوڑ کر کچھ کھانے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ بستی سے باہر بازار لگتا تھا، وہ بازار میں جا کر دکانوں کے باہر کھڑا ہو کے سوچنے لگا کہ اس کاروباری مہمان کے کھانے کو کیا لیا جائے۔

ذرا غور کریں!

کہتے ہیں کہ عورت و مرد گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جب یہ دو پہیے ہیں تو آپ ان دونوں کو ایک ہی جگہ پر کیوں لانا چاہتے ہیں؟ کیا اس طرح گاڑی چل سکے گی؟

بے شک! دونوں کی اہمیت برابر ہے، مگر اپنی اپنی جگہ پر۔ ایک دوسرے کی جگہ لینے میں نہیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس مہمان سے مجھے کتنا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر زیادہ فائدہ ہونا ہے تو مجھے اس کو اچھا کھلانا پلانا چاہیے اور اگر اس سے کم فائدے کی توقع ہے تو کھانا کھلانے میں مجھے بھی زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی باتیں سوچتے سوچتے اس نے کافی دیر لگا دی حتیٰ کہ شام ہونے لگی۔

قریب سے گزرتے راہ گیروں میں سے ایک نے رک کر اس سے پوچھا ''بھائی صاحب! آپ اتنی دیر سے کیا سوچ رہے ہیں؟ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ شاید میں کوئی مدد کر سکوں آپ کی؟''

یہ سن کر وہ آدمی چونک گیا اور جلدی میں کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر گھر کو چلا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو مہمان کا بستر خالی تھا۔ اس نے گھر والوں سے پوچھا ''بھئی! یہ ہمارے مہمان کہاں چلے گئے، کسی کو کچھ خبر ہے کیا؟'' گھر والوں نے بتایا کہ مہمان تو اس کا بہت انتظار کرتا رہا۔ آخر یہ کہہ کر رخصت لے لی ''مجھے دیر ہو رہی ہے، دوسرے شہر گھر پہنچنا ہے، کہیں سواری نہ نکل جائے۔ صاحب خانہ سے کہنا کہ پھر کبھی فرصت میں آ کر بات کر لوں گا۔''

یہ سن کر سوچ و بچار کرنے والے آدمی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ تب اس کے ذہن میں اپنے دوست کا کہا ہوا فقرہ گونجنے لگا ''سوچی پیاتے بندہ گیا''۔ واقعی وہ بازار میں کھڑا سوچتا ہی رہ گیا اور بندہ (مہمان) چلا گیا۔

سچ کہا ہے داناؤں نے کہ سوچ بچار اچھی چیز ہے لیکن بعض معاملات میں ضرورت سے زیادہ سوچنا خود اپنا نقصان کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اندازہ کر لینا چاہیے کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت! ●●●

معذور مت کہو

عبدالطیف ابوشامل

کم ہمت افراد کے لیے روشنی کا مینار بن جانے والے پیکرِ ہمت کی ناقابلِ فراموش جگ بیتی

اس کی کشادہ پیشانی پر عزم و یقیں، ہمت و استقلال، عظمت و خودداری، جرأت اور بہادری کے قطرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ پامردی سے لوگوں کے ہجوم، گاڑیوں کے اژدحام اور کنکریٹ کے بے مہر جنگل کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ مسلسل گردش میں تھے۔ ایک ہاتھ سے ہینڈل پکڑے اور دوسرے سے پیڈل گھماتا وہ سیاہ سڑکوں پر مجھے کبھی کبھار نظر آ جاتا۔ اس میں کوئی بات تو تھی جو مجھے اس سے ہمکلام ہونے پر مجبور کرتی، مگر ہم سب کا روگ ''فرصتِ زندگی بہت کم ہے'' آڑے آتا، منہ چڑاتا اور میں اس کے قریب سے گزر جاتا۔ میں کب تک اسے نظر انداز کر سکتا تھا، آخر ایک دن وہ جیت گیا اور میں اس کے سامنے تھا۔

میں اس کو ملنے سے پہلے معذور ہی سمجھتا رہا لیکن اب اسے ''معذور'' کہتے ہوئے شرم آتی اور ندامت ہوتی ہے۔ وہ تو ہم بھلے چنگے، مایوس اور ہر وقت حالات کا رونا رونے والے کم ہمت لوگوں کے لیے روشنی کا مینار، ہمت و جرأت کا پیکر اور عظمتوں کا شاہکار ہے۔

وہ راستے کی اعصاب شکن رکاوٹیں پائے حقارت سے روندتا، تلخ و زہریلے فقرے ہوا میں اڑاتا، سرد اور سفاک رویوں پر خاک ڈالتا سوئے منزل رواں ہے جو اس سے دور نہیں ہے۔ اس راہ میں ہمدرد، غم خوار بیوی اس کا سب سے بڑا ''مان'' ہے۔

آپ نارتھ ناظم آباد، کراچی میں مسجد فاروق اعظم کے عقب میں واقع شناختی کارڈ آفس جائیں تو وہ آپ کو اپنی سائیکل گاڑی پر بیٹھا مل جائے گا۔ ایمانداری، دیانت اور شرافت اس کا ہتھیار نہیں عادات ہیں۔ وہ انہیں کشادہ دلی سے بانٹتا اور مسکراتا رہتا ہے۔ اس کی ٹانگیں ناکارہ ہوگئی ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی ساکت ہو چکی اور گردن کے مہروں نے کام چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے وہ صرف سامنے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کا عزم جواں اور دل زندہ ہے۔ اس نے اپنی معذوری کو پیر کی زنجیر نہیں بننے دیا اور ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کو ہمہ وقت تیار ہے۔ یہ ''واجد علی'' ہیں۔

''کچھ اپنے بارے میں بتائیے واجد بھائی۔'' ہم نے

بسم اللہ کر کے بات شروع کی۔

یار اتنی لمبی داستان ہے، اتنا وقت ہوگا تمہارے پاس سننے کے لیے؟ اور پھر ہجوم سے دور وہ اپنی گاڑی اور میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ آپ سننا چاہیں گے، آیئے۔ میرا خاندان بھارت سے ہجرت کر کے یہاں پہنچا۔ میں تحصیل میلسی ضلع وہاڑی کے گاؤں جلہ جین میں ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوا۔ میرے والد تقسیم سے قبل فوج میں تھے۔ یہاں پہنچ کر کچھ عمر کا تقاضا تھا کچھ ان کو سنائی کم دیتا تھا' اس لیے فوج سے تو قصہ ختم ہو گیا اور میرے والد کو کچھ نہ ملا۔ جب معاشی مسائل نے سر اٹھایا تو ہم کراچی پہنچ گئے۔ یہاں ہماری رہائش کیماڑی میں تھی۔ میرے والد نے چپراسی کی ملازمت اختیار کی۔ وہ انتہائی محنتی انسان تھے۔ صبح اٹھ کر ڈبل روٹی بیچتے، پھر دفتر جاتے اور شام کو کلیجی بیچا کرتے۔ یوں زندگی کی گاڑی چلتی۔ ہم پانچ بھائی اور ایک بہن ہیں اور سب شادی شدہ۔ میرے ساتھ پھر ایک حادثہ ہو گیا لیکن قسمت کو یہی منظور تھا۔

☆ آپ حادثے کی تفصیل بتائیں گے؟

* میں شاید دوسری جماعت میں تھا۔ اس وقت میری عمر نو یا دس سال ہوگی۔ کیماڑی میں حاتم علوی اسکول کا طالب علم تھا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کی تعمیر ہو رہی تھی اور ہم بچے وہاں کھیلنے جایا کرتے۔ نیچے ریت ہوتی اور ہم کبھی ایک منزل سے اور کبھی دوسری سے چھلانگ لگایا کرتے۔ ایک دن میں نے چھلانگ لگائی تو میرے گھٹنے میں معمولی سی رگڑ لگ گئی۔ اسے میں نے نظر انداز کر دیا۔ چار یا پانچ دن بعد میں اسکول سے گھر پہنچا تو چلنے کے قابل نہیں تھا۔ گھر والوں نے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم یہ کیا ہو گیا ہے؟ میرے والد کا میڈیکل مفت تھا اور انکل سریا ہسپتال ہمارے پینل پر تھا۔ میرے والد کی تنخواہ اس وقت دو سو روپے تھی۔ دفتر والوں نے انکل سریا کو ریفر نہیں کیا اور ہم خود ہسپتال پہنچ گئے۔ انہوں نے سرنج سے مواد نکال لیا اور ہم سے پچاس روپے لے لیے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم سے ایک لاکھ روپے لے لیے گئے ہوں۔

پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ ایک ہفتے کے لیے مجھے داخل کیا جائے۔ میرے والد کے افسر نے اس موقع پر بھی ہماری نہ سنی اور یہ کہا کہ تمہارے پاس کھانے کے پیسے نہیں اور خواب دیکھتے ہو بڑے بڑے حالانکہ پیسے تو دفتر نے دینے تھے۔ اگر اس وقت وہ افسر مان جاتا تو آج میں معذور نہ ہوتا۔ ہم نے اپنی طرف سے سب علاج کروائے، جڑی بوٹیوں سے لے کر ایکوپنکچر، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک' مگر بات تو بگڑ گئی تھی۔ اگر اس وقت ڈاکٹر میری ٹانگ کاٹ دیتا تو شاید میں آج بیساکھی کے سہارے چل سکتا۔ پھر یہ زہر سارے جسم میں پھیل گیا اور میری دونوں ٹانگیں ناکارہ ہو گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی بھی کام کی نہ رہی، گردن اکڑ گئی اور میں زندہ لاش بن گیا۔

میرا دل زندہ تھا اور سانس آ جا رہا تھا، باقی تو کچھ بھی نہیں بچا۔ مجھے گھر کے ایک کونے میں چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ زندگی کے شام و سحر گزرنے لگے۔ میں چارپائی پر ہی جوان ہو گیا۔ دس سال تک میں اس کونے میں پڑا رہا۔ کبھی کبھار کوئی دوست آ جاتا۔ کوئی تفریح، زندگی میں کوئی خوشی باقی نہیں رہی۔ عید آتی تو مجھے صبح کے وقت گلی میں چارپائی پر ڈال دیا جاتا۔ شام تک میں لوگوں کو تکتا رہتا۔ یہی ایک دن میں باہر گزارتا۔ مغرب کے بعد مجھے پھر اگلی عید تک اس کونے کی نذر کر دیا جاتا۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک پنجابی خاندان رہتا تھا۔ وہ لوگ آ کر مجھ سے گپ شپ کرتے۔ میرا کام بھی کر دیا کرتے۔ ان کی ایک بیٹی تھی وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس سے انسیت ہو گئی۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اس کا شوہر نااہل تھا، کام نہیں کرتا تھا۔ انہوں نے اس کی مالی امداد بھی کی مگر ہڈ حرام تو ہڈ حرام ہی رہتا ہے۔ اس کے دو بچے تھے اور خرچہ وہ دیتا نہیں تھا۔ پھر وہ عمان چلا گیا۔ وہ

لڑکی جب زیادہ پریشان ہو گئی تو اس نے خلع لے لی۔ یوں وہ دوبارہ ہمارے سامنے والے گھر میں والدین کے ساتھ رہنے لگی۔ ہمارے گھر اس کا آنا جانا تھا، میرا بہت خیال رکھتی۔

پھر میں نے یہ سائیکل گاڑی لے لی۔ پہلے تو میں اس پر نہ بیٹھتا تھا کیونکہ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ گاڑی تو بھکاری کی ہوتی ہے۔ آخر دوستوں نے حوصلہ دیا اور میں گاڑی پر بیٹھنے پر تیار ہوا۔ دس سال بعد میں نے اپنے علاقے کا بازار دیکھا تو یوں لگا جیسے میں لندن میں گھوم رہا ہوں۔ میدان پلازوں میں تبدیل ہو گئے تھے، سڑکیں گاڑیوں سے بھر گئی تھیں۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ اب میں اپنی زندگی کو بنا کر دم لوں گا۔ سو میں نے لیاقت آباد میں ایک فیکٹری میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی ایم اے جناح روڈ پر آئیڈل نائٹ اسکول سے مڈل پاس کیا۔ مجھے شوق تھا، لکھنا پڑھنا آ گیا اور پھر میں نے شناختی کارڈ آفس کے باہر فارم بھرنا شروع کیے۔ یوں میں متحرک ہوا۔

۱۹۹۰ء میں، میں نے اس لڑکی سے بات کی اور وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ گھر والوں نے شادی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا تو مجبوراً میں نے کورٹ میرج کر لی۔ اب میرے دو بلکہ یوں کہیں چار بچے ہیں۔ میری بیوی نے میری زندگی بدل ڈالی، مجھے زندگی کا سلیقہ سکھایا، حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا۔ غرض میری تمام کامیابی کا سہرا اس کے سر ہے، وہی میری سب کچھ ہے۔

☆ دس سال آپ نے اس کونے میں گزار دیے۔ کیا کرتے تھے آپ؟ وقت کیسے گزرتا تھا؟

* یار کیا بتاؤں، خواب تھے اور اشعار۔ کبھی کبھی مایوسی تھی اور اداسی۔ کوئی ہنس کے بولتا تو یوں لگتا جیسے بہار آ گئی ہو۔ جب نظر انداز کیا جاتا تو خود سے بھی نفرت ہو جاتی۔ زندگی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہی تھی۔ آپ کر بھی کیا سکتے ہیں سوائے خواب دیکھنے کے۔

☆ دس سال تک آپ گھر پر ہی رہے، گھر والوں کا کیسا رویہ تھا؟

* یار کیا رویہ ہونا تھا، ظاہر ہے اپنی اپنی ذمہ داریاں تھیں سب کی، سب اپنے اپنے پسینے میں ڈوبے رہتے۔ والد اور والدہ میرا بہت خیال رکھتے' وہ مجھے ہر ماہ بیس روپے دیتے جن سے میں پان کھایا کرتا تھا۔ بڑے بھائی عید پر مجھے دس روپے دیا کرتے اور حوصلہ تو خیر سبھی دیتے تھے۔

☆ شادی کا خیال کیسے آ گیا؟

* آپ زندگی کی جنگ جیتنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک ایسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، جس پر آپ مکمل اعتماد کر سکیں۔ اسے ہر بات بتا سکیں۔ جس لڑکی سے میں نے شادی کی، یہ تو اس کا کمال ہے کہ اس نے مجھ جیسے فرد کو اپنایا۔

☆ اسے لوگوں نے کچھ نہیں کہا کہ کیسے فرد سے شادی کر رہی ہو؟

* کیوں نہیں کہا۔ سب نے اسے کہا کہ کیا بلا اپنے گلے میں ڈال رہی ہو، خود میرے والد میری شادی کے خلاف تھے کہ میں خود کو نہیں رکھ سکتا' شادی کر کے کیا کروں گا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی اور میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

☆ آپ کے روزمرہ کے کام کون کرتا ہے؟

* بیوی ہی میرے تمام کام کرتی ہے۔ میں تو نہ اٹھ سکتا ہوں، نہ بیٹھ، نہ باتھ روم جا سکتا ہوں، نہ نہا سکتا ہوں۔ سب کام میری بیوی کرتی ہے۔ اس نے کبھی مجھے احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ میں ناکارہ اور معذور ہوں۔

☆ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے آپ کی بیوی کو متاثر کیا؟

* اسی سے پوچھیے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں خود کبھی کبھی یہ بات سوچتا ہوں۔

☆ اب کیسے گزر رہی ہے زندگی؟

* بہت اچھی، میں بہت خوش ہوں۔ کبھی میرے گھر آنا

اور خود دیکھنا' بہار ہی بہار ہے، بچے ہیں، بیوی ہے اور میں تو بہت خوش نصیب آدمی ہوں۔ اگر میں تندرست ہوتا تو شاید ایسی بیوی نہ ملتی۔

☆ عام زندگی میں آپ دونوں کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

* یہ بات مت پوچھو، عجیب وغریب لوگ ہیں ہمارے۔ ہم دونوں جا رہے ہوں تو لوگ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتے ہیں جیسے ہم عجوبہ ہوں۔ کچھ ایسے دیکھتے ہیں جیسے ہمیں جینے کا حق نہیں۔ کبھی کوئی بھیک دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے روپے بھی کتنے سفاک ہیں۔ جو مانگتا ہے اسے نہیں دیتے اور جو نہیں مانگتا اسے بھکاری سمجھتے ہیں۔

☆ جب آپ کو کوئی بھکاری سمجھتا ہے تو آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

* مجھے اتنا غصہ آتا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے میں اسے کھری کھری سناؤں۔ مجھے ان پر بہت غصہ آتا ہے جو مجھ پر ترس کھائیں۔ میں لاکھوں تندرست انسانوں سے اچھا ہوں۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں ایک دن میں جا رہا تھا۔ ایک کار آ کر رکی اور ایک شخص نے ایک تھیلا مجھے دینے کی کوشش کی۔ میں نے انکار کر دیا تو اس نے کہا: رکھ لو کھانا ہے اس میں۔ میں نے کہا ''میں بھکاری نہیں ہوں۔'' اسی طرح ایک مرتبہ ایک کار والے صاحب نے سو روپے نکال کر مجھے دینے کی کوشش کی۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں جا رہا ہوتا ہوں تو کوئی ایک روپیا دیتا ہے کوئی دو روپے اور مجھے سب کو واپس کرنا ہوتے ہیں کہ بھائی میں بھکاری نہیں۔ وہ لوگ میرا وقت ضائع کرتے ہیں۔ میری انا مجروح کرتے اور میرا حوصلہ توڑتے ہیں۔

☆ دن کا آغاز کس طرح ہوتا ہے؟

* ہم صبح سات بجے بیدار ہو جاتے ہیں، بچے اسکول کی تیاری کرتے ہیں، ناشتا ہوتا ہے اور پھر میری بیوی مجھے تیار کرتی ہے۔ میں صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتا ہوں۔ اور گلی دس نمبر سے نارتھ ناظم آباد تک آتا ہوں۔ ایک بہت اچھا شخص مجھے راستے میں روز ملتا ہے۔ وہ موٹر سائیکل پر ہوتا ہے۔ میری گاڑی پاؤں سے دھکیل کر یہاں تک چھوڑ جاتا ہے۔ واپسی پر میں ایک بجے یہاں سے نکلتا ہوں۔ دو بجے میری بیوی گھر سے نکلتی ہے اور وہ مجھے فائر بریگیڈ میٹرو سینما پر ملتی ہے کیونکہ وہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ اس کی مدد کے بغیر میں گھر نہیں پہنچ سکتا۔ راستے میں سامان خورونوش لیتے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے کہیں جانا ہو تو اس گاڑی میں بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر نہ جانا ہو تو پلنگ پر لیٹا رہتا ہوں۔ یوں رات ہوتی ہے اور دوسرے دن پھر وہی معمول۔

☆ اہل محلہ کا کیا کردار ہے؟

* بہت اچھا، میں خود اپنی گاڑی پر نہیں بیٹھ سکتا، میری بیوی اکیلی مجھے اٹھا نہیں سکتی اس لیے روزانہ محلے کے کسی فرد کو کہہ دیتے ہیں۔ ٹانگیں میری بیوی پکڑتی ہے اور دھڑ محلے کا کوئی فرد یوں مجھے گاڑی پر بٹھایا جاتا ہے۔ ان کی یہ نیکی کیا کم ہے؟

☆ فارغ اوقات یا چھٹی کے دن کیا معمولات ہیں؟

* فارغ وقت میں لوڈو یا تاش کھیل لیتا ہوں۔ ٹی وی دیکھتا ہوں۔ چھٹی کا دن میرا نہانے کا ہوتا ہے۔ یہ بہت مشقت طلب کام ہے۔ میری بیوی بہت محنتی ہے۔ سارا کام اسے ہی کرنا ہوتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہے جو کام خود بچے بھی کر سکتے ہیں، میں وہ بھی نہیں کر سکتا۔

☆ بچے کیا کہتے ہیں؟ کبھی سیر وتفریح کا تقاضا نہیں کرتے؟

* بچے اب اس زندگی کے عادی ہو چکے۔ رہی سیر وتفریح، تو وہ تقاضا کرتے ہیں اور ہم بھی کبھی کبھی چلے جاتے ہیں۔ عید کے تیسرے دن ہم ایک سوزوکی کرایے پر

لیتے ہیں۔ مجھے اس میں لٹا دیا جاتا ہے اور بیوی بچے بیٹھ جاتے ہیں۔ محلے کے دو تین لڑکے بھی لینے پڑتے ہیں۔ کبھی ہاکس بے، کبھی کلفٹن۔ اس طرح تفریح ہوتی ہے۔ ابھی میرے بچوں نے تقاضا کیا تھا کہ الہ دین پارک چلو، لیکن اس کا کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ ممکن نہیں ہے۔

☆ گھر میں کیا ضروریات زندگی کی اشیاء موجود ہیں؟

* جی ہاں اللہ کا کرم ہے۔ میرے پاس والد کا دیا ہوا مکان ہے۔ اس کا آدھا حصہ میں نے کرایے پر دے دیا۔ بی سی ڈال کر ٹی وی خریدا ہے، ایک چھوٹا ریفریجریٹر بھی ہے۔

☆ آپ کو اپنی سائیکل گاڑی پر اتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ آپ موٹر سائیکل گاڑی کیوں نہیں لے لیتے؟

* میں نے ہنڈا ففٹی کی گاڑی بنوائی تھی۔ بہت محنت کی تھی جب جا کر وہ بنی۔ ایک دن وہ خراب ہو گئی۔ میں مکینک کے پاس گیا۔ اس نے اسے چیک کیا، اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو اس میں آگ لگ گئی۔ آناً فاناً وہ جل گئی۔ نئی خریدنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ مالک ہے، ایسا تو زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔

☆ لوگ آپ کو پیسے دینے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کو غصہ آتا ہے لیکن اگر کبھی کوئی بھکاری آپ سے پیسے مانگ لے تب کیسا لگتا ہے؟

* یہ بہت زبردست بات کی ہے آپ نے۔ میں یہاں بیٹھا رہتا ہوں، یقین کیجیے دن بھر میں پانچ چھ بھکاری آ کر مجھ سے بھیک مانگتے ہیں۔ مجھے ان پر ہنسی آتی ہے کہ کیسے لوگ ہیں۔ چنگے بھلے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ یہ ایک پیشہ بن گیا ہے جیسے کوئی ڈاکٹر ہے اور کوئی بھکاری۔

☆ آپ سے ایک ذاتی سا سوال۔ آپ کی بیوی پنجابی ہے اور آپ مہاجر، کبھی کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟

* اچھا کیا آپ نے یہ سوال پوچھا۔ یہ سب بکواس باتیں ہیں۔ وہ پٹھان ہے، وہ مہاجر ہے، سندھی ہے، بلوچی ہے، ہمارے اتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ ان بڑے لوگوں نے ہمیں آپس میں لڑا کر اپنا الو سیدھا کیا اور سب سے زیادہ نقصان ہمارا ہی ہوا۔ اب یہ دھند چھٹ رہی ہے۔ اللہ نے دلوں کو جوڑ دیا ہے۔ پھر بہار آئے گی، سب بھائی بھائی بن جائیں گے۔ انسانیت کسی ایک کی نہیں سب کی مشترکہ میراث ہے۔

☆ بڑے لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

* یہی سیاست دان اور کون۔ سب مفاد پرست، اپنا الو سیدھا کرنے والے۔ مجھے تو کوئی صحیح نہیں لگتا۔

☆ کچھ لوگ آپ کی مدد کرتے ہیں۔ کچھ تنگ بھی کرتے ہیں کیا؟

* کیوں نہیں۔

چرچا جو ہوگا شہر میں میرے خلوص کا
مجھ پر کسی ستم سے تہمت بھی آئے گی

☆ اب آگے کیا پروگرام ہیں؟

* اب گاڑی لے کر اپنی بیوی کو ڈرائیونگ سکھاؤں گا۔ کچھ زندگی آسان ہو جائے گی لیکن یہ ابھی خواب ہے۔ ابھی تو میرے پاس گاڑی کے وائپر خریدنے کے بھی پیسے نہیں۔

☆ بچوں کے متعلق کیا سوچا ہے؟

* میرے سارے بچے زیر تعلیم ہیں۔ سب سے چھوٹی بچی کو میں نے اقراء میں داخل کروایا ہے۔ ارادہ ہے اسے حفظ کرواؤں۔

☆ ہمارے وہ لوگ جو مایوس ہیں، ان کے لیے کیا کہیں گے؟

* ان کے لیے اتنا کچھ کہہ چکا ہوں۔ میں نے ہمت ہاری ہوتی تو آج آپ مجھ سے یہ سب نہ پوچھ رہے ہوتے۔ محنت کیجیے۔ ٹھیک ہے کچھ مجبوریاں بھی ہوتی ہیں لیکن انہیں گلے کا ہار مت بنائیے۔ آہستہ سے چلنا شروع کیجیے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ آپ زندگی کی دوڑ میں بھاگ رہے ہیں۔

اِک چراغ اور بُجھا

مظفر بخاری

معاشرے کے ایک نرالے کردار کا شوخ و شنگ خاکہ

حکیم استاد عزیز الدین عزیز بڈیانوی پرسوں انتقال کر گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اُن سے ہماری آخری ملاقات جنوری میں ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم نے اُن کی طوالت عمر کی دعا کی۔ کہنے لگے رہنے دو:

زندگی ہو گئی طویل بہت
دہر میں ہو چکے ذلیل بہت

حکیم صاحب درست فرما رہے تھے۔ انھوں نے واقعی اپنی بیگمات کے ہاتھوں بڑی تذلیل برداشت کی تھی۔ بالخصوص اُن کی پانچویں بیوی نے تو انھیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تھا جس کے غصے اور بدمزاجی کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ اُس سے شادی کے چند روز بعد حکیم صاحب نے یہ شعر کہا تھا:

نئی بیگم کے بارے میں سبھی ہمسایے کہتے ہیں
یہ اتنی خوفناک عورت کہاں سے ڈھونڈ لی تم نے!

حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں عطا کر رکھی تھیں۔ شعر گوئی اور حکمت انھیں ورثے میں ملی تھیں اور انھوں نے ہومیوپیتھی کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر اور ڈاکٹری دونوں کے خلاف تھے۔ اس ضمن میں اُن کا ایک شعر ہے:

ہومیوپیتھی بھی اک نعمت ہے انساں کے لیے
طب یونانی کی لیکن بات ہی کچھ اور ہے

حکیم صاحب کے مطب سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ڈاکٹر صاحب پریکٹس کرتے تھے۔ دونوں کے مشترکہ مریض انھیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ جب تک ڈاکٹر صاحب زندہ رہے، محاذ آرائی جاری رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے زیرِ علاج ایک مریض کا انتقال ہوا تو حکیم صاحب نے یہ شعر مطب کے سائن بورڈ پر لکھوا لیا:

ڈاکٹر حضرات سے اللہ بچائے دوستو!
ڈاکٹر حضرات بندے مارنے میں شیر ہیں

ڈاکٹر صاحب کو پتا چلا تو انھوں نے طیش میں آ کر اپنے کلینک کی پیشانی ان الفاظ سے سجا لی:

جاہل حکیموں کے ہاتھوں نہ مریں..... ہمیں موقع دیں!

حکیم صاحب کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی کے بارے میں ہم آپ کو کیا بتائیں..... ایک روز انھیں اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب کی حالت انتہائی نازک ہو گئی ہے۔ وہ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے فوراً اُن کے گھر پہنچ گئے اور گھنٹوں ان کے فوت ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ بالآخر شام کو مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ اُدھر ڈاکٹر صاحب بھی ایک عظیم انسان تھے۔ اکثر کہا کرتے:

''حکیم صاحب اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کی تجہیز و تدفین میں شرکت کی سعادت عطا فرمائے!''

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ حکیم صاحب سے کئی ماہ پہلے ہی راہی ملکِ عدم ہو گئے۔ ان کی وفات کی خبر سن کر حکیم صاحب کو شدید صدمہ پہنچا۔ اوسان قدرے بحال ہوئے تو فرمایا:

''اللہ بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والے میں!''

پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے:

''حق مغفرت کرے، عجب بدذات مرد تھا!''

حکیم صاحب پکے مسلمان تھے۔ شریعت کی حدود سے تجاوز کرنا ان کے لیے گناہ کبیرہ تھا۔ زندگی بھر شادیاں کیں لیکن بیویوں کی تعداد کبھی چار سے بڑھنے نہ دی۔ ویسے احتیاطاً ایک آدھ خاتون کو سٹینڈ بائی بھی رکھتے تھے۔ انتقال کے وقت صرف ایک بیوی باقی تھی۔ اُس سے بھی نالاں تھے۔ فرماتے ہیں:

نہ دیکھا ہوگا جہنم کے باسیوں نے کبھی
وہ اِک عذاب کہ اُس شخص کے نباہ میں ہے

ایک جگہ یوں نصیحت فرماتے ہیں:

رائی کو رائی ہی رہنے دو، ہمالہ نہ کرو
چھوٹی سی بات کو اس طرح اُچھالا نہ کرو

حکیم صاحب نے آخری شادی پچھتر برس کی عمر میں کی۔ بیوی کی عمر بھی کچھ کم نہ تھی۔ تیس سال سے تو زیادہ ہی ہوگی۔ اس عزیزہ کے اندازِ گفتگو کے بارے میں فرما گئے کہ:

تیری باتوں میں جو منطق کا نشاں ڈھونڈتے ہیں
کیسے نادان ہیں، کیا چیز کہاں ڈھونڈتے ہیں

مزید ارشاد ہوا:

بجھی ہوئی ہے زباں تیری زہر کے اندر
تجھے خدا نے بنایا ہے قہر کے اندر

حکیم صاحب کے ہاں کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا تو وہ اس خوشی میں محفلِ قوالی کا اہتمام کرتے لیکن ان کی آخری بیوی کے ہاں آخری بچہ پیدا ہوا تو وہ پریشان بلکہ پشیمان ہو گئے۔ بچے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بلائے ناگہانی نازل ہو گئی ہو۔ کبھی سر پیٹتے اور کبھی سینے پر دو ہتڑ مارتے اور کہتے:

''بہت دیر سے آئے ہو صاحبزادے، بہت دیر سے آئے ہو..... میرے جانے کے بعد تمھارا کیا بنے گا!''

ان کی پہلی بیوی کے پہلے بیٹے نے جس کی عمر تقریباً پچاس سال تھی، آگے بڑھ کر کہا:

''ابا جی! جیسے آپ کی پہلی اولاد خود رو پودوں کی طرح پلی بڑھی ہے یہ بھی پل بڑھ جائے گا۔''

اس بیٹے کی پیدائش پر حکیم صاحب نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو لطف قافیہ کی ایسی عمدہ مثال سامنے آئی جو آپ کو پورے اردو ادب سے نہیں ملے گی:

سنو حکیم کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا
غریب سوچ میں گم ہے لیٹا ہوا

ایسی ایک مثال اُن کے درج ذیل شعر میں بھی موجود ہے جو انھوں نے اپنی تیسری یا غالباً چوتھی بیگم کے بارے میں کہا تھا:

اے کاش وہ صدا نہ مرے کان میں پڑے
غائب ہو وہ تو جان مری جان میں پڑے

حکیم صاحب نہایت بھولے بھالے، پرہیزگار آدمی

تھے۔ اکثر عورتیں انھیں بہلا پھسلا کر اُن سے شادی کر لیتی تھیں۔ چنانچہ گھر ہو یا مطب، ہر وقت خواتین میں گھرے رہتے تھے۔ اس صورت حال کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

گل رخوں سے رابطہ میرا کبھی ٹوٹا نہیں
یہ وہ دامن ہے کبھی جو ہاتھ سے چھوٹا نہیں

حکیم صاحب موسیقی کے بھی رسیا تھے۔ نوجوانی میں اُس بازار کی ایک رقاصہ کو بہت پسند کرتے تھے جو گلوکارہ بھی تھی۔ وہ چند سال تک اس کے ہاں باقاعدگی سے حاضری دیتے رہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسی خواتین کو عشق کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ اسی زمانے کا ان کا ایک شعر یوں ہے:

ہلکا پھلکا پیار چلنا چاہیے
ہو کے اَب تیار چلنا چاہیے

حکیم صاحب اُس بازار میں جانے کے لیے سالم تانگا کروایا کرتے تھے۔ راستے میں کوئی واقف مل جاتا تو کہتے:

''ایک مریضہ کو دیکھنے جا رہا ہوں!''

ایک بار کہنے لگے:

''میں جھوٹ نہیں بولتا، وہ گلوکارہ واقعی بلڈ پریشر کی مریضہ ہے اور میں اُسے دیکھنے ہی تو جاتا ہوں!''

ایک بار بیمار پڑ گئے تو کافی عرصہ وہاں نہ جا سکے۔ اس دوران میں رقاصہ نے بھی اُن سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تندرستی کے بعد وہاں پہنچے تو اُس سے یوں گلہ کیا:

ہمارے دل کا اندھیرا اُجال دینا تھا
ہمارے نام لفافہ ہی ڈال دینا تھا

یہ شعر سن کر وہ بولی: ''جے میں لکھنا پڑھنا جان دی تے کوئی ہور کم نہ کر دی!'' (اگر میں لکھنا پڑھنا جانتی تو کوئی اور کام نہ کر لیتی)۔

حکیم صاحب اُس کی حاضر جوابی پر اش اش کر اٹھے۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ حکیم صاحب نے اُس بازار میں جانے سے توبہ کر لی۔ اس کا پس منظر بڑا دردناک ہے۔

ہوا یوں کہ اُس رقاصہ کی ماں کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کی وجہ (بقول حکیم صاحب) جوانی میں دل کا بے تحاشا استعمال تھا۔ بہرحال حکیم صاحب نے خاتون کا علاج اپنے ذمے لے لیا اور اُس کے دل کی طاقت بحال کرنے کے لیے اُسے پے در پے گُشتے کھلانا شروع کر دیے۔ یوں کہیے کہ مریضہ کے اندر جہاں پہلے ہی کشتگان کا میلہ لگا ہوا تھا، گُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ چنانچہ نئے اور پرانے گُشتوں کے مابین زبردست جنگ چھڑ گئی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ خاتون اللہ کو پیاری ہو گئی اور رقاصہ حکیم صاحب کی احسان مند ہونے کے بجائے اُلٹا انھیں اپنی ماں کی موت کا ذمے دار ٹھہرانے لگی۔ حکیم صاحب اس خیال سے کہ ابھی اس کا غم تازہ ہے، چند دن گزار کر اس کے بالا خانے پر پہنچے تو وہاں رقص و موسیقی کی محفل بپا تھی۔ حکیم صاحب کو دیکھتے ہی اُس بے مروت نے انھیں بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ شرفائے شہر کے سامنے یہ توہین آمیز رویہ اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ چنانچہ وہ یہ شعر پڑھ کر واپس چلے آئے:

بے وفا میں تری محفل سے چلا جاتا ہوں
اس قدر شور مچانے کی ضرورت کیا ہے!

آج حکیم صاحب اس دنیا میں موجود نہیں لیکن اُن کے چاہنے والوں اور چاہنے والیوں کو برسوں اُن کی یاد تڑپاتی رہے گی۔ ہمیں ایک دُکھ یہ بھی ہے کہ حکیم صاحب کی وہ خواہش پوری نہ ہو سکی جس کا اظہار انھوں نے اس شعر میں کیا تھا:

اُسی گلی میں اُسی کے حضور مرنا ہے
جو کام کرنا ہے، وہ تو ضرور کرنا ہے

حکیم صاحب کی وفات اُس گلی کے بجائے نتھیا گلی میں ہوئی جہاں وہ آخری ایام میں بحالی صحت کی خاطر گئے ہوئے تھے۔

●●●

بقیہ ''بھارت کے خوفناک سچ'' انہیں مستقبل میں بھی بہتری کی اُمید نہیں ہوتی لہٰذا وہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لیتے ہیں۔

۷۔ لڑکیوں کی کم ہوتی تعداد

درج بالا بتایا گیا کہ بھارت میں ہزارہا والدین بیٹیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے بھارت میں رفتہ رفتہ لڑکیوں کی قلت جنم لے رہی ہے۔ ۶ ستمبر ۲۰۱۷ء کو بھارتی ویب سائٹ، دی نیوز لینز میں بھارتی صحافی، ترون امرناتھ کا لکھا مضمون

''Behind the declining sex ratios of Indian cities''

شائع ہوا۔

مضمون میں ترون امرناتھ نے انکشاف کیا کہ ممبئی میں ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں صرف ۸۵۲ لڑکیاں رہ گئی ہیں۔ اسی طرح نئی دہلی میں یہ عدد ۸۳۲ اور حیدرآباد دکن میں ۹۴۲ ہے۔ مضمون کی رو سے صرف پہاڑی علاقوں میں مردوں اور خواتین کا تناسب نارمل ہے ورنہ اکثر بھارتی علاقوں میں اب لڑکوں کو شادی کرنے کی خاطر لڑکی کی مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اس باعث عجیب و غریب مسائل جنم لے رہے ہیں۔

بھارتی والدین بیٹی کی پیدائش کو خود پر مالی بوجھ سمجھتے ہیں لیکن بیٹے کے لیے مطلوبہ دلہن ڈھونڈنے پر ہزارہا روپے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ بھارتی معاشرے کا یہ تضاد ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔

۸۔ سب سے زیادہ غلام

والک فری فاؤنڈیشن (Walk free foundation) آسٹریلیا کی سماجی تنظیم ہے۔ کرۂ ارض سے غلامی کا خاتمہ اس کی منزل مقصود ہے۔ یہ تنظیم ہر سال ''گلوبل سلیوری انڈکس'' کے نام سے رپورٹ شائع کرتی ہے۔ اس رپورٹ میں افشا کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کن ممالک میں غلاموں کی تعداد زیادہ ہے۔

پچھلے سال کی رپورٹ نے یہ دلدوز خبر دی کہ دنیا میں سب سے زیادہ غلام بھارت میں بستے ہیں۔ ان کی تعداد ایک کروڑ اسّی لاکھ ہے۔ گویا ہالینڈ کی کل آبادی سے بھی زیادہ غلام بھارت میں رہتے ہیں۔ یہ سچائی بھارتی حکومت کے لیے کلنک کا ٹیکہ اور نہایت شرمناک حقیقت ہے۔

بھارت میں غلاموں کی کئی اقسام ہیں۔ بعض نسل در نسل سے زمین داروں کے یا کارخانے داروں کے غلام ہیں۔ بعض صرف روٹی کپڑا دینے پر غلام بنا لیے جاتے ہیں۔ بچوں کو غلام بنا کر ان سے کام کروانا بھی بھارت میں عام ہے۔

۹۔ بے حرمتی کا عالمی مرکز

بالی وڈ کی فلموں میں فحاشی کے مناظر عام ہیں۔ ان فلموں کی وجہ سے بھارتی معاشرے میں لڑکیوں کو چھیڑنے کا چلن جنم لے چکا۔ حتیٰ کہ بدقماش خواتین پر حملے بھی کرنے لگے ہیں۔ بھارت میں ایک سرکاری محکمہ ''نیشنل کرائم ریکارڈز'' ملک بھر میں جرائم کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ اس محکمے کے اعداد و شمار کی رو سے صرف ۲۰۱۵ء میں ''ساڑھے چونتیس ہزار'' بھارتی خواتین کو بے حرمتی کے عذاب سے گزرنا پڑا۔

ماہرین عمرانیات کا کہنا ہے کہ نئی دہلی، ممبئی اور دیگر شہروں میں خواتین کا گھروں سے باہر نکلنا دوبھر ہو چکا کیونکہ مردان سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ بالی وڈ فلموں نے بھارتی لڑکوں کو مادر پدر آزاد کر دیا ہے۔ اب وہ لڑکیوں کو دق کرتے ہوئے اپنے اوپر کوئی اخلاقی یا قانونی دباؤ محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا ہے۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ بہت سی بھارتی خواتین شرم کے باعث خود پر بیتا خوفناک واقعہ پولیس کو رپورٹ نہیں کرتیں۔ اس صورت حال نے بیشتر بھارتی شہروں اور قصبوں کو ایک خاتون کے لیے خطرناک جگہ بنا دیا ہے۔

۱۰۔ صحت و صفائی کی ناگفتہ بہ حالت

وزیراعظم نریندر مودی کا دعویٰ ہے کہ عنقریب بھارت چین کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی معاشی

طاقت بن جائے گا۔ ممکن ہے کہ یہ دعویٰ صحیح ہو مگر جب بھارت میں صحت وصفائی کی صورت حال پر نگاہ ڈالی جائے، تو مودی کی بات پر شک ہونے لگتا ہے۔

۲۵ ستمبر ۲۰۱۷ء کو مشہور رسالے ''اکنامسٹ'' میں ایک انگریزی مضمون بہ عنوان ''Why it is so hard to fix India's sanitation'' شائع ہوا۔ اس نے افشا کیا کہ بھارت میں ۴۵ کروڑ مرد و زن کھلے میدانوں، درختوں کے پیچھے، سڑک کنارے، پٹڑیوں پر اور پانی کے کنارے قدرتی احتیاج سے فراغت پاتے ہیں۔

بھارتی شہروں میں سولہ کروڑ شہری اپنے گھروں میں پاخانے کی سہولت نہیں رکھتے۔ یہ تقریباً روس کی آبادی جتنی تعداد ہے۔ مزید برآں بھارتی اپنا سارا فضلہ دریاؤں، نہروں، جھیلوں اور تالابوں میں بہا دیتے ہیں۔ عالمی بینک کی ایک رپورٹ منکشف کرتی ہے کہ بھارت میں ہر دس اموات سے ایک موت جابجا پھیلی گندگی کے باعث ہوتی ہے۔

انسانی وصنعتی فضلہ ٹھکانے نہ لگنے کی وجہ سے بھارت میں زیرِ زمین پانی بھی آلودہ ہو چکا۔ یہ آلودہ پانی پی کر ہر سال لاکھوں بھارتی بچے بیماریوں کا نشانہ بنتے ہیں اور ان میں سے سینکڑوں آخر کار چل بستے ہیں۔ لاکھوں ٹن گندگی ہوتے ہوئے کیا بھارت ایک سپر پاور بن سکتا ہے؟ یہ امر محلِ نظر ہے۔

۱۱۔ اقلیتوں کے لیے خطرناک ترین ملک

بھارت میں ہندو اکثریت طویل عرصے سے مسلم، عیسائی اور دیگر اقلیتوں پر ظلم ڈھا رہی ہے لیکن جب سے قوم پرست نریندر مودی برسرِ اقتدار آئے ہیں اقلیتوں پر حملے کئی گنا بڑھ چکے۔ ہندو ہجوم کو جب موقع ملے، وہ بہانے بہانے سے مسلمانوں اور عیسائیوں کو سرِعام قتل کر ڈالتا ہے۔

اب بھارت میں عالم یہ ہے کہ مسلمان اسلامی لباس میں ملبوس ہو کر باہر نکلتے ہوئے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ہندو اسلام قبول کر لے، تو شور مچ جاتا ہے۔ تب نو مسلم عدالتوں سے بھی انصاف حاصل نہیں کر پاتا۔ ان وجوہ کی بنا پر بھارت اقلیتوں کے لیے انتہائی خطرناک ملک بن چکا۔

خاتمہ کلام

درج بالا خوفناک حقائق سے عیاں ہے کہ چمکتے دمکتے (Shining) انڈیا میں سب اچھا نہیں۔ یہ اب بھی کئی لحاظ سے ایک پس ماندہ اور ترقی پزیر ملک ہے مگر بھارتی حکومت کا شعبہ پروپیگنڈا تمام خرابیاں پوشیدہ رکھنے اور اچھائیاں اجاگر کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

اس ضمن میں مغربی میڈیا بھی بھارتی میڈیا کا ہم نوا ہے۔ اکثر امریکی اور یورپی اخبارات اور ویب سائٹس بھارت کی تعریف وتوصیف میں قلابے ملانے والی تحریریں ہی شائع کرتی ہیں۔ اسی طرح ٹی وی نیٹ ورکس بھی بھارت کو ابھرتی سپر پاور کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف بھارت کی خامیاں اور خرابیاں دانستہ چھپائی جاتی ہیں۔

صد افسوس کہ حکومت پاکستان کا شعبہ میڈیا اور وزارت خارجہ غیر فعال بلکہ غیر ذمے دار ہے۔ مغربی میڈیا کے مسلسل پروپیگنڈے کی وجہ سے عالمی سطح پر پاکستان کو ایسا ملک سمجھا جانے لگا ہے جہاں ضعیف الاعتقاد اور دہشت گرد بستے ہیں۔ حالانکہ کئی باتوں میں پاکستان اپنے پڑوسی، بھارت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اتنی غربت نہیں جتنی بھارت میں پائی جاتی ہے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ حکومت پاکستان کا میڈیا سیل بین الاقوامی سطح پر فعال ہو جائے تاکہ دنیا والوں کے سامنے وطنِ عزیز کا مثبت تصور آ سکے۔ پاکستان کا شمار عالم اسلام ہی نہیں دنیا کے بڑے ممالک میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دیس کو ان گنت قدرتی وسائل اور نعمتوں سے نوازا ہے۔

نہایت بدقسمتی ہے کہ ہمارے حکمران ان وسائل سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو ایک خوشحال اور ترقی یافتہ مملکت کا روپ نہیں دے سکے۔

برا ہو ہمارا، جو ہم نے اردو ٹیچر بننے کا خواب دیکھا۔ اگر دیکھ ہی لیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ اس خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہم ایک اچھے بھلے انگلش میڈیم اسکول کا رخ کرتے؟ اب تو ہمیں خود کو گیدڑ کہنے میں کوئی عار نہیں۔

ایک ٹیچر کو جب پہلا سبق دیتے ہی سر پہ اولے پڑ گئے

ستم اور طرح کے......

مہ جبین تاج ارزانی

ہائے میرے ربا!

کاہے سوئے تھے اس رات، جس شب اس منحوس خواب نے آ کر ہماری غزالی آنکھوں میں بسنا تھا۔ خیر! قصہ مختصر! ہم نے ٹیچر بننے کا خواب دیکھا۔ وہ بھی انگریزی ٹیچر نہیں، حساب ٹیچر نہیں، سائنس ٹیچر نہیں...... اردو ٹیچر۔ جی ہاں! اردو ٹیچر۔

اب آپ کے سامنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ ہی رہے ہیں تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ خواب۔ ہماری بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں کیسے بسا۔ دراصل کچھ عرصہ قبل امریکا سے ہمارے کچھ رشتے دار پاکستان تشریف لائے اور تشریف کا ''ٹوکرا'' (اس ٹوکرے سے بھی خاصی یادیں وابستہ ہیں) ہمارے گھر بھی لائے۔ مہمانوں سے ملاقات کے دوران گفتگو کا رخ ''مظلوم و معصوم'' اردو زبان کی جانب مڑ گیا۔

مہمانوں کو پاکستانیوں کی منگلش پر سخت قسم کا اعتراض تھا۔

ہم امریکیوں کی کسی بات سے اختلاف کرتے ہیں جو اس سے کرتے؟ سو اتفاق کر بیٹھے۔ مہمانانِ گرامی نے ہماری حمایت پر (جو کہ درحقیقت امریکا اور امریکیوں کے حق میں تھی) ہمیں اردو زبان کی تدریس پر اکسایا۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان کے ناقص نظامِ تعلیم میں کچھ سدھار لانے کے لیے ہمیں اپنی خدمات پیش کرنے کا مشورہ دیا جس میں جدید ٹیکنالوجی، جدید نظامِ تعلیم رائج کرتے ہوئے اردو زبان پڑھانے کی ابتدا کرنا شامل تھا۔

"جدید اردو طرزِ تعلیم" اور "جدید ٹیکنالوجی" کی مدد سے اردو پڑھانے والی پہلی معلمہ کا تاج پہنے ہم نے ساری رات خواب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق سے تعریفی کلمات سنتے گزاری اور دوسرے دن رخ کیا منگلش اوہ معاف کیجیے گا انگلش میڈیم اسکول کا۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے کہ اگر آپ ہمیں گیدڑ بھی کہہ لیں تو ہم ہرگز برا نہیں مانیں گے۔

جی! تو پہنچے چار اسٹیشن آگے ایک اسکول۔ ایم۔ایس۔سی گولڈ میڈلسٹ اور اردو میں دلچسپی؟ کافی دیر تو اسکول ہیڈ ہمیں گھورا کیے۔ اردو معلمہ کی نوکری کے لیے سائنس سے متعلق سوالات محض یوں کیے گئے تاکہ اس سوچ کا سر کچلا جاسکے جو اردو پڑھانے پر اصرار کرنے پر ان کے دل میں جعلی ڈگری کے حوالے سے آیا تھا۔ بات انٹرویو سے آگے بڑھی۔ بالآخر ہم نے اردو ٹیچر کی نوکری حاصل کرہی لی۔

اگلے دن خوب تیاری کے ساتھ اسکول پہنچے۔ جماعت ہشتم میں نہایت اہتمام کے ساتھ تختہ سفید پر پچھلے سال کے کیلنڈر سے کاٹی گئی بڑی سی تصویر چسپاں کی۔ بچوں کو ہدایت دی "تصویر کی منظر نگاری کیجیے"۔ لکھائی کے کام کے بعد ساری کاپیاں سمیٹ سماٹ گھر لے آئے اور اب...... پہلی ہی کاپی جانچتے ہوئے سر پیٹتے ہوئے اپنے خواب سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ پہلی ہی کاپی میں زبان دانی کے وہ وہ جوہر دکھائے گئے ہیں کہ بس سمجھیں چراغوں کی روشنی ہی ختم ہوگئی۔ آپ سمجھے نہیں؟ ٹھہریے...... ہم تفصیل سے بتاتے ہیں۔

ہم نے پہلی کاپی اٹھائی اور چیک کرنا شروع کیا مگر ہمارے ساتھ کاپی چیک کروانے سے پہلے آپ یہ جان لیں کہ یہ کام منظر نگاری کا ہے جس میں ایک باغ ہے۔ درختوں پر پرندے بیٹھے اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ ایک لڑکا پرندوں کو دانا ڈال رہا ہے جبکہ دوسرا درخت کے نیچے کھڑا (بظاہر) باغ کی خوشگوار فضا سے لطف اٹھا رہا ہے۔

اب کاشف نامی طالبِ علم کی کاپی ہے جس نے منظر نگاری میں کرداروں کو نام دے دیے۔ یہاں تک تو خیر ہے مگر آگے جناب لکھتے ہیں "یہ باغ کا منظر ہے۔ بنچ پر الو بیٹھے ہیں۔" ہم بہت چکرائے۔ تصویر میں موجود تمام بنچوں پر الو تلاش کیا مگر ناہنجار نے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ تھک ہار کر آگے بڑھے، لکھا تھا: "الو کے برابر میں امی بیٹھی ہیں۔" ہم اپنی کم عقلی پر بہت شرمائے۔ اگر بچے سے "ابو" کے "ب" کا نقطہ چھوٹ گیا تھا اور شوشہ لمبا ہو گیا تھا تو ہمیں سمجھنا چاہیے تھا۔ شرماتے شرماتے آگے بڑھے، لکھا تھا، "اس باغ میں آس پاس کے محلے کے "آم لوگ" آئے ہوئے ہیں۔ خون اتنا کھولا کہ کچھ دیر پہلے کی شرمندگی جل کر خاک ہوگئی۔ جلتے بھنتے "آم" کو کاٹ کر (چھری سے نہیں قلم سے) "عام" کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

"ان ہی آم لوگوں میں ایک لڑکا جاوید پرندوں کو روٹی کے ٹوکرے ڈال رہا تھا۔" بارہا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر روٹی کا ٹوکرا تلاش کیا۔ نہ ملنے پر ٹوکرا کاٹ کر "ٹکڑا" کیا۔ اگر ایسا نہ کرتے تو ساری عمر اس تصویر میں روٹی کا ٹوکرا ہی تلاش کرتے گزر جاتی۔

دو چار سطریں خیر و عافیت سے گزریں۔ تلملاہٹ کچھ کم ہوئی ہی تھی کہ مسمی کاشف صاحب کے اندر کا ادیب ہمیں پچھاڑیں کھانے پر مجبور کرنے لگا۔ موصوف نے لکھا۔ "خوبصورت باغ میں پرندے چلا رہے ہیں"۔ ہم نے تصویر میں دیکھ کر پرندے کی نسل پہچاننے کی کوشش کی کہ ایسا کون سا بدذوق پرندہ ہے جو باغ جیسی حسین، لطافت سے بھرپور جگہ پر اپنی سریلی آواز میں چہچہانے کے بجائے چلا چلا کر باغ کا سکون غارت کرنے کے درپے ہے، بدذوق کہیں کا۔ یہ بھی خیال نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی شکاری پرندہ ہوگا کہ شکار سے پہلے خاموشی ضروری ہے نا کہ چلانا۔

ہماری اپنے خواب سے دست برداری اپنی جگہ مگر پہلے ہی بچے کی تخلیقی صلاحیتیں دیکھ کر محسوس ہوا "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"۔ ہم نے شروع ہی میں بتایا تھا کہ ہم خالص پاکستانی ہیں۔ خالص پاکستانی ہی تو امریکیوں سے متاثر ہوتا ہے نا بھئی!!!! اس لیے ہم نے یہاں بھی پاکستانیوں والی حرکت کی یعنی اپنے دماغ سے سوچنے کے بجائے امریکیوں کے دماغ سے سوچا۔ مٹی بے شک بہت زرخیز سہی مگر کسان کا اپنے کام میں ماہر ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ اردو جیسی پُرلطف اور میٹھی زبان پڑھانے کے لیے اس زبان کے ماہرین سے استفادہ کرنا چاہیے نہ کہ ہم جیسی ایم۔ایس۔سی گولڈ میڈلسٹ کو طبع آزمائی کرنی چاہیے؟ آپ کا خیال ہے؟

جہد مسلسل (جماعت اسلامی کی تاریخ)، تدوین و تالیف: محمود عالم صدیقی، ناشر: زاک بکس، دکان نمبر ۳، مدینہ اپارٹمنٹ، پلاٹ نمبر ۱۳-بی، ناظم آباد نمبر ۲، کراچی، فون نمبر ۰۲۱-۳۶۶۰۴۰۵۲، قیمت: ۹۰۰ روپے۔

جماعت اسلامی کا شمار وطن عزیز کی اہم اسلامی جماعتوں میں ہوتا ہے۔ اس جماعت کا باضابطہ قیام ۲۶/ اگست ۱۹۴۱ء کو عمل میں آیا۔ تب سے یہ پاکستان میں خلافت راشدہ کے نمونے پر اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کارکن اور تمام پاکستانی بھی اپنے قول و فعل میں اسلامی اقدار کا کامل نمونہ بن جائیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب اسی انتہائی منظم جماعت کی تاریخ ہے۔ یہ پہلی جلد ہے جس میں بانی تنظیم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دورِ امارت (اگست ۱۹۴۱ء تا نومبر ۱۹۷۲ء) کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چھ سو اڑتالیس صفحات کی اس کتاب میں جماعت اسلامی کی تاریخ ہی موجود نہیں بلکہ یہ اس دور کی سیاسی و معاشرتی اور ثقافتی معلومات بھی کماحقہٗ انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس خوبی نے اُسے ایک قیمتی دستاویز بنا دیا ہے۔

کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مرتب نے ابتداً برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تحریکات کی سرگرمیوں کا جامع تذکرہ پیش کیا ہے۔ بعد ازاں وہ اسباب بیان کیے ہیں جن کے باعث مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔

اس کے بعد مختلف ارتقائی مراحل اور اجتماعات کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ یہ تفصیل بیسویں صدی کے مختلف ادوار کی سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور ثقافتی زندگی سے عبارت ہے۔

فاضل مرتب نے سات برس عرق ریزی سے تحقیق کرنے کے بعد یہ کتاب مدون کی ہے۔ انھوں نے متن کو حوالوں، حواشیوں، اشاریے اور ضمیموں سے بھی آراستہ پیراستہ کیا ہے جس کے باعث کتاب کی وقعت و اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جماعت اسلامی پر وقتاً فوقتاً متفرق الزامات لگتے رہے ہیں۔ مرتب نے دلائل کی مدد سے ان کا بھی مربوط جائزہ لیا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ انتہائی منظم تنظیم ہوتے ہوئے بھی جماعت اسلامی الیکشنوں میں کیوں متاثر کن کارکردگی نہیں دکھا پاتی؟

یہ ضخیم کتاب اعلیٰ کاغذ پر عمدہ انداز میں طبع ہوئی ہے۔ جماعت اسلامی اور عمومی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے خواتین و حضرات اُسے دل خوش کن کتاب پائیں گے۔ اِسے اپنی لائبریری کا ضرور حصہ بنائیے۔ قیمت موزوں و مناسب ہے۔

نام کتاب: امی جان، مصنف: ضیا شاہد، ناشر: قلم فاؤنڈیشن، یثرب کالونی، بینک اسٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ، فون: ۰۳۰۰-۵۱۵۱۰۱، قیمت: ۵۰۰ روپے

جناب ضیا شاہد کا شمار ممتاز قلم کاروں اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ میں مترجم کی حیثیت سے ان کی قلمی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور معاون مدیر کے عہدے تک پہنچے۔ بعد ازاں سیاسی صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور اب اخبارات شائع کرنے والے ایک ادارے کے سربراہ ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب انھوں نے اپنی والدہ مرحومہ پر قلم بند کی ہے۔

حشمت بیگم ضلع جالندھر کے ایک گاؤں رائے پور آرائیاں میں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ شعور سنبھالا، تو چودھری جان محمد سے شادی ہوئی۔ اس بیاہ سے چار بچے تولد ہوئے۔ بڑا بیٹا چند برس کا تھا کہ چودھری جان محمد اچانک برین ہیمرج کے باعث چل بسے۔ تب ان کے سب سے چھوٹے بیٹے، ضیا شاہد کی عمر صرف ایک برس تھی۔ یوں وہ پدرانہ شفقت و محبت سے محروم رہ گئے۔

نوجوانی میں بیوہ ہونے کے باوجود حشمت بیگم نے حوصلہ نہیں ہارا اور پوری توجہ اور توانائی سے اپنے بچوں کی تربیت کرنے لگیں۔ یہ انہی کی سعی اور قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ چاروں اولادوں نے پڑھ لکھ کر معاشرے میں نمایاں مقام پایا اور تمام آسائشوں سے بھی سرفراز ہوئے۔

یہ ایک باہمت اور بہادر ماں کی سبق آموز داستان ہے جنھوں نے شوہر کی اچانک وفات کے صدمے کو صبر و استقامت سے جھیلا اور پھر تن من دھن سے اپنی اولاد کی پرورش و تربیت میں جُت گئیں۔ دورِ حاضر میں بعض خواتین حالات سے تنگ آ کر بچوں سمیت خودکشی کر لیتی ہیں۔ ایسی کم ہمت ماؤں کو حشمت بیگم جیسی عظیم ماں کی زندگی کو مشعلِ راہ بنا لینا چاہیے۔

حشمت بیگم نے ۲۰۰۲ء میں وفات پائی۔ ان کا سفرِ زیست تکالیف اور مصائب سے پُر رہا مگر اللہ تعالیٰ نے آخر انھیں اپنی نعمتوں سے بھی نوازا۔ مرحومہ نے ۱۵ حج اور ۱۵۰ عمرے کیے اور یوں قربِ الٰہی سے مستفید ہوتی رہیں۔

کتاب معیاری کاغذ پر عمدہ چھپائی میں طبع ہوئی ہے۔ خودنوشت اور خاکے پڑھنے کے شائق قاری اِسے مرغوب تخلیق پائیں گے۔

نام کتاب: اُمہات المومنین، تالیف محمود میاں نجمی، ناشر: امتل البشیر پبلی کیشنز۔ کراچی، فون: ۰۳۱۵-۸۲۷۵۱۲۶، قیمت: ۲۰۰ روپے۔

ایک مشہور قول ہے: ''مجھے اچھی ماں دو، میں تمھیں ایک ترقی یافتہ قوم عطا کردوں گا۔'' یہ قول ماں کی اہمیت بخوبی اجاگر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اچھی مائیں کیونکر جنم لیں؟ بہترین طریق عمل یہ ہے کہ پاکستانی مائیں امہات المومنینؓ کے نقشِ قدم پر گامزن ہو جائیں۔ یوں وہ دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں مرتب نے اُمہات المومنینؓ کے حالاتِ زندگی شرح و بسط سے قلم بند کیے ہیں۔ ان عظیم خواتین کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ نے پیغمبرِ رحمت، محسنِ انسانیت حضور اکرم ﷺ کی معیت میں بہت سا وقت گزارا۔ چنانچہ عظیم ترین انسان کے سایہ رحمت میں نشوونما پا کر امہات المومنین بھی کامل اخلاق کا مجموعہ بن گئیں۔ اسی لیے ہماری ان پُرعظمت ماؤں کی زندگیاں خواتین ہی نہیں مردوں اور بچوں کے لیے بھی منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ کتاب ازواجِ مطہراتؓ کی حیات و خدمات اور سیرت و کردار کا دلنواز مجموعہ ہے۔ ان کی لائقِ تقلید زندگیاں قدم قدم پر ہمیں حق کی راہ دکھلاتی اور صحیح راستہ بتاتی ہیں۔ دل تاریکی سے بھر جائے اور زندگی اجیرن ہو، تو امہات المومنینؓ کی حیات کا مطالعہ کیجیے دل و دماغ نور سے بھر جائے گا۔

کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور کاغذ معیاری۔ اس کی گوناگوں خصوصیات دیکھتے ہوئے قیمت مناسب لگتی ہے۔ اس مقدس کتاب کو اپنے کتب خانہ کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: نوکنڈی، تالیف: حافظ عبدالباسط حسن زئی، ناشر: ولید پبلشرز، ۳۹۴-بلاک جی-۴، محمد عملی جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون: ۰۳۳۳-۴۲۵۴۳۹۴، قیمت: ۲۰۰ روپے۔

بلوچستان کے ضلع چاغی کو وطن عزیز کے لحاظ رقبہ سب سے بڑے ضلع ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی پانچ تحصیلیں ہیں..... چاغی، اموری، نوکنڈی، دالبندین، تفتان اور یا نچ۔ زیر تبصرہ کتاب تحصیل نوکنڈی کے بارے میں ہے جس کا صدر مقام بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

تحصیل نوکنڈی اس لیے ممتاز ہے کہ وہاں سونے و تانبے کی سینڈک کان واقع ہے۔ کتاب کی رو سے تحصیل کی آبادی ۴۰ ہزار سے زائد ہے، تاہم اس میں رقبہ نہیں دیا گیا۔ بہرحال کتاب میں نوکنڈی کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی معلومات موجود ہیں۔

نام کتاب: مزے مزے کے مشاعرے، مرتبہ: شجاع الدین غوری، ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، دفتر نمبر ۵، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی، قیمت ۵۰۰ روپے

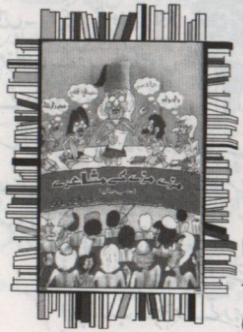

مشاعرہ ہماری ادبی و سماجی تہذیب کا ایک اہم جزو ہے۔ ماضی میں بڑے تزک و احتشام سے مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ اب ان کی

روایت ماند پڑ گئی ہے مگر مشاعرہ شہری زندگی میں بہر حال رچا بسا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب مشاعرے کی اسی روایت سے متعلق ہے۔

جناب شجاع الدین غوری نے آغاز میں تفصیل سے مشاعرے کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں مشاعروں پر نامور مصنفین کی رستحات قلم شامل ہیں جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری، حاجی لق لق، شوکت تھانوی، مجید لاہوری، ابن انشا، مشتاق یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نمایاں ہیں۔

ممتاز قلم کاروں کی تحریریں دلچسپ واقعات اور لطائف سے سجی ہوئی ہیں جو دل شاد کام کرتی ہیں۔ کتاب کی چھپائی معیاری ہے اور کاغذ بھی عمدہ۔ مزاحیہ مضامین کے پرستار اس کو دل پسند پائیں گے۔

نام کتاب: آسمان سخن، مصنف: عطا محمد عنبر، برائے رابطہ: سید ریاض گیلانی، فون: ۰۳۲۱-۷۶۹۶۶۵۸، قیمت: ۴۵۰ روپے۔

یہ برطانیہ میں مقیم شاعر کا دسواں شعری مجموعہ ہے۔ عطا محمد صاحب اصلاحی شاعری کرتے ہیں۔ اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے انھوں نے اخلاقی و معاشرتی مسائل اجاگر کرنا اپنا وتیرہ بنا رکھا ہے اور اپنی سعی میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ مجموعہ کلام میں سے قطعہ بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش ہے:

ذکرِ اللہ کرتے رہو چلتے پھرتے
اپنے رب سے ڈرتے رہو چلتے پھرتے
بیٹھے لیٹے عنبر جی، اللہ ہی اللہ
رب کا دم ہی بھرتے رہو چلتے پھرتے

نام کتاب: بساط دل، مصنف ماہ رخ حفیظ، ناشر: غلام طاہر رانا پبلی کیشنز، غنی پلازہ، ایم اے جناح روڈ، چوک کمہاراں والا، ملتان، فون: ۶۶۴۱۶۵۳-۰۳۰۰، قیمت: ۵۰۰ روپے۔

ملتان میں مقیم ماہ رخ حفیظ کو بچپن ہی سے علمی و ادبی ماحول ملا، اس لیے شاعری کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ ریڈیو پاکستان (ملتان) پر شاعری کے پروگراموں میں شرکت کی۔ شادی کے بعد بھی شاعری کا سلسلہ جاری رکھا۔ روایتی غزلیں لکھنے کے علاوہ اصلاحی نظمیں بھی کہتی ہیں۔ مزید برآں افسانہ نگار بھی ہیں۔ یہ آپ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو عمدہ انداز میں شائع ہوا ہے۔ اس سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نور نے کیا تھا سجدہ پیکرِ حنا کی کو
یہ مرتبہ نہ بھول جاؤ یہی محبت ہے

☆☆

بجھتے ہوئے چراغوں کے مدھم سے نور میں
تم اجالوں کے سفر کی جستجو کرتے رہو

☆☆

متاع دنیا میں ہو جائے جب وفا محصور
بڑے شعور سے علم و ہنر کی بات کرو

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

چمنِ خیال

بچوں کو وقت دیجیے

دورِ حاضر میں ہمارا معاشرہ رشتوں کی رنگینی سے لطف اندوز ہونا بھولتا جا رہا۔ والدین اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے انہیں وقت نہیں دے پا رہے۔ دوسری طرف بچے اپنے مذہب، نظریات اور اقدار سے دور ہو رہے ہیں۔ اسکولوں میں مذہب کی تعلیم آٹے میں نمک برابر بھی نہیں اور گھر کا ماحول اسلامی نہیں رہا۔ نہلے پہ دہلا یہ کہ والدین اپنے بچوں کو وقت نہیں دے پاتے۔ نتیجتاً بچے انتہائی بنیادی اسلامی تعلیمات سے بھی کورے ہوتے جا رہے ہیں۔

والدین کی توجہ نہ ہونے کی بنا پر بچے اپنے قریبی رشتوں کی پہچان بھولتے جا رہے ہیں۔ سارا دن اپنے ملازمین یا گلی محلے کے آوارہ بچوں کی صحبت ان پر خوب رنگ چڑھاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بچوں کی وہ اخلاقی تربیت ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ! گالیاں دینا اور گلی محلے کے عزت داروں پر آوازے کسنا، انہیں اپنا مشغلہ معلوم ہوتا ہے یا پھر وقت گزاری کے لیے بچے کارٹون اور ویڈیو گیمز کا سہارا لیتے ہیں جو کئی ناجائز پہلوؤں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

بچوں کا لاشعور ان کے بیک ڈور پیغامات کو غیر محسوس انداز میں قبول کر لیتا ہے۔ نتیجہ وقتاً فوقتاً قتل و غارت، ڈاکا زنی، خودکشی اور مار دھاڑ کی صورت میں نکلتا رہتا ہے اور ہم اے سی کی ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں میں بیٹھے حیرانی کے ساتھ کہہ رہے ہوتے ہیں ”پتا نہیں ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ہمارے دور میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا؟“

وقت کسی کو مہلت نہیں دیتا۔ اگر ہم نے اس مسئلے پر قابو نہ پایا تو یقین کیجیے چند سالوں بعد ہمیں بھی اہل مغرب کی طرح اپنی اولاد سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں۔ ہماری آنے والی

نسلیں ہمارے بھی آخری ایام اولڈ ہومز میں گزروائیں گی۔ شادیاں اپنی مرضی سے کریں گی، اور اپنے والدین کی خدمت کرنے پر ان سے معاوضہ طلب کریں گی۔

اس بارے میں اجتماعی شعور پیدا کرنا ہوگا۔ بچوں کی اخلاقی تربیت پر بھرپور توجہ دینا ہوگی۔ انہیں انٹرنیٹ اور ویڈیو گیمز کی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا میں لانا ہوگا۔ اپنے وقت میں سے ایک حصہ ان کے لیے مختص کرنا ہوگا تاکہ وہ ہمارے ساتھ مانوس ہوں، اجنبیت ختم ہو، اور وہ اپنی باتیں، اپنے مسائل ہمارے ساتھ شیئر کرسکیں۔ وہ ہمیں اپنا ہمدرد سمجھیں، نہ کہ محض سرپرست۔ جو اُن کے لیے سرمایہ مہیا کرتا ہے۔ یاد رکھیں! اگر ہم نے یہ نادر موقع گنوادیا تو پھر ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ کیونکہ

خود اپنی ہی جڑوں پر چلاتی ہے درانتی
بربادی احساس نمو مانگ رہی ہے۔

(عبدالصبور شاکر)

☆☆☆☆☆

ایک عالم کی رحلت

ماہِ ستمبر میں خبر ملی کہ مبارک لائبریری والے انیس شاہ جیلانی رحلت فرماگئے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔ وہ علم و ادب کے سرپرستوں میں سے تھے۔ راقم اُردو ڈائجسٹ کا قدیم اور دیرینہ قاری ہے۔ ایک گزارش ہے، چمنِ خیال پہلے کی طرح ابتدائی صفحات میں آنا چاہیے۔

(پروفیسر محمد اسلم اعوان۔ گوجرانوالہ)

☆☆☆☆☆

تاریخی کردار

اُردو ڈائجسٹ نے ''سب رنگ'' کی طرح ایک دنیا کو متاثر کیا ہے لیکن نظریاتی اور قومی جدوجہد میں اُردو ڈائجسٹ نے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ملی یک جہتی میں یہ پیش پیش رہا ہے۔

(ڈاکٹر سید ابوالحسن شاہ جیلانی، صادق آباد)

تحفے سے کم نہیں

علم و ادب کے چاہنے والوں کے لیے اُردو ڈائجسٹ ایک انعام سے کم نہیں، کیونکہ اس کی تمام تحریروں اور مضامین کو پرکھ و سمجھ بوجھ کے ساتھ شائع کرنے والے کوئی عام غیر ذمہ دار افراد نہیں بلکہ کہنہ مشق صحافی قریشی صاحبان ہیں۔ جن کے نام میں چوتھی جماعت سے پڑھ رہا ہوں۔ میرے ابا استاد تھے اور وہ اُردو ڈائجسٹ گھر لایا کرتے تھے۔ اُس وقت سے آج تک اس ڈائجسٹ کا شیدائی ہوں۔ جس نے اپنے دماغ کے خلیوں سے حسرت و یاس اور مایوسی کی گرد کے جالے صاف کرنے ہوں، ان کو اُردو ڈائجسٹ کا مطالعہ شروع کردینا چاہیے۔ یہ رسالہ نہ صرف علم و ادب کی روشنی پھیلاتا ہے بلکہ دل کو یہ تسلی بھی دیتا ہے کہ بہت جلد اچھا وقت آئے گا۔

ابابیل کے متعلق مضمون بڑا پُرمغز تھا۔ ہاتھی والوں کے واقعات تمام تر جزئیات کے ساتھ لکھے گئے جس سے علم میں بے حد اضافہ ہوا۔

(مظفر بشیر کھوکھر، والٹن لاہور)

توجہ فرمائیے

ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ میں طبع ہونے والی تحریروں پرنٹ یا ڈیجیٹل، دونوں کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی کتاب یا رسالے میں اُردو ڈائجسٹ کی کوئی تحریر شائع کرنے سے قبل ادارے سے اجازت لینا ضروری ہے۔

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

خالدؓ بن ولید اسلام کے عظیم ترین فاتح اور نامور جرنیل کی مختصر اور جامع سوانح عمری
غزوات اور اسلامی فتوحات کی تفصیل
قیمت 600 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	860	امریکہ کی عوامی تاریخ	ہاورڈ زن	600
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380	مسلمان اُندلس میں	سٹینلے لین پول	380
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ و تہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480	ناموس (ناول)	ایلف شفق	580
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	400	رسولِ کائناتؐ (سیرتِ نبوی)	عبدالکریم شمر	400
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180	سرخ میرا نام (ناول)	اورحان پاموک	780
سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ	ضمیر احمد ہاشمی	400	اُجڑے دیار (ناول)	انطونیو توریس	500
تاریخِ عالم	ڈاکٹر فیدور کروکن	750	سرزمین (ناول)	انطونیو توریس	300
اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آرا امام	650	چلتا مسافر (ناول)	الطاف فاطمہ	800
سکندرِ اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	540	خواب گر (ناول)	الطاف فاطمہ	800
سلیمان عالیشان۔ تاریخ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520	بوئے گل (ناول)	ایثار کمال	480
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590	انا طولیہ کہانی (ناول)	ایثار کمال	580
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580	بابِ اسرار۔ دو درویش، شمس تبریز اور رومی	احمت امیت	980
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990	مزاحمت کی سرگوشیاں (ناول)	احمت امیت	980
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800	شیشے کا آدمی (مختصر روسی افسانے)	ڈاکٹر نجم الحر بٹ	550
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	200	استنبول (داستانوں کا شہر) (ناول)	ماریو لیوی	1600
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	بادِ بہار (ناول)	زُلفو لیوانلی	700

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح
Rs.600

کہانی جلال الدین رومی کی
چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ) ایلف شفق
Rs.880 (The Forty Rules Of Love)

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140
www.jumhooripublications.com

NOTICE INVITING TENDERS

Sealed tenders based on item rates/percentage above or below on approved estimated(DNIT) amount are hereby invited for, the works mentioned below from the contractors/firms enlisted/renewed with C&W Department for the current financial year 2017-18 in the field of Buildings works and who have PEC license in relevant category 2017-18.

Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bids in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/renewal letter, PEC license, CNIC of contractor/managing Partner/Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR / Bank Draft /Cashier's Cheque of any scheduled bank:

i) Chief Engineer, Punjab Buildings Department North Zone Lahore.
ii) Commissioner Rawalpindi Division Rawalpindi.
iii) Superintending Engineer, Buildings Circle No. 1 Rawalpindi.
iv) Deputy Commissioner Chakwal.
v) Executive Engineer, Buildings Division Chakwal.
vi) Assistant Commissioner Chakwal, Talagang, Choa Saiden Shah, Kallar Kahar & Lawa.

Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. Tenders will be received in the office of Commissioner, Rawalpindi Division Rawalpindi and will be opned simultaneously on fixed date and time by the respetive tenders Opening Committee as per following schedule in the presence of intending contractors or their representatives.

Conditional tenders and tenders not accompanied with earnest money@2% of the estimated cost in shape of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque of any Scheduled Bank.

(1) The procuring agency may reject all bids at any time prior to the acceptance of bid.

(2) The agency shall upon request communicate to any bidder, the ground for its rejection of all bids or proposal, but shall not be required to justify those grounds.

Last date for submission of application to purchase tenders is 11-11-2017
Date & time for receipt & opening of tender is 14-11-2017 at 11:00/ 11:30 am

S. No.	Name of Work	Estimated Cost (M)	T.S No. & Date	Earnest Money	Tender Fee	Completion Time
1	Re-Construction of 02 No. Dilapidated Class Rooms in GHS Dharabi Tehsil & District Chakwal.	2.740	E.E (B) Ckl No. 2156/D dt: 10.08.17	54860/-	10000/-	4 Months

S. No.	Name of Work	Estimated Cost (M)	T.S No. & Date	Earnest Money	Tender Fee	Completion Time
2	Re-Construction of 02 No. Dilapidated Class Rooms in GGPS Dhoke Mureed Tehsil & District Chakwal.	2.201	E.E (B) Ckl No. 2156/D dt: 10.08.17	44020/-	10000/-	4 Months
3	Re-Construction of 03 No. Dilapidated Class Rooms in GHS Malikwal.	4.075	E.E (B) Ckl No. 2157/D dt: 10.08.17	81500/-	10000/-	6 Months
4	Construction of Toilet Block & Boundary Wall in GHS No.1 Chakwal Tehsil & District Chakwal.	0.560	E.E (B) Ckl No. 2158/D dt: 10.08.17	11200/-	10000/-	2 Months
5	Construction of Toilet Block (02 No.) in GGES Amir Pur Mangan Tehsil & District Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2162/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
6	Construction of Toilet Block (02 No.) in GGES Mohra Awan Tehsil & District Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2162/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
7	Construction of Toilet Block (02 No.) in GHS Tatral Tehsil & District Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2162/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
8	Construction of Toilet Block (02 No.) in GGHSS Dalwal Tehsil Choa Saidan Shah District Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2162/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
9	Construction of Toilet Block (02 No.) in GBPS Chak Koka Tehsil District Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2162/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
10	Construction of Boundary Wall in GHS Dharabi Tehsil & District Chakwal.	0.254	E.E (B) Ckl No. 2156/D dt: 10.08.17	5080/-	130/-	2 Months
11	Construction of Toilet Block in GGES Mohallah Sarpak Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2160/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
12	Construction of Toilet Block GPS Dayyan Tehsil Kallar Kahar District Chakwal.	0.306	E.E (B) Ckl No. 2160/D dt: 10.08.17	6120/-	160/-	2 Months
13	Construction of B/wall in GGHS Khuyian (High Portion)	2.344	E.E (B) Ckl No. 2741/D dt: 19.10.17	46880/-	10000/-	4 Months
14	Upgradation GBES Pira Jangla to High level Tehsil Talagang District Chakwal.	7.630	E.E (B) Ckl No. 2740/D dt: 19.10.17	152600	10000/-	6 Months

S. No.	Name of Work	Estimated Cost (M)	T.S No. & Date	Earnest Money	Tender Fee	Completion Time
15	Upgradation of GGES Ballokassar to High Level, Tehsil & District Chakwal.	10.500	E.E (B) Ckl No. 2738/D dt: 17.10.17	210000	10000/-	8 Months
16	Upgradation of GES Dhoke Mail, Tesil Talagang District Chakwal to High Level.	9.090	E.E (B) Ckl No. 2739/D dt: 17.10.17	181800	10000/-	8 Months
17	Upgradation of GGES, Chaki Sheikh Jee, Tehsil Talagang District Chakwal to High Level.	8.352	E.E (B) Ckl No. 2739/D dt: 17.10.17	167040	10000/-	8 Months
18	Upgradation of GGES Mirjan to High level, District Chakwal.	8.000	E.E (B) Ckl No. 2739/D dt: 17.10.17	160000	10000/-	8 Months
19	Construction of Multipurpose Hall at Govt. Degree College for women Yenhar, Buchal Kalan, Chakwal.	24.900	S.E (B) Rwp No.4032/D dt:18.10.17	498000	10000/-	18 Months
20	M&R to Judicial Rest House District Complex Chakwal.	0.600	E.E (B) Ckl No. 2179/D dt: 12.08.17	12000/-	2000/-	3 Months

Name: Muhammad Saeed Ullah Hashmi
Designation: Executive Engineer
Department: Buildings Division
House / street
P.O. Box with Postal Code
Cantonment area
City name with Distt: Distt. Complex Ghaziabad Talagang Road Chakwal
And the:
Phone / Fax / Mobile No:
0543-660020/
Fax 0543-660020
0345-6825827

Name: Shehzad Hussain
Designation: Superintending Engineer
Department: Buildings Circle No. 1
House / street
P.O. Box with Postal Code: Mehrabad Main Peshawar Road Rawalpindi
Cantonment area: Rawalpindi Cantt.
City name with Distt: Rawalpindi
And the:
Phone / Fax / Mobile No:
051-9278287
Fax 051-9278242
0333-4378082

Executive Engineer, Building Division Chakwal

Superintending Engineer, Building Circle No. 1, Rawalpindi

جرائم کی دنیا کی دلچسپ اور تہلکہ خیز حقیقی کہانیوں پر مشتمل کتاب

جیل کہانی

دنیا میں ہر روز 25 ارب ڈالر کے جرائم کیسے اور کن کن طریقوں سے ہوتے ہیں؟
کیا ہر کامیاب انسان کی دولت کے پیچھے واقعی ایک خوفناک کہانی چھپی ہوتی ہے؟
پاکستان کی سو جیلوں میں ہر روز اربوں روپے کے بزنس کون اور کیسے کرتا ہے؟
ماڈل ایان علی اور ریمنڈ ڈیوس اور محمد خان ڈاکو کے بیتے دنوں کی داستانیں؟
کیا پاکستان میں جرائم پیشہ افراد کی پشت پناہی حکمران کرتے ہیں؟
پاکستان میں پڑھا لکھا طبقہ اور بزنس مین کن کن طریقوں سے جرم کرتے ہیں؟
دانشورانہ جرائم، قلمی جرائم، قلبی جرائم کیسے کرتے ہیں؟
ہر شہر میں ہونے والے جرائم اور ان کا خوفناک انجام؟

قیمت: 800

کی نئی کتاب "جیل کہانی" میں پڑھیں
جاوید راہی

نہ ملنے کی صورت میں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، والٹن روڈ لاہور کینٹ سے حاصل کریں۔
0300-0515101/0333-4393422/03008422518
qalamfoundation3@gmail.com

ایجنسی ہولڈرز۔

- خزینہ علم وادب، اردو بازار لاہور 042-37314169
- مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد 051-2278845
- سعید بک بنک، جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد 051-2651656
- ہمدرد بک ڈپو، B.C.G چوک، ملتان 0303-9773018
- کتاب نگر حسن آرکیڈ، ملتان 0321-4510444
- بک کارنر جہلم 0321-5440882
- ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی 021-32633151
- گوشہ ادب سرکلر روڈ، کوئٹہ 081-2843229
- پارس کتاب گھر میر پور آزاد کشمیر 0300-9545908
- شیخ محمد حسن بک سیلر اینڈ نیوز ایجنسی، فوارہ چوک جھنگ صدر

روزنامہ جنگ کے ممتاز کالم نگار اور تجزیہ کار محمد فاروق چوہان کی فکر انگیز اور چشم کشا حقائق پر مبنی تصنیف

”گردش ایام“

اکابرین اور دانشوروں کی نظر میں

الطاف حسن قریشی (مدیر اردو ڈائجسٹ و ممتاز کالم نگار)

جناب محمد فاروق چوہان نے حالاتِ حاضرہ پر خیال آرائی کا نہایت موثر اسلوب اپنایا ہے۔ وہ بڑی دانائی اور باریک بینی سے حالات کے پرت کھولتے ہیں۔ اگر آپ گردش ایام کی رعنائیوں، آزمائشوں اور بھول بھلیوں سے لطف اندوز ہونا چاہیں، تو جناب محمد فاروق چوہان کی تازہ تصنیف ”گردش ایام“ ضرور پڑھیے۔

جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان (قومی ہیرو، نشانِ امتیاز)

جناب محمد فاروق چوہان شستہ قلم کار ہیں اُن کے کالموں کا مرکزی خیال پاکستان اسلام اور انسانیت کی معراج ہے البتہ ایک بیدار صفت اور دور بین کالم نگار کے تمام اوصاف اُن میں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔

سینیٹر سراج الحق (امیر جماعت اسلامی پاکستان)

جناب محمد فاروق چوہان ایک منجھے ہوئے تجزیہ کار ہیں اُن کی کتاب ”گردش ایام“ مثبت اور جاندار تجزیوں کا منہ بولتا ثبوت او ملک کی حقیقی صورت حال کی آئینہ دار اور قوم کی حقیقی رہنمائی کا عنوان ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی (ستارہ اُمتیاز)، ممتاز کالم نگار روزنامہ نوائے وقت)

”گردش ایام“ محمد فاروق چوہان کے کالموں کا نام ہے۔ میں کالم نگاری کو ”ظالم نگاری“ کہتا ہوں مگر محمد فاروق چوہان کے کالموں میں سلامتی ایک وصف کی طرح موجود ہے۔ میں کالم نگاری کے صدر دروازے پر کھڑا محمد فاروق چوہان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

بانو قدسیہ (معروف ادیبہ و ناول نگار)

میں عزیزی محمد فاروق چوہان کے کالموں کا اکثر مطالعہ کرتی ہوں ان کے کالم، کالم کم اور افسانے زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے والوں اور اردو ادب سے پیار کرنے والوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔

ایجنسی ہولڈرز۔

- شیخ محمد حسن بک سیلر اینڈ نیوز ایجنسی، فوارہ چوک جھنگ صدر 047-7626420
- خزینہ علم وادب، اردو بازار لاہور 042-37314169
- سعید بک بنک، جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد 051-2651656
- کتاب نگر حسن آرکیڈ، ملتان 0321-4510444
- مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد 051-2278845
- گوشہ ادب سرکلر روڈ، کوئٹہ 081-2843229
- ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی 021-32633151
- ہمدرد بک ڈپو، B.C.G چوک، ملتان 0303-9773018
- پارس کتاب گھر میرپور آزاد کشمیر 0300-9545908
- بک کارنر جہلم 0321-5440882

ملنے کا پتہ: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل والٹن روڈ بینک سٹاپ لاہور کینٹ

qalamfoundation3@gmail.com 0300-0515101 / 03008422518